کلیاتِ چودھری محمد علی رُدولوی

(15 مئی 1882 - 10 ستمبر 1959)

(جلد اول)

ترتیب و تدوین

مسعود الحق

قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان
وزارت ترقی انسانی وسائل، حکومتِ ہند
ویسٹ بلاک۔ 1، آر۔ کے۔ پورم، نئی دہلی۔ 066 110

کُلّیات چودھری محمد علی رُدولوی

(15 مئی 1882-10 ستمبر 1959)

(جلد اول)

ترتیب وتدوین

مسعود الحق

قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان

وزارت ترقی انسانی وسائل، حکومتِ ہند

ویسٹ بلاک۔ 1، آر۔ کے۔ پورم، نئی دہلی۔110 066

Kulliyat-e-Chaudhry Mohammad Ali Rudaulvi Vol. I

Edited by

Masood ul Haque

پہلا ایڈیشن : 1100

سنہ اشاعت : ستمبر 2005 شک 1927

قیمت : -/172 روپے

شمارسلسلۂ مطبوعات : 1240

کمپوزنگ : پرنس گرافکس، نئی دہلی

ISBN : 81-7587-108-3 (Set)

ISBN : 81-7587-109-1 (Vol. I)

ناشر: ڈائرکٹر، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک 1، آر۔ کے۔ پورم، نئی دہلی-110066

فون نمبر: 26103938، 26103381، 26179657، فیکس: 26108159

ای۔میل: urducoun@ndf.vsnl.net.in، ویب سائٹ: www.urducouncil.nic.in

طابع: فہمی کمپیوٹرس، جامع مسجد دہلی- 110006

پیش لفظ

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان ایک قومی مقتدرہ کی حیثیت سے کام کر رہی ہے۔ اس کی کارگزاریوں کا دائرہ کئی جہتوں کا احاطہ کرتا ہے جن میں اردو کی ان علمی و ادبی کتابوں کی مکرر اشاعت بھی شامل ہے جو اردو زبان و ادب کے ارتقاء میں ایک سنگِ میل کی حیثیت رکھتی ہیں اور اب دھیرے دھیرے نایاب ہوتی جا رہی ہیں۔ ہمارا یہ ادبی سرمایہ محض ماضی کا قیمتی ورثہ ہی نہیں، بلکہ یہ حال کی تعمیر اور مستقبل کی منصوبہ بندی میں ہماری رہنمائی بھی کرتا ہے اور اس لیے اس سے کما حقہ، واقفیت بھی نئی نسلوں کے لیے ضروری ہے۔ قومی اردو کونسل ایک منضبط منصوبے کے تحت عہدِ قدیم کے شاعروں اور نثر نگاروں سے لے کر عہد جدید کے شاعروں اور نثر نگاروں تک تمام اہم اہلِ فکر و فن کی تصنیفات شائع کرنے کی خواہاں ہے تا کہ نہ صرف اردو کے اس قیمتی علمی و ادبی سرمائے کو آنے والی نسلوں تک پہنچایا جا سکے بلکہ زمانے کی دستبرد سے بھی اسے محفوظ رکھا جا سکے۔

عہدِ حاضر میں اردو کے مستند کلاسیکی متون کی حصولیابی، نیز ان کی کمپوزنگ اور پروف ریڈنگ ایک بہت بڑا مسئلہ ہے، لیکن قومی اردو کونسل نے حتی الواسع اس مسئلے پر قابو پانے کی کوشش کی ہے۔ کلیاتِ چودھری محمد علی ردولوی اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے جسے کونسل قارئین کی خدمت میں پیش کر رہی ہے۔

اہلِ علم سے گزارش ہے کہ کتاب میں کوئی خامی نظر آئے تو تحریر فرمائیں تا کہ اگلی اشاعت میں دور کی جا سکے۔

ایس۔ موہن
ڈائرکٹر انچارج

فہرست

گاهے گاهے باز خواں

انتساب

ہما خالہ مرحومہ (بیگم سید اخلاق حسین مرحوم)

اور

چودھری صاحب کے قدر شناس محمود ایاز صاحب مرحوم

(ایڈیٹر 'سوغات' بنگلور)

کے نام

مسعود الحق

چودھری محمد علی رُدولوی
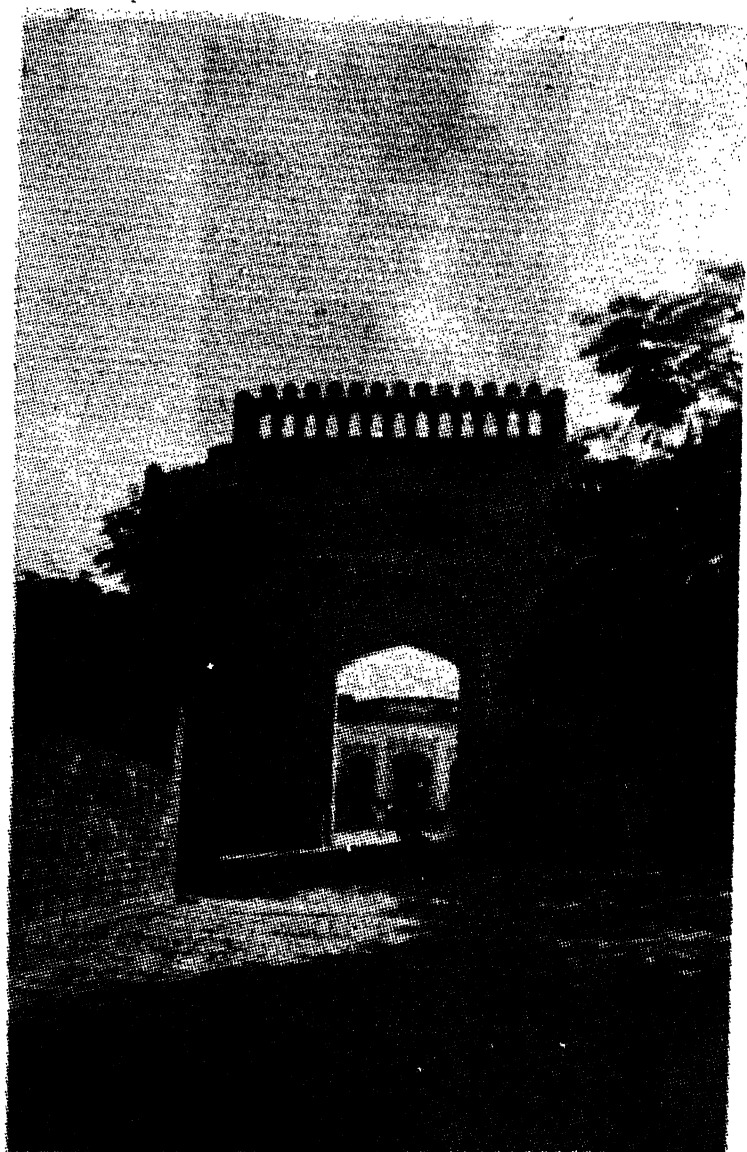
(15 مئی 1882 — 10 ستمبر 1959)

چودھری صاحب کا گھر

(رُدولی میں)

"..........یوں تو چودھری صاحب تعلقدار ہیں اور اودھ کے رؤسا میں سے ہیں اور ہم سے ایک نسل پہلے کے فرد ہیں، لیکن ان کی ذات میں کچھ عجیب خصلتیں جمع ہوگئی ہیں جن کی وجہ سے ان کی شخصیت سرزمین اودھ کی دلچسپ شخصیتوں میں سے ایک ہے۔ ان کے اخلاق و آداب اودھ کے قدیم رئیسوں کی طرح ہیں، لیکن ان کی صورت داڑھی مونچھ صاف گورا چٹا رنگ، جدید انگریزی تعلیم یافتہ نوجوان کی سی ہے، وہ اردو لکھتے ہیں تو اس میں وہ لوچ اور لطافت، طنز اور تفنن ہوتا ہے جس سے پرانے لکھنؤ کی مہک آتی ہے، لیکن باتیں کرنے پر آجاتے ہیں تو نیٹشے اور مارکس، ٹیگور اور اقبال ایک طرف تو جنسیات اور نفسیات کے ماہر فرائیڈ اور ہیولاک دوسری طرف ان کی زد میں ہوتے ہیں۔ بزرگوں اور بڑوں کے درمیان ہوتے ہیں تو ان سے آخرت، جائیداد اور ان کی اولاد کا تذکرہ کریں گے اور نوجوانوں میں ہوں گے تو جنسیات کے مسائل پر ایسی محققانہ باتیں کریں گے کہ بڑے بڑے رنگین مزاجوں کی آنکھیں کھل جائیں گی۔ اگر کسی محفل میں خوبصورت عورتوں اور نوجوان لڑکیوں کا مجمع ہو تو ان کے جھنڈ میں یوں پہنچ جاتے ہیں جیسے لوہا مقناطیس سے کھنچتا ہے اور پل بھر میں اپنی اجنبیت کھو کر ان سے ایسی رازدارانہ باتیں کرنے لگتے ہیں جو صرف راجہ اندر پریوں سے کرتے ہوں گے.........."

(اقتباس از روشنائی، مصنف سید سجاد ظہیر)

اظہارِ تشکّر

کتاب کی تیاری میں جن عزیزوں، دوستوں اور ہمدردوں نے مدد کی اگر نام بہ نام شکریہ ادا کروں تو تفصیل بہت طولانی ہوجائے گی۔ سب سے پہلے ہما خالہ (چودھری صاحب کی چھوٹی صاحبزادی) یاد آتی ہیں۔ 1994 میں اس کام کی ابتداء ہوئی تھی، اس وقت ہما خالہ زندہ تھیں، انھوں نے جس طرح میری ہمت افزائی اور مدد کی اس کے اظہار کے لیے الفاظ نہیں ہیں۔ چمرو نانا کے خطوط کا مجموعہ بھجوایا، ان کے بارے میں بہت کچھ ایک ٹیپ پر ریکارڈ کر کے بھیجا، میں ان کا ممنون ہوں۔ قلق اس بات کا ہے کہ اب جب یہ کتاب شائع ہورہی ہے وہ ہم میں موجود نہیں ہیں۔ خدا ان کو اپنے جوار رحمت میں رکھے۔

محمود ایاز صاحب (ایڈیٹر 'سوغات' بنگلور) چودھری صاحب کی طرف توجہ دلانے والے پہلے شخص ہیں۔ ان ہی کی تحریک پر میں نے اس کام کا بیڑہ اٹھایا۔ یہ میری بدقسمتی ہے کہ وہ بھی اب اس دنیا میں نہیں رہے۔

ہما خالہ کے انتقال کے بعد رضا بھائی (رضا کاظم، ہما خالہ کے بیٹے، ساکن لاہور) نے ہر ہر موقع پر میری رہنمائی بھی کی اور مدد بھی دی۔ لاہور اور دہلی کا فاصلہ ہم دونوں کے درمیان ای میل، ٹیلی فون اور خط و کتابت سے طے ہوتا رہا۔ رضا بھائی نے نہ جانے کہاں سے ڈھونڈھ ڈھانڈ کر چودھری صاحب کا کتابچہ 'پردے کی بات' مجھے بھجوایا، یہ کتابچہ اب نایاب ہے۔

کراچی میں چودھری صاحب کی ایک دوسری صاحبزادی کی بیٹی اقبال بانو اور بیٹے ابوالفضل ہیں۔ ان دونوں نے بھی اُن اعزاء کے بارے میں معلومات فراہم کی جن کا ذکر چودھری صاحب کے خطوط میں ہے اور یہ سب اب پاکستان میں ہیں۔ میں

ان دونوں کا مشکور ہوں، یہاں یہ تذکرہ شاید دلچسپی سے خالی نہ ہو کہ آج تک نہ تو رضا بھائی نے مجھے دیکھا ہے اور نہ میں نے ان کو، اسی طرح برادرم ابوالفضل اور بہن اقبال بانو کو بھی بچپن میں دیکھا تھا، اب تو صورتیں بھی یاد نہیں ہیں، یہ قصہ اب سے پچاس ساٹھ سال قبل کا ہے۔

کراچی ہی میں مجھ سے بے پناہ محبت کرنے والے اور انتہائی مخلص دوست پروفیسر ذوالفقار مصطفیٰ ہیں، میرے ایسے تمام کاموں میں، اتنی دور ہونے کے باوجود بھی وہ شامل رہتے ہیں، چودھری صاحب کی کتاب 'اتالیق بی بی' ان ہی کی عنایت ہے، یہ کتاب بھی اب نایاب ہے۔

اس کُلیّات کے منصوبے میں محترم مشفق خواجہ صاحب کے مشوروں کو بھول نہیں سکتا۔ ایک ملاقات میں موصوف نے زبانی مشورے دیے تھے، بعد کو ایک طویل خط میں بھی بہت سی کام کی باتیں لکھ کر بھیجیں، میں ان کا بھی ممنون ہوں۔

یہاں دہلی میں پروفیسر شمیم حنفی کا کیا ذکر کروں، ہر وقت کا ساتھ ہونے کی وجہ سے میں نے انھیں شاید زیادہ ہی پریشان رکھا۔ ان کی علمیت تو مسلّم ہے ہی ان کی خلقی شرافت نے بھی بڑی دستگیری کی، ان کے اس ہمہ وقت تعاون کے بغیر یہ کام شاید زیادہ دشوار ہوتا۔

رُدولی کے چودھری علی محمد عرف ننّن میاں (مرحوم) کے لیے اب دعا ہی کرسکتا ہوں کہ اللہ انھیں اپنے جوار رحمت میں رکھے۔ چودھری صاحب نے اپنی ذاتی لائبریری سے جس طرح استفادہ کرنے کی اجازت دی اس کے لیے میں ان کا مشکور ہوں۔ کرامت حسین صاحب کی سوانح کی زیروکس کاپی موصوف نے بہ نفس نفیس خود کرا کے بھیجی، یہ کتاب نایاب ہے اور اتفاق دیکھیے کہ اب چودھری صاحب کے کتب خانے سے بھی غائب ہے۔

شارب ردولوی نے بڑی اہم اور قابل قدر مدد یہ کی کہ انھوں نے چودھری صاحب کے بہت سے غیر مطبوعہ خطوط عنایت کیے جو اس کلیات مین اب پہلی بار سامنے آرہے ہیں۔ میں ان کا ممنون ہوں۔ تصویروں کے لیے میں چودھری صاحب کے بیٹے سید مصطفیٰ

محمد علی کا مشکور ہوں کہ انھوں نے اپنی مصروفیات کے باوجود چودھری صاحب کے بچپن اور ان کی جوانی کی تصویر کے ساتھ ہی گھر کی بھی ایک تصویر عنایت کی۔ چودھری صاحب کے صاحب فراش ہونے کے بعد کی دونوں تصویریں، جو غالباً ان کی آخری تصویریں ہیں، میرے چچازاد بھائی عبیدالحق نے دیں، ان کا مشکور ہوں۔

اردو کے ادبی ورثے اور زبان و ادب کے فروغ کے کاموں میں قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کی لگن ہی ہے کہ اس نے چودھری محمد علی ردولوی کو گمنامی سے بچانے کی ضرورت اور اہمیت کو محسوس کیا اور ''نام نیک رفتگاں ضائع مکن'' پر عمل کرتے ہوئے چودھری صاحب کی کُلیات کی اشاعت کا اہتمام کیا— میں کیا سارے اہل اردو کونسل کے مشکور ہوں گے اور اُس کے اِس اقدام کے معترف۔

طوالت کے ڈر سے بہت سے ان افراد کا ذکر نہیں کر رہا ہوں جنھوں نے قدم قدم پر اپنے مشوروں سے میری رہنمائی کی، میں ان سب کا تہہ دل سے ممنون ہوں۔

O

مسعودالحق

دیباچہ

ہماری اجتماعی زندگی میں جن شہروں نے تہذیبی مراکز کے طور پر شہرت پائی ان میں ایک ممتاز حیثیت لکھنؤ کی رہی ہے۔ صوبہ اودھ کے دارالسلطنت کی حیثیت پہلے فیض آباد کو حاصل تھی، رفتہ رفتہ سیاسی اقتدار فیض آباد سے لکھنؤ منتقل ہوگیا اور لکھنؤ نے ایک مخصوص تہذیبی علامت کی شکل اختیار کرلی جس کے اطراف میں اودھ کی معاشرت اور تہذیب کے ہمہ رنگ مظاہر بکھرے ہوئے تھے۔ زمانے کی گرد نے یہ نقشہ دھندلا دیا ہے تاہم گزشتہ اودھ کی یادیں ایک رفتہ و گذشتہ طلسماتی ماحول رکھتی ہیں۔ یہ سحر بہت دیر تک قائم رہا۔ مگر اب اودھ کی معاشرت ایک قصہ پارینہ ہے، فراغت سے شرابور اور وسائل سے معمور زندگی کی گہما گہمی، وہ نمود وہ چمک جو کبھی آنکھوں کو خیرہ کردیا کرتی تھی اب کچھ یوں غائب ہوئی ہے جیسے آندھی میں خوشبو غائب ہوجاتی ہے۔ لوگ کہتے ہیں کہ اس معاشرت کی بنیادیں گہری نہیں تھیں، اس تمدن کا وجود ارتقاء و استحکام کے اصولوں کے مطابق نہیں ہوا تھا، کسی مستحکم معاشرت کو سنورنے اور جریدہ عالم پر ثبات حاصل کرنے کے لیے جن پیچیدہ اور طویل مراحل سے گزرنا ہوتا ہے اودھ کی تہذیب شاید ان سے بھی نہیں گزری تھی۔ یوں بھی تہذیبیں بنائی نہیں جاتیں، زمانے کے سرد و گرم میں تپ کر، زندگی کے نشیب و فراز کی آزمائشوں سے گزرتی ہوئی بتدریج مستحکم ہوتی جاتی ہیں۔ تہذیبی سطح پر اقتدار و اختیار کے واسطے سے ایک عارضی ملمعے کے ذریعے چیزوں کو کچھ دیر کے لیے نظر فریب اور پرکشش رکھا جاسکتا ہے مگر ان میں ثبات اور پائیداری کے عناصر خاصی تاخیر کے ساتھ رونما ہوتے ہیں۔

اودھ کی تہذیب کی کہانی کچھ ایسی ہی ہے۔ ہر تہذیب کی طرح اودھ کی تہذیب بھی بنتے بنتے بنی ہے اور زمانے کی تختی پر اپنی شناخت کے نشانات ثبت کیے ہیں۔ رشید حسن خاں نے مولانا عبدالحلیم شرر لکھنوی کی معروف کتاب (''مشرقی تمدن کا آخری

نمو۔'' یعنی ''گذشتہ لکھنؤ'' کے اپنے تعارفی نوٹ میں لکھا ہے:

''ہندستان میں مغل حکومت نے جس قدر ترقی کی تھی مغل حکومت کی تباہی کے ساتھ ہی وہ ساری تہذیبی دولت لکھنؤ منتقل ہوگئی اور یہاں ایک نئی معاشرت کا نقش بننا شروع ہوا جس کی بنیاد اگرچہ دہلی سے آئی ہوئی تہذیبی روایتوں پر تھی لیکن جس نے جلدی ہی یہاں ایک نیا پیکر اختیار کرلیا۔ یہ پیکر کئی اعتبارات سے دہلوی تہذیب یا عہدِ مغل کی معاشرت سے زیادہ لطیف، نفیس، شاندار، روشن اور ترقی یافتہ تھا اور اسی قدر ترقی یافتہ تھا کہ اس کو مشرقی تمدن کا آخری نمونہ کہا جانا چاہیے۔ اِس میں اُن لطافتوں کی روح سمٹ آئی تھی جو تہذیب کے نقطۂ عروج پر پہنچنے کے بعد پیدا ہوا کرتی ہیں.........''(1)

''.........جس چیز کو لکھنؤ کا تمدن کہا جاتا ہے اس کی شروعات تو اس وقت سے ہوئی جب بکسر کی لڑائی میں شکست کھانے کے بعد نواب شجاع الدولہ کی توجہات کا مرکز فیض آباد قرار پایا...... اس کے بعد بھی اگرچہ تلوار ان کے ہاتھوں میں رہی لیکن ان کی زیادہ توجہ فیض آباد کی رونق و آراستگی اور طوائفوں کی سرپرستی کی طرف مبذول ہونا شروع ہوئی اور درباری حلقے میں اُس مجہول عیش پرستی کا آغاز ہوا جس نے واجد علی شاہ کے زمانے میں کسی کو کسی کام کا رکھا ہی نہیں تھا.................''(2)

اس رائے میں منصفی کی کچھ کمی ہے اور شاید حقائق بھی ان کی مکمل تصدیق نہ کریں۔ اودھ کے آخری تاجدار اور اودھ کی تاریخ کے دور انتشار کی بابت اس طرح کے بیانات بالعموم سنی سنائی کہانیوں کی بناء پر قائم کیے گئے ہیں چنانچہ اس کے بالکل برعکس باتیں بھی کہی گئی ہیں۔ بہرحال اتنا ضرور ہوا کہ رفتہ رفتہ سلطنت اور حکومت میں مذہبی عناصر کے اثرات غالب آتے گئے۔ کہتے ہیں کہ غازی الدین حیدر کو اجداد کا روپیہ تو ملا مگر جہانبانی کی خواہش اور حوصلے سے وہ محروم رہے۔ ان کی بیگم صاحبہ مذہبی

تھیں، کچھ بیگم کا اثر اور کچھ اپنی افتادِ طبع صرف دو مشغلے رہ گئے۔ تفریحات اور نو بہ نو مذہبی رسموں کی پیروی۔ چنانچہ جلدی ہی مذہب نے تہذیبی اور سماجی مظاہر پر اپنا اثر ڈالنا شروع کردیا۔ بے شمار مذہبی چونچلے وجود میں آئے، نئے نئے رواجوں کا چلن ہوا۔ اِن رسوم میں فرمانرواؤں کی بے پناہ دلچسپی نے انھیں قبولِ عام بخشا۔ تعزیہ داری، مرثیہ خوانی اور مجالس تہذیب کا حصہ قرار پائیں، جیسا کہ پہلے کہا گیا ہے جہانگیری و جہاں بانی کی خواہش اور حوصلے بتدریج معدوم ہوتے جارہے تھے، ان کی جگہ 'طاؤس و رباب' لے رہے تھے۔ طوائفوں کے کوٹھے، مرغوں کی لڑائیاں، بٹیروں کی پالیاں، داستان گوئی اور پتنگ بازی کے میدان سرگرمیوں کے میدان بن گئے۔ خوش ذائقہ کھانے اور مرصع زبان، نادر تشبیہیں، علائم اور استعارے، ایہام اور ضلع جگت ذاتی صلاحیتوں کے اظہار کے وسیلے ہوئے۔ نشست و برخاست کے آداب سے واقفیت اور لہجے کی شائستگی مہذب ہونے کی دلیل ٹھہری، تکلف اور صناعی نے زندگی کے ہر شعبے میں گھر کیا۔

لکھنؤ کی شہرت اور اہمیت میں اس وقت غیر معمولی اضافہ ہوا جب سلطنت مغلیہ پر ادبار کے بادل چھانے لگے تھے اور وہ روبہ زوال ہوچکی تھی، اسی زمانے میں سلطنت اودھ کا قیام عمل میں آیا۔ اس سے قبل لکھنؤ مرکزی سلطنت مغلیہ کا ایک ممتاز شہر اور صوبہ اودھ کا ایک اہم مقام تھا۔

> ''مغلیہ عہد میں صوبہ اودھ کا رقبہ بہت وسیع تھا۔ اس کا طول گورکھپور سے قنوج تک 320 کوس اور عرض، شمال میں ہمالیہ پہاڑ سے الہ آباد تک 215 کوس تھا۔ مشرقی سرحد صوبہ بہار سے ملحق تھی اور مغربی حد قنوج تھی اور جنوب میں مانک پور تک یہ سارا علاقہ چار سرکاروں میں تقسیم تھا۔
>
> 1۔ سرکار گورکھپور 2۔ سرکار بہرائچ
> 3۔ سرکار خیرآباد 4۔ سرکار لکھنؤ''(3)

نواب شجاع الدولہ کے عہد میں اس کا رقبہ سمٹ کر لکھنؤ، فیض آباد اور چند دوسرے شہروں تک محدود ہوگیا تھا۔

سید امیر حسن نورانی نے اپنی کتاب ''سوانح منشی نول کشور'' میں لکھا ہے کہ اودھ کا مرکز اجودھیا تھا اور غالباً اسی کی مناسبت سے یہ صوبہ اودھ کہلایا۔ اودھ اپنی دوسری خصوصیات کے ساتھ اپنے بزرگوں، اپنے علماء اور اپنے ماہرینِ علمِ باطن کی وجہ سے بھی ایک ممتاز حیثیت رکھتا ہے۔ ان بزرگوں کے علمی و دینی فیوض و برکات سے ہزاروں تشنگان علم سیراب ہوئے اور لاکھوں سکون قلب سے سرفراز۔

شجاع الدولہ کے انتقال کے بعد ان کے بیٹے آصف الدولہ تخت نشین ہوئے۔ انھوں نے فیض آباد کی سکونت ترک کر کے لکھنؤ کو اپنا مسکن بنایا۔ لکھنؤ کی آبادی اور رونق روز بروز بڑھنے لگی۔ مرکز میں مغلیہ حکومت روبہ زوال ہونے کی وجہ سے کمزور اور بے بس ہو چکی تھی، امن و امان ختم ہو رہا تھا اور ہر طرف بدامنی پھیلتی جاتی تھی، ایسے پرآشوب زمانے میں صرف اودھ اور اس کی راجدھانی لکھنؤ ایسی جگہ تھی جہاں امن و امان بھی تھا اور فارغ البالی بھی۔ اطراف و جوانب سے اہل علم و فن لکھنؤ کی طرف رخ کر رہے تھے۔ دہلی اجڑ رہی تھی اور لکھنؤ آباد ہو رہا تھا۔ آصف الدولہ کا زمانہ فنونِ لطیفہ کی ترقی کا سنہرا دور تھا۔ لکھنؤ علوم و فنون کا مرکز تھا۔ نواحی قصبات میں بھی مکتبوں اور مدرسوں کی فراوانی تھی جن میں بڑے بڑے علماء اور جید فضلاء درس و تدریس میں مصروف رہتے تھے۔ خیرآباد، کاکوری، امیٹھی، سندیلہ، گوپامئو، بلگرام، دریاآباد اور رُدولی ایسی ہی زمانہ ساز ہستیوں کی وجہ سے قابل ذکر ہیں۔ مدارس میں اعلیٰ تعلیم اور مکتبوں میں ابتدائی تعلیم ہوتی تھی۔ اسلامی علوم، عربی و فارسی درسیات اور متداول علوم و فنون کی تعلیم کا بھی انتظام تھا، معاشی فارغ البالی نے بہرحال عیش و عشرت کے سامان فراہم کیے۔ حکمراں طبقے نے دل کھول کر داد عیش و نشاط دی۔ ان کی تقلید اہلِ دَوَل نے کی، متوسط طبقہ بھی پیچھے نہیں رہا، نتیجتاً رقص و سرود علمِ موسیقی اور دوسرے فنونِ لطیفہ خاص و عام کی توجہ اور دلچسپی کا مرکز بن گئے۔ اس سب کے باوجود ہم دیکھتے ہیں کہ اودھ کے نوابوں نے علم دوستی اور ادب نوازی میں بھی نام پیدا کیا۔ صف اول کے شعراء نے اودھ میں سکونت اختیار کی، وہاں ایسے باکمال اہل ادب جمع ہوئے کہ جن کی نظیر ملنا مشکل ہے۔ خود لکھنؤ کی خاک سے ماہرین زبان اور خوش گو شعراء اٹھے، ان

اساتذہ کے ہونہار شاگردوں نے بھی شعر وسخن کے فروغ میں حصہ لیا۔ صنف مرثیہ اپنے عروج پر پہنچی، اردو، فارسی اور دوسری زبانوں میں بکثرت کتابوں کی تصنیف و تالیف ہوئی۔

''اودھ کے بعض حکمرانوں کو نادر و نایاب مخطوطات اور کتابیں حاصل کرکے اپنے ذاتی کتب خانوں کی زینت بڑھانے کا شوق تھا۔ ان کی اس توجہ کی بدولت لکھنؤ کا شاہی کتب خانہ قیمتی علمی نوادرات کا بیش بہا خزانہ تھا۔ 1857 کی تباہی کے بعد انگریزی حکومت کے ایما پر ڈاکٹر اشپرانگر نے شاہی کتب خانے کی فہرست تیار کی تھی۔ یہ کتاب خانہ انگلستان کے کتب خانوں کی نذر ہوگیا۔ اس کا بڑا حصہ انڈیا آفس، لندن کی لائبریری میں محفوظ ہے۔ کتابوں کا یہ شوق صرف حکمرانوں تک محدود نہیں تھا اودھ کے رؤسا بھی اس معاملے میں کسی سے پیچھے نہیں تھے۔'' (4)

عبداللطیف شوستری نے ''تحفۃ العالم'' میں لکھا ہے:

''ان کے (آصف الدولہ کے) کتب خانے میں تین لاکھ منتخب کتابیں میں نے دیکھی تھیں جو نہایت پاکیزہ خط میں لکھی ہوئی تھیں۔ ہر سَو کتابوں پر ایک گماشتہ مقرر تھا۔ مختلف فنون و اصناف پر عربی، فارسی اور انگریزی میں کتابیں تھیں۔ نظم و نثر کی کتابیں، تاریخیں اور دواوین بے شمار تھے۔ ان کے علاوہ خوش نما قطعات جو اولین و آخرین، خوش نویسوں کے ہاتھ کے لکھے ہوئے تھے اور ایران، ہند، روم اور فرنگ کے مصوروں کی بنائی ہوئی تصویریں اتنی تعداد میں تھیں کہ ان کے دیکھنے سے تمام عمر فراغت نہ مل سکے............

میں یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ تخریب سلطنت کے بعد سلاطین تیموریہ کا کتب خانہ جس کے ہاتھ میں بھی لگا ہوگا اس کے خزائن اور دفائن اور سامان طلا و جواہر اس کتب خانے کا عشر عشیر بھی نہ ہوگا............'' (5)

('نیا دور' اودھ نمبر حصہ دوم، 1994)

لیکن انیسویں صدی بہرحال عوام کی نہیں خواص کی صدی تھی۔ رؤسا اور امراء یا بہ الفاظ دیگر شرفاء کی صدی تھی کہ جو شرافت و نجابت کے امین و پاسبان اور معیار سمجھے جاتے تھے۔ سچ تو یہ ہے کہ کسی چیز کا عوامی ہونا اس کے گھٹیا اور پست ہونے کی دلیل تھی۔ اعلیٰ اقدار کے پاسدار عوام نہیں تھے کیونکہ وہ ''تہذیب'' سے کوئی سروکار نہیں رکھتے تھے اور رکھتے بھی کیوں، تہذیب و تمدن کی ساری اجارہ داری تو خواص کے ہاتھوں میں تھی۔ شاید یہی وجہ ہے کہ اس عہد کے ادب میں عوامی زندگی کی جھلکیاں کم ہی نظر آتی ہیں۔ ادب عوام کے ذکر سے یکسر خالی نہیں تھا، کہیں کہیں ضمنی طور پر ہی سہی ان میں عوام کی جھلک نظر آجاتی تھی، مگر محض جھلک۔

جیسا کہ پہلے ذکر ہو چکا ہے کہ لکھنؤ کے نواح میں بہت سے قصبات تھے جو علمِ دین اور علومِ دنیاوی کے مرکز سمجھے جاتے تھے۔ ان قصبات کی نمائندہ آبادی رؤسا و امراء، زمین داروں اور تعلقداروں پر مشتمل تھی، فراغت اور تمول لکھنؤ سے کچھ کم سہی، مگر تھا۔ رہن سہن کے معیار اس زمانے کی تہذیب و ثقافت کے مطابق تھے، مشاغل بھی وہی اور شب و روز کے کاروبار بھی وہی۔ قصبات میں بھی مذہبیت کا غلبہ تھا، میدان کارزار تو اب باقی نہیں تھے۔ زبان کی تلواریں دیوان خانوں میں چمکتی تھیں۔ تہذیب و شائستگی کے پردے میں طوائفوں کے کوٹھے آباد ہوئے، خیال کی دنیائیں یہاں بھی بسائی گئیں، لکھنؤ کے نوابوں کی طرح ایک سیر گھی میں ایک ایک پراٹھا تلوا کر کھانے والے یہاں بھی مل جاتے تھے۔ ماماؤں، مغلانیوں، میراثنوں اور نائنوں کی اہمیت اور ضرورت بھی ویسی ہی تھی اور ان کا مصرف بھی وہی۔ مصاحب، داستان گو، افیمچی اور بٹیر باز، مرغ باز، کبوتر باز، پتنگ باز شاید تعداد میں کم ہوں مگر مل جاتے تھے۔ غرض رونق تھی، چمک دمک تھی، معاشرت میں وہ سارے 'محاسن' (عارضی ہی سہی) موجود تھے جو جاگیرداری نظام کا طرۂ امتیاز سمجھے جاتے تھے۔ فیض آباد اور لکھنؤ میں بادشاہ اور نواب تھے تو قصبات میں تعلقدار اور زمیندار، ان قصبات کے وجود میں آنے کا ایک فائدہ یا نقصان یہ ہوا کہ انھوں نے اودھ کی تہذیب کے انحطاط کی رفتار کو دھیما کرنے میں بڑا کام کیا۔ چودھری محمد علی نے لکھا ہے:

''انگریزوں کے راج کے پہلے شہر اور گاؤں کے علاوہ قصبات کی بھی ضرورت تھی۔ دارالسلطنت یا ایسے بڑے بڑے مقامات کی زندگی جہاں درباری امراء، صوبیدار وغیرہ رہتے ہوں، بہترین قسم کے لوگوں کو پیدا کرنے کے مناسب نہیں ہوتی تھی کیونکہ دولت کے عیوب، نسل اور تربیت دونوں کے دشمن تھے۔ عیش پسندی اور حکومت پر شرافت اور عمدہ تربیت سب قربان ہوجاتی تھی۔ دربار کی چال بازیوں، ریشہ دوانیوں کی وجہ سے نہ خاندانی روایات باقی رہتی تھیں نہ ایمانداری اور راست بازی۔ بڑے بڑے مدرسے تو تھے نہیں جہاں بورڈنگ ہاؤس میں سب کو ایک طرح رکھا جائے۔ ہر گھر کی تربیت الگ تھی اور وہ شہر میں آکر خاک میں مل جاتی تھی۔

دیہات میں لوگ اپنی کھیتی باڑی کے مشاغل میں پھنسے رہتے تھے، وہاں کی بھی آب و ہوا، علمی ترقی اور دماغی ارتقاء کے خلاف پڑتی تھی اسی وجہ سے زمانے نے قصبات کو پیدا کردیا، ان کے وجود میں لانے کے لیے کسی بڑے عالی دماغ نے پہلے سے کوئی نظریہ نہیں قائم کیا تھا بلکہ ضرورت کے موافق بلا کسی کوشش کے قصبات خودبخود پیدا ہوتے گئے، یہاں کی سرزمین عمدہ لوگوں کو پیدا کرنے کے لیے مناسب تھی۔ درباری خوشامد، محلات کی بے عنوانیاں، عمال کی ترکیبیں، امرا کی سیاسی چالیں، عہدے داروں کی آپس کی اکھاڑ پچھاڑ، شاہزادوں کی حد سے گزری ہوئی طرز زندگی سب سے پناہ تھی۔ نسل، علم، تندرستی، عالی دماغی، اصول اخلاق کی پابندی ان سب کے لیے یہیں کی سرزمین مناسب ٹھہری تھی۔ شہروں میں یہیں کے لوگ جاکر بادشاہ کو بادشاہی اور وزیروں کو وزارت سکھاتے تھے اور خود بھی وہیں دولت کے استھان پر بھینٹ چڑھ جاتے تھے۔ ایک دو پشتوں تک کچھ خصوصیتیں باقی رہتی تھیں اس کے بعد نمک کی کان میں پہنچ کر یہ بھی نمک ہوجاتے اور قصبات سے نیا دستہ تیار ہوکر پہنچ جاتا تھا۔ ہندستان میں مسلمانوں کی تاریخ اٹھاکر دیکھ لیجیے شہر کا ہر بڑا خاندان کسی نہ کسی قصبے کے سلسلے پر فخر کرتا ہے۔ بوڑھوں کو

> مرجانے کا عارضہ ہے، جوانوں کو فرصت نہیں، بچوں کو معلوم نہیں ورنہ آپ دیکھتے کہ ہر شخص اسی پر ناز کرتا کہ ہم قصبات کی پود ہیں۔ اس کے ساتھ یہ بھی دیکھا گیا ہے کہ جب کسی چیز کی ضرورت نہیں رہتی تو صرف یہی نہیں کہ وہ گھٹ کر اپنی قدیمی حالت پر پہنچ جائے بلکہ پھر وہ تحت الثریٰ ہی کی خبر لاتی ہے اور اس کی تباہی اور خرابی کی کوئی انتہا نہیں رہ جاتی۔ دولت جانے کے بعد بھیک مانگنے کی عادت ہو جاتی ہے۔ علم کی جگہ ہٹ دھری لے لیتی ہے، اعتقاد کی جگہ وہم پرستی کو ملتی ہے۔ راست بازی دھوکا دھڑی سے بدل جاتی ہے، عالی ہمتی بودے پن کا جامہ قبول کر لیتی ہے، شیریں بیانی گنج بخشی کے سامنے دم بخود رہ جاتی ہے اور بڑے بڑے قاضیوں کی نسل میں صرف کرایہ کے گواہ رہ جاتے ہیں اور پھر بھی آخری سلاطین ترکی کی طرح کچھ باتیں گذشتہ عروج کا پتہ بتانے کو رہ جاتی ہیں۔(6)

چودھری محمد علی اگرچہ ردولی کی قصباتی فضا اور معاشرت کے پروردہ تھے مگر پھر بھی وہ دوسروں سے بہت مختلف تھے۔ ایک طرف اودھ کا وہ ہزاررنگ اور ہمہ گیر ثقافتی ماحول تھا کہ جس کا پرتو ہمیں سرشار، رسوا اور اودھ پنچ میں نظر آتا ہے اور دوسری طرف وہ ماضی تھا جس کی جھلک طلسم ہوش ربا اور آغا میر کی ڈیوڑھی کے افیمچی داستان گویوں کی داستانوں میں نظر آتی تھی اور ان سب کے پہلو بہ پہلو یورپ کی ترقیاں تھیں، انگریز کا تسلط تھا اور انگریزی زبان و ادب کے توسط سے ہونے والی مغرب کی تہذیبی یلغار تھی۔ بقول قرۃ العین حیدر مولانا الطاف حسین حالی مناجات میں مصروف تھے اور اکبر الہ آبادی انقلاب زمانہ پر خندۂ زیرلب میں مبتلا، سرسید اپنے گروہ کے ساتھ برصغیر کے مسلمانوں کے لیے نئی راہوں کی نشاندہی کر رہے تھے، نئی نسلیں ایک ایسے عبوری دور سے گزر رہی تھیں جس میں ہر راہ دھندلی اور ہر راستہ پر پیچ تھا۔ اپنی تہذیب کی زوال آمادگی پر تشویش تھی، اسے بچائے رکھنے کے لیے ہاتھ پاؤں مارنے کا بھی جی چاہتا تھا، ساتھ ہی نئی تبدیلیوں کو اپنانے کی خواہش بھی دلوں میں کروٹیں لیتی تھی۔

> ''شرر مسلمانوں کے سنہرے ماضی کی نقاشی کر رہے تھے، جس میں، ہر غازی

ہیرو آخر میں ہیروئن کو مشرف بہ اسلام کرتا تھا۔ گو اصل واقعہ یہ تھا کہ حال ہی میں لشکر نصاریٰ ایک غازی بادشاہ کو رنگون اور دوسرے کو مٹیابرج میں قید کر چکا تھا۔ لہٰذا قوم کے پاس سوا خون کے آنسو رونے اور رلانے کے اب کون مشغلہ رہ گیا تھا۔ ہندو مسلمان کی آمیزش بھی ہمارے بزرگوں کو پریشان کرنے لگی تھی، لیکن یہ سیاسی پلیٹ فارم کے جھگڑے تھے، روزمرہ کی زندگی میں تو ہندو مسلمان دونوں کو انگریز ڈپٹی کمشنر کے سامنے جوتے اتار کر جانا ہوتا تھا۔......'' (7)

سرسید اور ان کے ٹولے کی فہمائشوں اور ان کے کچوکوں کے باوجود مسلمان اپنی سوچ کو سائنسی نہ بنا پائے، اس کے برعکس ہم دیکھتے ہیں کہ بنگال میں بیداری اور تبدیلی و ترقی کے علم برداروں نے انیسویں صدی کے نصف اول ہی سے مغربی انقلاب کے فلسفے کی بانگ لگانا شروع کر دی تھی۔

''...... مائیکل مدھوسودن اور ان کے ساتھی انگلستان کے رومانی باغیوں سے متاثر ہوکر اس وقت انگریزی نظمیں، ڈرامے اور ناول لکھ رہے تھے جس وقت ابھی لکھنؤ میں شمع کی روشنی میں غالباً رانی کیتکی کی داستان ہی پڑھی جا رہی تھی ......'' (8)

''...... اودھ کے نوابین اور ریاستوں کے والی تصنیف و تالیف کے رئیسانہ مشغلے میں دلچسپی رکھنے کی وجہ سے کتابیں لکھ رہے تھے، فن موسیقی مرغوب موضوع تھا، ناٹک پر بھی طبع آزمائی ہو رہی تھی، اخبار شائع ہونے لگے تھے، ان ہی اخباروں میں ایک 'اودھ پنچ' بھی تھا اور ایسا لگ رہا تھا کہ 'سحر قریب تھی اور آغا میر کی ڈیوڑھی کے داستان گو اپنی شمعیں بجھایا ہی چاہتے تھے۔......'' (9)

اس زمانے کا ایک مخصوص کلچر تھا جس کے مظاہر قصبات میں بڑے واضح تھے۔ اس کلچر کی بنیاد، نفاست و تہذیب، وضع داری اور سب سے بڑھ کر انسانیت پرستی کی

قدیم روایتیں تھیں۔ اتر پردیش کے صوبے میں ضلع بارہ بنکی صوبے کا سب سے بڑا ضلع ہے۔ کہتے ہیں کہ بارہ بنکی کبھی بارہ بانکوں کی سرزمین رہا تھا۔ ان بانکوں کے بارے میں یہ بھی ایک روایت ہے کہ ان بانکوں نے کبھی کسی سے ہار نہیں مانی اور کبھی کسی کے سامنے سر نہیں جھکایا، بہرحال ان ہی بانکوں کی رعایت سے ضلع کا نام بارہ بنکی پڑ گیا۔ اسی ضلع میں ایک قصبہ ہے ردولی۔ ردولی میں آبادی مسلمان شرفا کی زیادہ تھی۔ بقول چودھری محمد علی ''قصبے میں کوئی خاص عیب نہیں بیان کیا جاسکتا، یہ کوئی خاص صفت بھی نہیں رکھتا لیکن چونکہ روایات قصبہ اکثر اسلام کے کارناموں سے تعلق رکھتی ہیں اس لیے باوجود افلاس کے اس کو مسلمان ہی کے عیوب و صفات سے زیادہ تعلق ہے۔''

ردولی کا قصبہ جس تاریخی اور تہذیبی اہمیت کا حامل ہے تاریخ کی کتابوں میں اس کا اعتراف اتنا نہیں ہوا جتنا اس کا حق تھا۔ مقامی لوگوں نے بھی اس طرف توجہ نہیں کی، اسی لیے ردولی کی کوئی تاریخی یا تہذیبی تفصیلی سوانح ضبط تحریر میں نہیں آئی۔ چودھری سید علی محمد زیدی عرف ممّن میاں مرحوم کو خیال آیا اور انھوں نے قصبے کی تاریخ، تہذیب، معاشرت یہاں کے شاعروں، فنکاروں اور چند قابلِ ذکر شخصیتوں کے بارے میں ایک چھوٹی سی کتاب ''اپنی یادیں'' کے نام سے لکھی۔ ردولی کے بارے میں، اعتبار اور افادیت کے لحاظ سے ایسی کوئی دوسری کتاب کم از کم میرے علم میں نہیں ہے۔ اس ناانصافی اور بے توجہی کے باوجود ردولی بہرحال غیرمعروف نہیں ہے۔ یہ قصبہ اپنے تاریخی واقعات اور اپنی روحانی و تہذیبی شخصیات سے مالامال ہے۔

شیخ احمد عبدالحق توشہ جیسی متبرک ذات کا مقدس مزار آج بھی ردولی اور بیرون ردولی کے لوگوں کے لیے افتخار و برکت کا سبب ہے۔

ہندستانی مسلمانوں کی صورت گری اور تشکیل میں خانقاہی نظام کا جو معتدبہ حصہ رہا ہے اس سے انکار ممکن نہیں۔ خانقاہیں ایک طرف علم و معرفت کا مرکز تھیں تو دوسری طرف درس و تدریس، علم کی اشاعت اور افراد کی تہذیب و تربیت کے گہوارے تھیں۔ ان بزرگوں اور ان کی قائم کی ہوئی خانقاہوں نے نہ صرف روحانی اور دینی تربیت کے کام کیے بلکہ زبان و ادب، معاشرت اور علوم دنیاوی یعنی انسانی زندگی کے ہر شعبے پر

اپنا پرتو ڈالا۔ رُشد و ہدایت کے ساتھ ساتھ ان بزرگوں نے اپنے ذاتی روحانی علو سے ایک عالم کو فیض یاب کیا۔ ہندستان میں ایسے انسان ساز اور انسانیت نواز صوفیاء کا ایک طویل سلسلہ ہے۔ سرفہرست ناموں میں حضرت شیخ العالم احمد عبدالحق صاحب توشہ ردولوی کا نام ہے۔ ذاتی ریاضت اور عطیہ باری تعالیٰ روحانی عظمت کی جو دولت آپ کو فراوانی ہوئی تھی اسے آپ نے دونوں ہاتھوں سے لٹایا۔ فیض کا یہ سلسلہ آج بھی جاری و ساری ہے۔

مخدوم صاحب، سلسلۂ صابریہ چشتیہ کے جاری کرنے والے بزرگ تھے، اس سلسلے کی توسیع کا اصل کام آپ ہی سے شروع ہوا اسی لیے ہندستان میں تصوف کی تاریخ میں مخدوم صاحب کو انتہائی اہم مقام حاصل ہے۔ ردولی کی روحانی عظمت و مرکزیت آپ ہی کی ذات مبارکہ کی مرہون منت ہے۔

جن سے مل کر زندگی سے عشق ہو جائے وہ لوگ
آپ نے دیکھے نہیں ہوں گے مگر ایسے بھی ہیں

سلسلۂ سہروردی کی بنیاد یہاں ہندستان میں شیخ بہاؤ الدین ذکریا ملتانی نے قائم کی تھی، آپ کی ولادت 1182 میں ہوئی۔ اسی سلسلے کے ایک بزرگ شیخ صلاح الدین سہروردی المعروف بہ شیخ سیاح (ردولی میں عوام الناس شیخ سیّاں کہتے ہیں) سب سے پہلے اسی قصبے میں آئے اور یہیں مقیم ہو گئے۔ درس و تدریس کا سلسلہ شروع کیا۔ آپ کا وصال یہیں ہوا۔ مزار مرجع خلائق تھا، اب یہ صورت حال نہیں رہی ہے۔ معتقدین کا خیال ہے کہ حضرت کے مزار پر حاضری اور کچھ دن کا قیام دماغی مریضوں کو صحت مند کر دیتا ہے۔ میں نے اپنے بچپن میں وہاں مخبوط الحواس اور نیم پاگل لوگوں کو بندھے ہوئے دیکھا ہے۔ مزار کے سامنے کھلے میدان میں جگہ جگہ لوہے کی دو دو میخیں گڑی ہوئی تھیں، میخوں کے اوپر کے حصے میں سوراخ تھے، پاگل کا ایک پیر دو میخوں کے درمیان رکھ کر، سوراخوں میں ایک سلاخ ڈال کر تالا لگا دیا جاتا تھا۔ اس کے بعد پاگل کا پیر اس میں سے نکل نہیں سکتا تھا۔ وہ کئی کئی دن وہیں بیٹھا یا لیٹا رہتا تھا۔ اعزاء اور متعلقین جو اس کے ساتھ آتے تھے وہ پاس ہی اپنی جھونپڑی ڈال کر یا خیمہ لگا کر رہتے

تھے اور مریض کے کھانے پینے اور اس کی دوسری ضروریات کا خیال رکھتے تھے۔ علاج کا طریقہ مزار پر دعاؤں کے علاوہ یہ تھا کہ اُدھر سے گزرنے والا ہر شخص وہاں بندھے ہوئے پاگل کی گردن پر ایک آدھ ہاتھ مار دے۔ ضرب کے ہلکے یا بھاری ہونے کی کوئی شرط نہیں تھی۔ عموماً ہاتھ بھاری ہی پڑتے تھے، لوگوں کا عقیدہ تھا کہ اس علاج سے مریض کچھ دنوں میں ٹھیک ہوجاتا تھا۔

اپنی ان روحانی و مذہبی تبریک و تقدیس کی دولت سے مالامال اور اپنی سماجی اور تہذیبی خصوصی اقدار کا حامل یہ قصبہ یہی وجہ ہے کہ ہمیشہ ایک معروف قصبہ رہا۔ ردولی سے تقریباً اڑتیس کلومیٹر مشرق میں فیض آباد اور مغرب میں تقریباً نوّے کلومیٹر کی دوری پر لکھنؤ ہے۔ فیض آباد اور لکھنؤ دونوں اودھ کی تاریخ میں جس اہمیت کے حامل رہے ہیں اس کا تفصیلی تذکرہ شاید ضروری نہیں ہے۔ فیض آباد بھی اودھ کی راجدھانی رہا اور بعد کو یہ خوش نصیبی لکھنؤ کے حصے میں آئی۔ ردولی یوں تو غالباً اودھ کے دوسرے قصبات ہی کی طرح ہے مگر شاید دونوں راجدھانیوں کے اس قرب نے بہرحال اس قصبے پر اپنے مثبت اور منفی دونوں قسم کے اثرات دوسرے قصبوں کے مقابلے میں نسبتاً زیادہ مرتب کیے۔

ابتداء میں ردولی کی آبادی کا معتدبہ حصہ بڑے تعلقداروں اور زمین داروں پر مشتمل تھا۔ جاگیردارانہ سماج کی تمام خصوصیات یہاں موجود تھیں۔ نرم آثار اور ست خرام زندگی، آسائشیں، رسوم و رواج، تیج تہوار، عرس اور میلے، تن آسانی، سفید پوشی اور وضع داریاں۔ زندگی میں تلخیاں تھیں مگر عام ماحول اور زندگی کے عمومی ڈھنگ جس میں رواداریوں اور باہمی ہمدردیوں کا رنگ بڑا گہرا تھا زندگی کی ان تلخیوں کو کم کم ہی محسوس ہونے دیتے تھے۔ آبادی میں رئیس بھی تھے اور غریب اور مفلوک الحال بھی۔ یہ تفریق شدید تھی مگر وضع داریوں اور معاشی قدروں کی روایات کچھ ایسی مضبوط تھیں کہ وہ اکثر تلخیوں اور غموں کے احساس کو مدھم کردیا کرتی تھیں۔ یہی روایتیں جراحتوں کا مرہم بھی تھیں اور دکھوں کا مداوا بھی۔ پرجا بھی تھی اور ججمان بھی، اب ججمان نہیں رہے پرجا ہے اور اس میں اضافہ ہوگیا ہے۔ ان دو طبقات کی باہمی تفریق اگرچہ پسندیدہ نہیں تھی مگر

بہر حال تھی۔ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ ردولی میں جب تک تعلقدار تعلقدار رہے اس وقت تک اُن افراد کی زندگی میں جو نچلے طبقے کے کہلاتے تھے، اگر آسائشیں بہت نہیں تھیں تو تکلیفیں بھی بہت نہیں تھیں۔ ایک تعلقدار نہ جانے کتنے دوسرے خاندانوں کی پرورش کا وسیلہ ہوا کرتا تھا۔ اب جبکہ زمانہ بہت بدل چکا ہے، زمین داریاں ختم ہوچکی ہیں، تعلقداری قصہ پارینہ بن چکی ہے، نہ تو پہلے جیسی فراغتیں ہیں اور نہ ہی وہ دل و دماغ مگر وضع داریوں کا نام ابھی باقی ہے۔ ردولی میں آپ کو آج بھی پرانی قدروں کی جھلکیاں نظر آجاتی ہیں، باہمی تعلقات میں خلوص و محبت اور یگانگت کم تو شاید ہوگئی ہو مگر مفقود نہیں ہے۔ زندگی کی چھوٹی چھوٹی دلچسپیاں آج بھی بدستور ہیں، شعر و ادب کا چرچا، مشاعروں کا رواج، کھانوں کا شوق، کریم حلوائی کے یہاں کے بونٹ (ہرے چنے) کے لڈو اور خرمے، امّن اِئی اور شریفن کے کباب، ننّا گھوسن کی بالائی اور نوّاب اور ڈھوڑے کی ملائی کی برف آج بھی ویسے ہی مقبول ہے۔ خوش لباسی، گفتگو کے نرم اور گوارا انداز آج بھی ملتے ہیں، مبالغے اور عملی مذاق کا چلن پہلے جیسا آج بھی ہے۔ سہ پہر کی نشستیں، دن کا کھانا گیارہ بجے اور رات کا کھانا مغرب کی نماز کے فوراً بعد آج بھی ہوتا ہے۔ پریم چند نے کہیں لکھا ہے کہ گاؤں کی گلیاں بالکل چھوٹے بچوں کی طرح ہوتی ہیں کہ سرِ شام ہی سوجاتی ہیں، بجلی آجانے کے باوجود کچھ یہی کیفیت ردولی کی آج بھی ہے۔

چودھری محمد علی کی خود کوئی سیاسی اہمیت نہیں تھی، مگر جس طبقے سے وہ تعلق رکھتے تھے اس کے بارے میں تفصیلی معلومات اکٹھا کی جائیں تو تاریخ کے بہت سے سربستہ بھید کھل سکتے ہیں اور مسلمانوں کے بارے میں بہت سے توہمات ختم کیے جاسکتے ہیں۔ بدقسمتی یہ ہے کہ دستیاب تحریروں میں، اگر غور کیجیے تو مسلمانوں کی روشن خیالی اور وسیع النظری کا تذکرہ خال خال ہی نظر آتا ہے۔ اگرچہ حقیقت شاید یہ ہے کہ ایک تہذیب اور سیکولر سماج کی تشکیل و تعمیر میں ان لوگوں (زمین داروں اور تعلقداروں) کی دین نظر انداز نہیں کی جاسکتی ہے۔ اس طبقے کے لوگوں کی نجی اور عوامی زندگی کی سب سے نمایاں خصوصیت Pluralism رہی ہے۔ اشرافیہ کی سرپرستی، اور بزرگوں اور

درگاہوں اور مزاروں سے عام آدمی کی عقیدت نے قصبات میں یکجہتی و یگانگت کی ایک عجیب و غریب فضا پیدا کر دی تھی۔ مزاروں، میلوں، عرسوں اور مشترکہ مذہبی اور سماجی روایات نے میل ملاپ کی راہیں کھول دی تھیں۔ اور ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان زندگی کے روزانہ کاروبار کی خصوصیت دوستی تھی، تعاون اور بقائے باہم کا جذبہ تھا۔ اودھ کی تہذیب کی حقیقی اساس کا اگر تعین کرنا چاہیں تو یہ کہنا شاید غلط نہ ہوگا کہ اس کی تہذیب کی بنیادی اینٹ وضع داری اور رواداری ہے۔ ردولی میں وضع دار خاندان آج بھی مل جائیں گے۔ خاتون مہمان کی ڈولی کا کرایہ دینے اور مہمان اگر مغرب کی نماز سے پہلے واپس چلی گئی ہیں تو ان کا رات کا کھانا بھجوانے والے لوگ وہاں آج بھی ہیں (خوان پوش سے ڈھکے ہوئے خوان نائنوں کو لے جاتے ہوئے میں نے بھی دیکھے ہیں) چودھری محمد علی عرف چمرومیاں — جگر گلے چاول[10] کھانے والی اور خیالی انگوری اور خیالی عنابی رنگ[11] کے دوپٹے اوڑھنے والی خواتین، خوش گفتار نوجوانوں اور زندہ دل بزرگوں کے اِسی مہذب اور وضع دار قصبے ردولی شریف کے رہنے والے تھے۔

چودھری محمد علی 15رمئی 1882 کو (چودھری علی محمد زیدی عرف ننّن میاں کے مطابق 9رجون 1880)اسی قصبے میں پیدا ہوئے۔ ان کا تعلق انیسویں صدی کے ادیبوں اور اہل قلم کی اس نسل سے تھا جس میں ولایت علی قدوائی (بمبوق) سجاد حیدر یلدرم، منشی پریم چند، منشی دیانرائن نگم، سر محمد یعقوب، مولانا شوکت علی، مولانا محمد علی، مولانا ابوالکلام آزاد، حسرت موہانی، سرتیج بہادر سپرو، سر شیخ عبدالقادر، نیاز فتح پوری، ل۔احمد اکبرآبادی، سلطان حیدر جوش وغیرہ شامل تھے۔

چودھری محمد علی کے والد کا نام احسان رسول تھا، وہ ایک بڑے تعلقدار تھے، شوقین اور رنگین مزاج۔ انتہائی حسین تھے، سرتاپا وجاہت کا پیکر، کہتے ہیں کہ پھولوں کا ایسا شوق تھا کہ گہنے فیض آباد سے بن بن کر آتے تھے۔ رقص و موسیقی کی محفلیں برپا ہوتی تھیں۔ ان کا انتقال محض اٹھائیس سال کی عمر میں ہی ہوگیا تھا۔ اس وقت چودھری محمد علی کی عمر ساڑھے تین سال کے قریب تھی چونکہ تعلقے کے وارث یہی تھے اس لیے علاقہ کورٹ آف وارڈس کے سپرد ہوگیا۔ بیوہ ماں کے اکلوتے بیٹے ہونے کی وجہ سے

پرورش بڑے ناز و نعم میں ہوئی۔

''چودھری صاحب کی تعلیم اور تھوڑی بہت تربیت جو ہو سکتی تھی ایک انگریز منیجر تھا اس کے سپرد ہوئی۔ سات آٹھ سال کی عمر ہوگی جب انھیں کالون کالج لکھنؤ میں داخل کیا گیا (یہ کالج تعلقداروں اور امراء کے بچوں کے لیے خاص طور پر قائم کیا گیا تھا اب اس کے دروازے سب کے لیے کھل گئے ہیں) میٹرک یا انٹرنس تک شاید پڑھا ہو، نمرے خیال میں زیادہ نہیں پڑھیں۔''(12)

جہاں تک باقاعدہ رسمی تعلیم کا تعلق ہے وہ بہت نہیں تھی مگر قدرت نے اچھا ذہن اور مطالعے کا ایسا شوق دیا تھا کہ بڑے بڑے پڑھے لکھے لوگ بھی ان کے سامنے زانوئے ادب تہہ کرتے تھے، ان کی ہمہ جہت علمیت، بے پایاں معلومات اور گفتگو کے سلیقے کا کچھ اندازہ مولانا عبدالماجد دریا آبادی کی اس عبارت سے لگایا جاسکتا ہے:

''مولانا آزاد صاحب الہلال ایک بار غالباً 1917 میں لکھنو آئے اور غریب خانے پر کھانے تشریف لائے۔ اس وقت شہرت یہی تھی کہ ان سے گفتگو میں کوئی شخص ٹھہر نہیں سکتا اور وہ اپنے مخالف کو بنا ڈالتے ہیں۔ 'مقابلے' کے لیے چودھری محمد علی ڈھونڈھ نکالے گئے اور کھانے پر جب گفتگو چھڑی اور لطائف و ظرافت کی بازی لڑی تو دیکھنے والوں نے دیکھا کہ جوڑ برابر کی تھی۔''(13)

اسکول میں اپنی شرارتوں کے باوجود پرنسپل اور اپنے استادوں کے بہت چہیتے تھے۔ مگر باقاعدہ تعلیم میں جی نہیں لگتا تھا، کہتے ہیں کہ کوئی سترہ اٹھارہ برس کے رہے ہوں گے کہ ایک دن دوپہر کو لکھنؤ سے، غالباً اسکول سے دو ایک دن کی چھٹی لے کر گھر آگئے۔ سر پر شادی کا بھوت سوار تھا والدہ کے پیچھے پڑ گئے کہ ہماری شادی کرا دیجیے۔

''ویسے بُوبُو کو بھی ان کی شادی جلدی ہی کرنے کی تمنا تھی، ان کا اصرار دیکھ کر انھیں آخر حامی بھرنا ہی پڑی۔ پھر بھی خیال یہی تھا کہ دو چار مہینے میں

> کہیں بات چیت کر کے لڑکی ڈھونڈھ لی جائے گی۔ مگر میاں جان کہن کہ جلدی کردیو — فوراً — ہمارے نانا اور ہمارے دادا کا خاندان ایک تھا۔ نانا اور دادا چچازاد بھائی تھے، ہم سب لوگوں کا خاندان دراصل سنّی تھا میاں جان کی یہ جلدی، بُوبُو اور کہاں دیکھتیں، کہاں جیتیں، نانا کے گھر گئیں۔ سارا معاملہ بتائن، بات چیت کہین اور پیام دے دیا گوا۔ سب لوگ رشتے دار تو تھے ہی، لڑکا خوبصورت، تندرست اور پھر تعلقدار۔ اتنے بڑے تعلقے کا اکیلا وارث۔ بہرحال رشتہ طے ہوئے گوا۔ ان کی جلدی کی وجہ سے شادی فوراً کرنا پڑی، وہی دن دوپہر کا نکاح ہوئے گوا۔"(14)

چودھری صاحب کی عمر کوئی پچیس برس کی ہوگی جب علاقہ کورٹ آف وارڈس سے چھوٹا اس وقت ان کی شادی کو آٹھ سال ہوچکے تھے اور گھر میں پانچ بچے ہوچکے تھے۔ اسکول چھوٹ چکا تھا، رسمی تعلیم ختم ہوگئی تھی مگر مطالعے کا جو شوق قدرت نے ودیعت کیا تھا، بلاتخصیص ہر مضمون پڑھنے اور سمجھنے کا جو ذوق انھیں فطرتاً ملا تھا اس کی وجہ سے چار دیواروں میں محدود بلکہ محبوس مدرسوں کے بجائے ان کے چاروں طرف پھیلی ہوئی ان کی دنیا ان کی درس گاہ بن گئی۔ اردو، عربی، فارسی اور ہندی ادب سے ان کی گہری واقفیت تھی۔ اگر ایک طرف انگریزی ادب، مغربی آرٹ اور مغرب کے فلسفے کو کھنگالا تو دوسری طرف ہندو مذہب اور اخلاقیات کی کتابیں بھی ان کے مطالعے کا ایک اہم حصہ رہیں۔ یہ ماحول کا اثر تھا یا طبع کی افتاد کہ ہندستانی موسیقی بلکہ سارے فنون لطیفہ میں انھیں درک حاصل تھا۔ اردو ان کی مادری زبان تھی۔ نہایت عمدہ اردو بولتے تھے، اسی کے ساتھ ساتھ انگریزی بھی نہ صرف یہ کہ اچھی بولتے تھے بلکہ لکھتے بھی بہت عمدہ تھے۔ زندگی کے عمیق تجربے اور علم کے اس ذوق نے انھیں مشرقی تہذیب اور مغرب کی صحت مند اقدار کا ایک ایسا نمونہ بنا دیا تھا کہ جس کو الفاظ میں بیان کرنا مشکل ہے۔ اس کی توثیق بہرحال ہر وہ شخص کرسکتا ہے جسے چودھری صاحب کو دیکھنے، ان سے بات کرنے اور ان کے ساتھ کچھ وقت گزارنے کا موقع ملا ہے اور ابھی ایسے لوگ کافی ہیں۔

اچھی زندگی بسر کرنے کا ہنر جاننا وہ ہر شخص کے لیے ضروری سمجھتے تھے، اسی لیے جہاں تک تعلیم اور تربیت کا تعلق ہے، کہ یہ ہنر ان ہی دو عناصر سے تشکیل پاتا ہے۔ اس کی اہمیت اور ضرورت ان کے نزدیک صرف اپنے بچے بچیوں کے لیے ہی نہیں تھی بلکہ وہ اسے تمام لوگوں کے لیے ضروری سمجھتے تھے۔ اسی لیے وہ پاس پڑوس کے بچے بچیوں کی تعلیم و تربیت کے مسائل سے بھی دلچسپی رکھتے تھے۔ ردولی میں آج بھی بہت سے ایسے افراد ہوں گے جن کی ابتدائی تعلیم میں چودھری صاحب کی خاموش مگر ٹھوس اعانت شامل رہی۔

''میاں جان کو لڑکیوں کی تعلیم اور ان کی اچھی تربیت سے خصوصی دلچسپی تھی۔ اگر ان کے ایک بیٹے نے آکسفورڈ سے ڈگری لی تو دوسری طرف ان کی ساری لڑکیوں نے بھی اردو اور عربی کے ساتھ ساتھ بہترین اور معیاری انگریزی تعلیم حاصل کی۔ وہ چاہتے تھے کہ لڑکیوں کی تربیت خالص اسلامی بلکہ اہل بیت اطہار کے گھرانے کی طرز پر ہو۔ شرم و حیا، برداشت، بردباری اور تمیز و اخلاق وغیرہ۔ دولت و ثروت اور زندگی کی آسائشوں سے بے حد دلچسپی تھی مگر اسی کے ساتھ چشم نم کی عظمت اور اس کے احترام کا انھیں شدید خیال رہتا تھا۔ یہی سب چیزیں وہ اپنے بچوں اور بچیوں میں دیکھنا چاہتے تھے۔ محرم کی مجالس کی وجہ سے یہ سب باتیں ہم لڑکیوں کے لیے بے مزہ نصیحتوں کے بجائے شربت کے گھونٹ تھیں۔ انھیں سمجھنا اور ان پر عمل پیرا ہونا بھی ہمیں آسان لگتا تھا۔ علم کی اہمیت اور اس کی ضرورت بھی ذہن نشین ہو چکی تھی۔ یہ فیض تو میاں جان سے ہمہ وقت حاصل ہوتا تھا۔ اس زمانے کی روایات اور عام چلن کے خلاف ہم چاروں بہنوں کو مسلم گرلز اسکول میں داخل کرایا گیا۔ یہ اسکول پہلے الہ آباد میں تھا۔ میں پانچ سال کی تھی جب اسکول گئی، کرامت حسین کا یہ اسکول اب تو کالج ہوئے گوا ہے۔ شرفاء کی لڑکیوں کو اچھی تعلیم کے ساتھ ساتھ تہذیب و شرافت کی تربیت دینے کے لیے خاص طور پر قائم کیا گیا تھا۔ میاں جان کرامت حسین صاحب کے بہت دوست تھے۔[15] انھوں نے خاص طور پر کہا کہ محمد علی تم اپنی لڑکیوں کو

اسکول بھیجو۔ ہم چار بہنیں تھیں، ہم سب سے چھوٹے تھے اس لیے ہم الہ آباد تو نہیں جاسکے مگر جب اسکول وہاں سے لکھنؤ آیا تو سب بہنوں کے ساتھ ہمیں بھی وہیں بھیج دیا گیا۔"(16)

جہاں تک رہن سہن کا تعلق ہے بہرحال تعلقہ دار کا گھر تھا۔ شاندار مکان، مکان کا عالیشان پھاٹک، پھاٹک پر سپاہی۔ ویسے ردولی میں تعلقہ داروں کے گھروں کے پھاٹک عام طور پر بڑے تھے بلکہ آج بھی ہیں۔ یہ پھاٹک عموماً اتنے بڑے ہوتے تھے کہ ان میں سے ہاتھی آسانی سے گزر جائے۔ چودھری صاحب کے مکان کے دو حصے تھے، ایک زنانہ اور ایک مردانہ۔ دونوں حصے بہت بڑے تھے۔ مردانے مکان میں بہت سے بڑے بڑے کمرے اور برآمدے تھے۔ ایک بہت بڑا گول ہال تھا۔ دو بڑے کمروں میں چودھری صاحب کی کتابیں تھیں۔ ایک بڑا کمرہ اور تھا جس میں کھانے کی میز کرسیاں اور ڈرائنگ روم سے متعلق دوسرا ساز و سامان تھا۔ کمرے کی دیواروں پر مشرق و مغرب کے مشہور زمانہ پینٹرز کی شاہکار تخلیقات آویزاں تھیں۔ پچھلے برآمدے کے سامنے ایک بہت بڑا چبوترہ تھا اور چبوترے کے سامنے کئی بیگھوں میں پھیلا ہوا باغ جس میں طرح طرح کے پھلوں اور پھولوں کے درخت لگے ہوئے، پھولوں کی کیاریاں اور چہل قدمی کے لیے پختہ روشیں تھیں۔ اپنی چھوٹی بیٹی یعنی ہما اخلاق حسین کے نام ان کے ایک خط میں تھوڑا سا ذکر اس باغ کا ہے۔

"..... اس وقت صبح کے آٹھ بجنے والے ہیں، ابر گھرا ہے، بوندیں پڑ رہی ہیں، باغ میں ہر طرف ہریالی ہے، بیس دن ادھر ہر سبزی میں زردی، ہر پتی مرجھائی اور اب ماشاء اللہ ہر چیز ایسی معلوم ہوتی ہے جیسے لڑکی میکے پہنچ گئی ہو۔ ٹھنڈی ہوا پہاڑ سے بہتر چل رہی ہے۔ وہاں تو گرم کپڑے نہ پہنو تو چل لگ جائے۔ یہاں کھلے بندوں بیٹھے رہو، برسات کی جھڑی لگی ہے، درخت جھوم رہے ہیں جب ہوا زور سے گدگداتی ہے تو ہنسی کے مارے ایسا لوٹتے ہیں کہ ہنستے ہنستے گر پڑیں گے۔ آج کل گلاب کی کلیاں توڑ ڈالی جاتی ہیں کہ آئندہ بہار میں درخت کمزور نہ ہوں۔ مگر آنکھیں رنگ کو ترس گئی تھیں

اس لیے میں نے کلیاں نہیں چنوائیں، پھول اچھے نہ سہی مگر رنگ تو ہے،
گلاب کے علاوہ ساوَنی، چاندنی، انار خوب پھولے ہیں، کامنی کا کیا کہنا! بار
الہا شکرا شکرا عفوا عفوا عفوا۔"(17)

زنانے گھر کی کرسی بہت اونچی تھی۔ چار پانچ سیڑھیاں چڑھنے کے بعد گھر کا بڑا دروازہ تھا۔ دروازے سے داخل ہوتے ہی ایک بہت بڑا بروٹھا (ڈیوڑھی) تھا۔ اس بروٹھے کے بعد گھر کا آنگن شروع ہوجاتا تھا۔ وسیع و عریض صحن کا فرش پختہ تھا۔ صحن کے بیچ میں بڑے بڑے تخت بچھے رہتے تھے۔ گرمیوں میں ادھر دھوپ آنگن سے گئی اور ادھر سقّے نے پانی کا چھڑکاوَ کیا۔ تخت پر قالین اور سفید چاندنیاں یا رنگین جاجم (پھول دار چادریں) لگا دی گئیں۔ گاوَ تکیے رکھ دیے گئے۔

آنگن کے دو طرف بڑے بڑے دالان تھے۔ دالانوں کے دروازوں پر گرمیوں میں پردے پڑے رہتے تھے جو اندر بیٹھنے والوں کو دھوپ کی تمازت اور لو کے تھپیڑوں اور گرد و غبار سے بچاتے تھے۔ دالانوں کے اندر دونوں سروں پر بڑی بڑی صحنچیاں تھیں اور پیچھے بڑے بڑے کمرے، صحن کی تیسری جانب گھر سے باہر جانے کا ایک اور دروازہ تھا۔ کام کرنے والے ملازمین اور مہترانیاں وغیرہ اسی دروازے کو استعمال کرتے تھے۔ غسل خانے اور پاخانے بھی اُدھر ہی تھے۔ ایک طرف بہت بڑا باورچی خانہ تھا۔ اس زمانے میں گیس تو تھی نہیں، سارا کھانا لکڑی اور کوئلوں پر پکتا تھا۔ باورچی خانے سے ملحق ایک بڑی سی کوٹھری صرف لکڑی رکھنے کے لیے تھی۔ قریب ہی ایک کوٹھری اور تھی جس میں "سیدھا" (اناج وغیرہ) رکھا جاتا تھا۔ دالانوں کے پیچھے بنے ہوئے کمرے بہت ٹھنڈے ہوتے تھے۔ گھر کے تمام افراد گرمیوں کی دوپہریں ان ہی ٹھنڈے کمروں میں گزارتے تھے۔ ہر کمرے میں پنکھے لٹکے تھے، چھت کے پنکھے، اس وقت بجلی کے پنکھے تو تھے نہیں۔ کپڑے کی جھالر لگے ہوئے ان پنکھوں سے ٹھنڈی ہوا مل جاتی تھی، چھوٹے کمرے میں ایک پنکھا اور بڑے کمروں میں دو پنکھے ہوتے تھے۔ گرمیوں میں پنکھا قلی، زنانے میں کوئی عورت اور مردانے مکان میں کوئی مرد ساری دوپہر کمرے کے

باہر لٹکی ہوئی ڈوری سے پنکھے کھینچتا رہتا تھا۔ صحن میں ایک طرف اینٹوں کی پختہ گھڑونچی بنی ہوئی تھی، جس پر ایک وقت میں چھ گھڑے آجاتے تھے۔ گرمیوں میں یہ گھڑے خاص طور پر آرڈر دے کر بنوائے جاتے تھے۔ ان گھڑوں کی مٹی میں بالو (ریت) کی مقدار زیادہ ہوتی تھی جس کی وجہ سے ان میں پانی خوب ٹھنڈا ہوتا تھا۔ گھڑوں کے منہ نہایت صاف کپڑے سے ڈھکے رہتے تھے۔ پانی پینے کے لیے عموماً نقشین کٹورے، قلعی کیے ہوئے ہوتے تھے۔ کھانے کے وقت اگر کنوئیں کا تازہ پانی زیادہ ٹھنڈا سمجھا گیا تو پھر کنویں سے اسی وقت تازہ پانی بھروا لیا جاتا تھا۔

باہر اور اندر دونوں حصوں میں روشنی کے لیے لالٹین اور چراغ جلائے جاتے تھے۔ کمروں میں خوبصورت چینی لیمپ جلتے تھے۔ مغرب کی نماز سے پہلے اور عصر کی نماز کے بعد ایک ملازم ساری لالٹینیں اور چراغوں کو صاف کرتا، ان میں مٹی کا تیل ڈالتا اور اندھیرا ہوتے ہی انھیں جلاکر ان کی مقررہ جگہوں پر پہنچا دیتا تھا۔ دعوتوں اور تقریبات کے موقع پر گیس لیمپ (ہنڈے) استعمال ہوتے تھے۔ جیسا کہ میں نے پہلے کہا کہ صحن میں تخت تھے اور گرمیوں میں شام کو چھڑکاؤ کے بعد چاندنیاں لگا دی جاتی تھیں، تکیے رکھ دیے جاتے تھے۔ شام ہی کو پلنگ بھی آنگن میں نکل آتے تھے۔ سرہانے بستر رکھ دیے جاتے تھے، بستر آدھے تہہ کیے ہوئے اور آدھے بچھے ہوئے ہوتے تھے۔

> "بُوبُو کے پلنگ پر پاندان اور پلنگ کے نیچے اگالدان رکھ دیا جاتا تھا۔ بردوٹھے سے آنگن میں داخل ہوتے ہی بائیں ہاتھ پر ایک سہ دری میں ایک بڑا سا تخت اور دو تین پلنگ بچھے ہوئے تھے۔ سردیوں کی راتوں اور گرمیوں کے دنوں میں، مگر دوپہر سے پہلے تک ہم سب لوگ عموماً اسی سہ دری میں جمع رہتے تھے۔ بُوبُو بھی اپنے پاندان کے ساتھ یہیں بیٹھی رہتی تھیں۔ قریبی رشتے دار بھی اسی سہ دری میں بُوبُو کے پاس بیٹھا کرتے تھے۔ میاں جان بھی جب اندر آتے تو وہ بھی یہیں بیٹھ جاتے تھے۔ کبھی کبھی پلنگ پر لیٹ جاتے اور پھر گھنٹوں ہم لوگوں سے باتیں کرتے رہتے تھے۔"(18)

گھر کے اندر بہت سی لڑکیاں اور عورتیں کام کرتی تھیں، برتن دھونا، جھاڑو لگانا، گھر کی عام صفائی کرنا، پلنگ نکالنا، بستر لگانا ان ہی لڑکیوں اور عورتوں کا کام تھا۔

''ان ہی عورتوں میں ایک رہیں غفوراً مائے (ماں) میاں جان کی دائی رہئیں۔ میاں جان ان کو غفوراً مائے ہی کہت رہئیں۔ ان کے دیکھا دیکھی ہم لوگ بھی یہی کہت رہن۔ اُو میاں جان کو دودھ پلائن رہیں۔ ان کی عُمر بہت رَہے۔ بہت بوڑھی ہوئے گئی رہیں۔ مگر باورچی خانے کی انچارج اُن ہی رہیں۔ ہُواں کا سارا انتظام اُن ہی کے ہاتھ میں رہے۔ وہ خود بھی کھانا بہت اچھا پکاوَت رہیں۔ ان کی پکائی ہوئی یوں تو ہر چیز بڑھیا ہوت رہے مگر ان کی چپاتی کا جواب نہیں رَہے۔ بڑی باریک اور انتہائی نفیس، اُو پاوَ بھر آٹے میں آٹھ چپاتیاں پکاوَت رہیں۔ جب عُمر بہت ہوئے گئی اور کام کرنا ان کے لیے دشوار ہوئے گوا تو پھر کام کرنے والی لڑکین سے وہ اپنی نگرانی میں اپنی ہدایت کے مطابق کام کراوَت رہیں۔ باورچی خانے میں کھانا پکنے سے لے کر دسترخوان تک اُو کے پہنچنے اور لگنے تک غفوراً مائے ایک ایک بات پر نظر رَکھت رہیں۔ کھانا مزے کا ہوئے، او کی شَکل صورت اچھی ہوئے، دسترخوان پر مناسب برتنوں میں سلیقے سے لگا ہوئے، رتی بھر گڑبڑ نہ ہوئے۔ ملازمین تہذیب اور تمیز کے ساتھ کام میں صفائی ستھرائی کا خیال رکھیں کسی کام میں نفاست کے کسی معیار کو ٹھیس نہ لگے۔ چنانچہ سارے کام ہوتے بھی اسی طرح تھے اور یہ سارا کام غفوراً مائے کا ہوتا تھا۔ ....''(19)

یہاں پر ایک واقعہ یاد آگیا۔ جامعہ ملیہ اسلامیہ کے وائس چانسلر پروفیسر محمد مجیب مرحوم کو ایک ملازم کی ضرورت تھی، کسی موقع پر ہم لوگوں کے سامنے اس کا ذکر ہوا، چمرد نانا (چودھری محمد علی) کے یہاں کام کرنے والا ان کا ایک خاص آدمی، جوان کا ڈرائیور بھی تھا، اب وہاں کام چھوڑ چکا تھا اور بے کار تھا۔ ہم لوگوں نے مجیب صاحب کے سامنے یہ تجویز رکھی اور بتایا کہ ایک آدمی ہے جو چودھری محمد علی کے پاس تھا، اب وہ

بے کار ہے۔ اگر آپ کہیں تو ہم لوگ اسے بلوا دیں۔ آپ اسے کچھ دن رکھ کر دیکھیے اگر پسند آجائے تو مستقل رکھ لیجیے گا۔ انھوں نے کہا کہ اسے فوراً بلوا لیجیے اور عارضی طور پر رکھنے کی ضرورت نہیں ہے۔ ملازم سلیقہ مند تو ہوگا ہی، مہذب اور معتبر ہونے کی یہی ضمانت میرے لیے بہت ہے کہ وہ چودھری صاحب کے ساتھ رہ چکا ہے، ان کا کام کرچکا ہے، اس ذرا سی بات سے اس زمانے کی شرافت پر اعتماد اور معاشرت کی بنیادوں کا کچھ اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔

چودھری صاحب اچھے کھانے کے شوقین تھے۔ خود عموماً ہلکا اور مزے کا کھانا کھاتے تھے مگر چاہتے تھے کہ دسترخوان پر تمام عمدہ کھانے موجود ہوں۔ قورمہ، پسندے، بھرے ہوئے شامی کباب جو بہت ہی خوش وضع، خوشبودار اور نہایت مزیدار ہوتے تھے۔ انھیں بہت پسند تھے، ان کبابوں کی تیاری میں بڑا اہتمام ہوا کرتا تھا۔ ترکاریوں میں پرَوَل اور بھنڈی چودھری صاحب کو بہت مرغوب تھی۔ لوکی اور ترئی بہت شوق سے کھاتے تھے، چقندر گوشت بہت اچھا لگتا تھا، دوپہر کے کھانے میں میٹھا دہی ضروری تھا۔ بھینس کے دودھ کو اچھی طرح پکا کر خوب گاڑھا کرلیا جاتا تھا۔ پھر اس میں گوجر کے یہاں کا دہی (میٹھا)، پھر تھوڑی سی شکر اور ذرا سا عرق کیوڑہ ڈال کر مٹی کے پیالوں میں جما دیا جاتا تھا۔ ایسے دو پیالے ہر روز ان کے دسترخوان پر ہوتے تھے۔ انھیں اپنی صحت کا بہت خیال تھا اسی لیے کھانے میں مزے کے ساتھ ساتھ اُس کی غذائیت کا بھی خاص خیال رکھا جاتا تھا۔

چودھری صاحب کو جس طرح کھانے کا شوق تھا، اسی طرح کھلانے کا بھی شوق تھا۔ آئے دن دعوتیں ہوتی رہتی تھیں۔ دوستوں کا حلقہ خاصا وسیع تھا۔ مسلمانوں کے علاوہ ہندو رؤسا اور انگریز افسران بہت تھے جن سے گہری دوستی تھی۔ یہ احباب اکثر کھانے پر آتے رہتے تھے، مردانے مکان کے گول کمرے میں ایک بہت بڑی میز لگی ہوئی تھی، جس پر بیک وقت پچیس تیس آدمی بیٹھ سکتے تھے، میز کے ساتھ کرسیاں تھیں۔ کمرے میں جگہ جگہ پھولوں کے گلدان اور خوبصورت پودوں کے گملے رکھے رہتے تھے۔ کھانے کے برتن اور دوسرا سامان انگریزی طرز کا ہوتا تھا، کانٹے چھری وغیرہ۔ اب یہ

کھانے والے پر منحصر تھا، وہ چاہے تو ہاتھ سے بھی کھا سکتا تھا اور اگر چاہے تو چھری کانٹے سے بھی۔ بہرحال میز پر سب چیزیں موجود رہتی تھیں۔ کھانے سے پہلے اور کھانے کے بعد ہاتھ دھونے کا باقاعدہ اہتمام ہوتا تھا۔ برآمدے کے ایک در میں ایک آدمی ہاتھ دھلانے کے لیے بڑے سے لوٹے میں پانی اور ایک دوسرا آدمی تولیہ اور صابن لیے کھڑا رہتا تھا۔ سردیوں میں پانی کا گرم ہونا ضروری تھا۔ فرش چونکہ پختہ تھا اس لیے ایک سلفچی رکھی جاتی تھی تاکہ پانی ادھر ادھر نہ بہے۔ صرف یہی نہیں بلکہ سلفچی میں تھوڑی سی تازہ باریک کٹی ہوئی گھاس سلیقے کے ساتھ بچھا دی جاتی تھی، تاکہ پانی کی چھینٹیں نہ اڑیں اور کپڑوں کو خراب نہ کردیں۔

میں نے کہیں ذکر کیا ہے کہ تعلقہ دار کا خاندان نہ جانے کتنے غریب خاندانوں کی کفالت و پرورش کا ذریعہ ہوا کرتا تھا۔ چودھری صاحب کے یہاں کام کرنے والوں کی اچھی خاصی تعداد تھی، اندر اور باہر کام کرنے والے مردوں اور عورتوں کو تنخواہیں تو ملتی ہی تھیں اس کے علاوہ کپڑے اور تہواروں کے موقعے پر تہواری کے نام سے نقد رقمیں بھی دی جاتی تھیں۔ شادی بیاہ یا ایسی ہی گھریلو تقریبات پر جوڑے اور نقدی اور کبھی کبھی چھوٹے چھوٹے زیورات بھی ملتے تھے۔ غرض سارے ملازمین کی اکثر ضروریات اسی طرح پوری ہوجایا کرتی تھیں۔

''خود غفورا ماسے کو ان کے پورے خاندان کے ساتھ یعنی بیٹا، بہو، بیٹی، پوتے پوتیاں، نواسے اور نواسیاں سب کو ہمارے ہی گھر سے کھانا ملتا تھا۔ ماسے کے یہاں کے جتنے لوگ کھائیں جو کھائیں، ماسے کو کھلی اجازت تھی۔ چنانچہ وہ اپنے اور اپنے متعلقین کے لیے کھانا لے جاتی تھیں۔ سالن، گوشت، کباب، دال چاول روٹی اور اگر کوئی مٹھائی ہو تو وہ بھی۔ غرض جو گھر والے کھاتے تھے، جو کچھ گھر میں پکتا تھا، ہر چیز میں ماسے کا حصہ ہوتا تھا۔ ایک بڑی سی ڈلیا رہے، دونوں وقت کا کھانا وہی ڈلیا میں اپنے اور اپنے گھر والوں کے لیے لے جات رہیں۔ اسی ڈلیا میں وہ کالے جات رہیں، ہم لوگوں میں سے کسی کی اتنی مجال نہیں رہے کہ کوئی ان سے کچھ

> سوال کرلے یا یہ دیکھ لے کہ او ڈلیا میں کا لیے جارہی ہیں۔ غفوراً مائے سچ تو یہ ہے کہ میاں جان کو صرف دودھ ہی نہیں پلائن رہیں بلکہ ان کی ساری پرورش ان ہی کیہن رہیں۔ اسی لیے میاں جان نہ صرف یہ کہ ان کا احترام کرت رہیں بلکہ شاید چاہت رہیں کہ گھر کا ہر فرد ان کا ہر طرح خیال رکھے۔ مائے کو میاں جان تھوڑی سی زمین اور ایک گھر بھی دیہن رہیں۔ گاؤں سے جب غلہ آتا تھا تو اس میں بھی مائے کا حصہ ہوتا تھا۔ ''(20)

میرے (مرتب) والدین کا قیام بارہ بنکی شہر میں تھا۔ میرے نانا حکیم نعمت رسول بہت مشہور حکیم تھے، ان کی شہرت دہلی اور بڑے بڑے شہروں تک تھی۔ مجھے یاد ہے کہ کسی بڑے رئیس کا علاج کرنے وہ دہلی جایا کرتے تھے۔ ان کا دہلی کا سفر اس لیے بھی خوب یاد ہے کہ وہاں سے واپسی پر وہ سارے خاندان کے لیے تحائف لایا کرتے تھے۔ چھرو نانا (چودھری محمد علی) یوں تو حقیقتاً برج کے شوقین تھے مگر جب کبھی بارہ بنکی آتے تھے تو حکیم نانا اور ان کے کئی دوست جمع ہوتے تھے اور کئی کئی دن تک پچیسی کا کھیل ہوا کرتا تھا۔ گورا رنگ، شاندار مونچھیں، چھالٹین (لٹھے) کا چوڑی دار پاجامہ، کالی سرج کی شیروانی، اور سرج ہی کی ٹوپی۔ ایک ملازم ان کے ساتھ ہوا کرتا تھا۔ خوبصورت آدمی تھے اور انتہائی جامہ زیب، چہرے پر ہر وقت ایک مسکراہٹ کھیلتی رہتی تھی، جی چاہتا تھا کہ آدمی بس دیکھتا ہی رہے، جس طرح لباس میں نفاست اور سلیقہ تھا اسی طرح اٹھنے بیٹھنے اور گفتگو میں نفاست اور تہذیب نظر آتی تھی۔

> ''لباس کے معاملے میں میاں جان بڑے نفاست پسند تھے۔ گرمی ہو یا سردی، بہت عمدہ تن زیب یا ململ کے (وائل اس زمانے میں نکلا نہیں تھا) ہاتھ سے سلے ہوئے کلی دار کرتے پہنتے، کرتوں کی لمبائی عموماً گھٹنوں تک ہوتی تھی۔ کرتے انتہائی سادہ اور سجل، کوئی لیس یا بیل یا کالر وغیرہ نہیں ہوتا تھا۔ کرتوں کے ساتھ بہترین چھالٹین (لٹھا) کے پاجامے ہوتے تھے۔ اب معلوم نہیں کہ ہندستان میں ویسے پاجامے پہنے جاتے ہیں یا نہیں۔ میاں جان کے پاجاموں کا ایک پائینچا ایک فٹ کے قریب چوڑا ہوتا تھا۔ پائینچے

نیچے سے ناخونی (باریک) مڑے ہوئے ہوتے تھے۔ گھر میں عموماً یہی لباس تھا۔ جب کہیں باہر نکلتے تھے تو جامیوار، جامدانی یا سرج کی شیروانی یا انگرکھا پہنتے تھے۔ اگر شیروانی پہنی ہے تو سر پر اسی کے ساتھ کی ٹوپی ہوتی تھی۔ انگرکھے کے ساتھ چکن کی نہایت نفیس دوپلی ٹوپی رہتی تھی۔ جوتا وارنش کا ہوتا تھا، عموماً پمپ، اکثر بالکل سادہ کبھی کبھی اس پر کالے رنگ ہی کی بو (Bow) لگی ہوتی تھی۔ ڈوری دار جوتا بہت کم استعمال کرتے تھے، صرف کسی خاص موقع پر۔

جاڑوں میں سوئٹر تو ہم نے کبھی نہیں دیکھا، گھر میں ڈریسنگ گاؤن پہن لیتے تھے وہ بھی بہت موٹا یا بھاری بھرکم اور بھدا نہیں ہوتا تھا۔ جیب میں سفید رومال ضرور رہتا تھا۔ جوانی میں نفیس کپڑوں کے ساتھ ساتھ پھولوں اور خوشبوؤں کا بہت شوق تھا، بستر پر چنبیلی کے پھول رکھے جاتے تھے۔ حقہ پیتے تھے، ان کے حقے کی نظیر ملنا مشکل ہے۔ اللہ اللہ کیا اہتمام ہوتا تھا۔،،(21)

ردولی میں نیچے باندھنے والے دو تین کاریگر قرب و جوار تک مشہور تھے۔ ان ہی لوگوں کو باقاعدہ مزید ہدایتیں دے کر پتلی نے کے بڑے سبک اور خوبصورت نیچے بنوائے جاتے تھے۔ یہ نیچے چودھری صاحب تحفتاً اپنے دوستوں کو بھی بھیجا کرتے تھے۔ لکھنؤ کا مشہور خمیرہ (تمباکو کشیدنی) استعمال ہوتا تھا جس کی خوشبو سے ساری فضا معطر ہوجاتی تھی۔ اس کی مہک آج بھی یاد آتی ہے۔ تمباکو کی خوشبو اگر مشام جاں ہوتی تھی تو حقے کی ظاہری شکل جنت نگاہ...... چاندی کی تھالی میں حقہ (پینڈا)، نازک نے پر لپٹا ہوا تازہ پھولوں کا ہار عجب بہار دکھاتا تھا۔ چلم مٹی کی، کمہار سے آرڈر دے کر بنوائی جاتی تھی، نہایت سبک اور خوبصورت۔ چلم کے اوپر چاندی کا چنبل (چنبر) چنبل سے نیچے، نیچے کے گٹے تک چاندی کی چھ سات پتلی پتلی حسین زنجیریں اور ان زنجیروں میں جگہ جگہ چھوٹے چھوٹے چاندی ہی کے پھول۔ ظاہر ہے کہ اس سج دھج کا حقہ رکھنے اور پھر اس اہتمام سے حقہ پینے کے لیے وسائل کے ساتھ ساتھ شوق کی بھی ضرورت ہوتی

سلیقے اور ذوق کی بھی۔

گھر کے زنانے حصے کی طرح مردانے میں بھی مختلف کاموں کو انجام دینے کے لیے مختلف لوگ تھے۔ سپاہی، چوکیدار، اوپر کا کام کرنے والے، کھانا کھلانے والے (بیرر)، ان کے علاوہ چودھری صاحب کے ایک خاص خدمت گار تھے جن کا اصلی نام تو مجھے معلوم نہیں مگر کہلاتے مٹھو تھے۔ یہ چودھری صاحب کے خدمت گار بھی تھے اور رازدار بھی۔ مزاج شناس، ضرورتوں سے آگاہ اور نیتوں سے واقف۔

''بُوبُو کے پاس کام کرنے والی عورتیں اور لڑکیاں بڑی ٹرینڈ ہوتی تھیں، تمیزدار اور سلیقہ مند۔ بُوبُو کی پسند ناپسند جانتی تھیں اور ان کے کاموں کو، ان کی ضرورتوں کو خوب سمجھتی تھیں۔ گھر کے اندر صرف عورتیں آتی تھیں اور کام کاج کرتی تھیں۔ ہم لوگ بھی کام کرتے تھے، مگر ساری بہنوں میں سب سے زیادہ کام ہم ہی کرتے تھے۔ بُوبُو کے دوا علاج کا انتظام، ان کے کپڑوں کا انتظام، ان کی ڈائری، ان کا حساب کتاب لکھنا، ان کے خطوط لکھنا بُوبُو ہم ہی سے کراتی تھیں۔ کبھی کبھی بڑا مزہ آتا تھا۔ ہوتا یہ تھا کہ کوئی کام بُوبُو ہم سے کروا رہی ہوتیں اور ہماری بہنوں میں سے کوئی ایک اچانک آجاتی تو بُوبُو کو جیسے ایک دم کچھ جھجک سی ہوجاتی تھی، ان کو شاید کچھ یہ خیال ہوتا کہ بڑی بہنیں کہیں یہ نہ سوچیں کہ بُوبُو اپنے سارے کام صرف ہما سے کراتی ہیں۔ چنانچہ وہ جیسے ہی کسی بہن کو آتا دیکھتیں تو مجھ سے چپکے سے کہتیں، ''ہما اب رَہے دیو، بعد کا کیؤ'' مجھے اس وقت اور بھی مزہ آتا جب بہنوں کے جاتے ہی پھر ہم سے کہتیں ''بیٹا آؤ اب بیٹھ کے لکھ دیو، یہ کہہ کر خود بھی ہنس پڑتی تھیں۔''(22)

''ویسے ہم ان کے کام کرتے بھی تھے بہت شوق سے۔ وہ مطمئن بھی بہت ہوتی تھیں ہمارے کام سے اور سچ تو یہ ہے کہ ہم بُوبُو اور میاں جان دونوں ہی کے سکریٹری سے تھے۔ دونوں کی ایک ایک خوشی کو دیکھتے تھے اور اسے پورا کرتے تھے۔ کپڑے، دوا علاج اور دوسرے چھوٹے چھوٹے کاموں کے

علاوہ میاں جان جب کھانا مانگتے تھے تو ہم ہی باورچی خانے چلے جاتے تھے تاکہ ایک نظر دیکھ لیں کہ کوئی کمی یا کوئی گڑبڑ نہ ہو۔ کھانا نکلواتے تھے، دسترخوان لگواتے تھے اور پھر میاں جان جب تک کھائیں ہم پورے وقت ان کے پاس بیٹھا کرتے تھے۔ اسی لیے ان کو ہمارے اوپر کچھ بھروسہ سا ہوگیا تھا، ہم ان کے لیے ایک سہارا ہوگئے تھے۔ وہ بات بھی ہم سے بہت کرتے تھے، شعر و شاعری اور ادب پر بہت بات کرتے تھے۔ ہم ان کی باتوں کا مزہ لیتے تھے اور وہ ہماری داد کا لطف اٹھاتے تھے۔ وہ یہ سمجھتے تھے کہ ہم بہت سمجھتے ہیں۔

''میاں جان تھے بڑے مزے کے آدمی، گھر میں داخل ہوتے ہی پکار کر کہتے ''ہما آپا سلام، الّن بیٹی سلام، جلدی سے خود ہی سلاموں کا سلسلہ شروع کردیتے تھے۔ نام بنام سلام کی آوازیں آنے لگتی تھیں۔ شاید یہ طریقہ تھا ان کا ہماری تربیت کرنے کا۔ تہذیب اور تمیز سکھانے کے لیے وہ وعظ نہیں دیتے تھے، نصیحتوں کا طومار نہیں باندھتے تھے، بلکہ کچھ کرکے ہماری اچھی باتوں کو Appreciate کرکے عیب اور حسن میں تمیز کرنا سکھاتے تھے۔ بات بڑی نرمی اور محبت سے کرتے تھے، اخلاق کی تربیت میں بڑی میانہ روی اور نرمی تھی کہ ہم کو ٹھیس نہ لگے۔ کچھ برا نہ لگے۔''(23)

''میاں جان یوں تو بڑے ہی خوش مزاج اور انتہائی ہنس مکھ تھے۔ مگر انھیں کبھی کبھی غصہ بھی آتا تھا، اور جب آتا تھا تو خوب آتا تھا، کوئی کام مرضی کے خلاف ہوا اور نفاست اور تہذیب کے معیار پر کھرا نہ اترا تو پھر ان کی کیفیت دیکھنے والی ہوتی تھی۔ ہمہ وقت مسکراتے رہنے والے اور نرم خو چودھری صاحب اپنے غیض و غضب کا اظہار برملا کردیا کرتے تھے۔ ویسے ملازمین سے بات کرتے وقت، دوستوں اور بزرگوں سے گفتگو کرتے ہوئے، خواتین سے ہم کلام ہوتے ہوئے کسی نے بھی انھیں غصے سے یا زور سے بات کرتے نہیں دیکھا۔ مگر ہم نے ان کا غصہ اس وقت دیکھا ہے جب

کھانے کے سلسلے میں کوئی گڑبڑ ہوئی ہے، کھانا خراب یا وقت پر نہیں ملا ہے۔ خراب پکے ہوئے کھانے کا ایک ایسا موقع مجھے یاد ہے کہ کھانے سے بھری ہوئی تمام پتیلیاں انھوں نے اٹھااٹھا کر نالی میں پھینک دی تھیں۔ پتیلیاں الٹتے جاتے تھے اور کہتے جاتے تھے ''نہ کھایا ہے اور نہ کسی کو کھانے دیں گے۔'' ایسے وقت میں بُوبُو چپ سہ دری میں بیٹھی رہتی تھیں، سانس نہیں لیتی تھیں بُوبُو، سارے بچے، کارندے، نوکر نوکرانیں سب سہمے ہوئے یہ منظر دیکھتے رہتے تھے۔''(24)

''جیسا کہ میں نے پہلے کہا کہ گھر میں کام کرنے والے بہت تھے، اندر عورتیں اور لڑکیاں کام کرتی تھیں، ان میں چھوٹی چھوٹی بچیاں بھی ہوتی تھیں اور نوجوان لڑکیاں بھی۔ میاں جان جب کبھی اندر آتے تو ان لڑکیوں سے بھی خوب باتیں کرتے۔ انھیں ان سب سے باتیں کرنے میں بڑا لطف آتا تھا۔ یہ لڑکیاں بھی ان سے بہت خوش رہتی تھیں، ان کا احترام کرتیں اور ان کے کاموں کو جی لگا کر کرتی تھیں۔ باتیں بھی کیا بس کسی سے اتنا کہہ دیا ''بھئی تمرے کپڑے تو آج بہت ہی اچھے ہیں'' کسی کے کام کی تعریف کردیتے ''ہما دیکھو اس لڑکی کے کام میں نفاست کتنی ہے'' وغیرہ وغیرہ۔ ایسی باتیں سن کر یہ لڑکیاں تو مارے خوشی کے پھولی نہیں ساتی تھیں اور فائدہ یہ ہوتا تھا کہ میاں جان کا کام بھاگ بھاگ کر خوش ہو ہو کر کرتی تھیں۔''(25)

چودھری صاحب کی یہی خوش دلی اور خوش گفتاری تھی کہ ہر شخص ان کے پاس بیٹھنے اور ان کی گفتگو سننے کا مشتاق رہتا تھا۔ مجلسی آدمی تھے، ان کو خود بھی لوگوں سے مِل کر باتیں کرکے بڑی مسرت ہوتی تھی۔ نوجوانوں کے مجمع میں تو جیسے انھیں نئی زندگی مل جاتی تھی۔ پڑھی لکھی خواتین سے گفتگو کا موقع مل جاتا تو وہ خود بس یوں سمجھیے کہ کھلا ہوا پھول ہوجاتے تھے۔

''ایک بار میاں جان نے اپنے استاد کی بیٹی کو جو اس وقت اکتیس بتیس سال کی رہی ہوں گی کھانے پر بُلایا۔ ہم لوگوں سے کہا کہ آج تم لوگوں کی ملاقات ایک بہت اچھی لڑکی سے ہوگی۔ دیکھنا کتنی اچھی ہے، انتہائی خوبصورت، پڑھی لکھی اور بے پناہ ذہین۔ صاحبزادی کھانے پر آئیں، کئی گھنٹے رہیں، ہم لوگوں سے خوب بات چیت ہوئی، مگر ہم لوگوں کو ان میں کوئی ایسی غیر معمولی بات نظر نہیں آئی، ویسی ہی تھیں جیسی عام لڑکیاں ہوتی ہیں۔ قبول صورت، مہذب اور تعلیم یافتہ۔ ان کے جانے کے بعد ذکر چلا۔ ہم سب نے ایک زبان ہوکر کہا ''معاف کیجیے گا میاں جان، خوبصورت تو صاحبزادی کسی طرف سے نہیں ہیں اور ہم بھی ایسی کچھ کم نہیں ہے۔ تعلیم ہم لوگوں سے کچھ زیادہ تو نہیں معلوم ہوتی اور جہاں تک مہذب ہونے کا تعلق ہے تو مہذب تو ہم لوگ بھی ہیں۔'' ہماری بات سن کر میاں جان نے ایک قہقہہ لگایا اور کہنے لگے ''تم عورتیں کبھی کسی دوسری عورت کی تعریف نہیں کرسکتی ہو ہمیشہ چاہتی ہو کہ وہ تم سے دس برس بڑی نکلے، آنکھ ناک میں کوئی عیب ضرور ہو یا پھر آواز ہی خراب ہو۔'' اس کے بعد فرمانے لگے ''واللہ میں نے تو آج تک کوئی عورت بدصورت دیکھی ہی نہیں۔'' ہم لوگ چپ ہوگئے۔ ہنستے رہے، اس کے بعد کہتے بھی کیا۔ دوسروں کی تعریف کرکے ان کو خوش رکھنا میاں جان کی سب سے زیادہ پسندیدہ خوشی تھی۔''(26)

چودھری صاحب کی سب سے زیادہ ناپسندیدہ چیز اور جو لوگوں سے انھیں متنفر کردیتی تھی وہ تھی جھوٹ۔ وہ جھوٹ کو تمام برائیوں کی جڑ سمجھتے تھے۔ بقول بیگم ہما اخلاق حسین جھوٹ کی طرف ان کا یہی رویہ تھا جس کی وجہ سے ہم سب بھائی بہنوں نے بھی اس سے ہمیشہ پرہیز کیا۔

''حریص اور لالچی لوگ بھی انھیں اچھے نہیں لگتے تھے۔ رئیس تھے اس لیے ایسے لوگوں سے ان کا سابقہ بھی بہت پڑتا تھا۔ صحت مند نوجوان اور محنت نہ کرے، کوئی کام نہ کرے، یہ صورت حال ان کے لیے ناقابل برداشت بھی

تھی اور ناقابل معافی بھی۔ (جاگیرداری کے اس ماحول میں جس کا ہم تذکرہ کر رہے ہیں، بیٹھے بیٹھے کھانے کا چلن عام تھا اور عموماً اس رویے کو ریاست اور اَمارت کا نشان سمجھا جاتا تھا)۔ اپنی ضرورتوں کے لیے کسی کے سامنے ہاتھ پھیلانا یا اپنے اخراجات کے لیے کسی کا دست نگر ہونا چودھری صاحب کے نزدیک ذلّت کی انتہا تھی۔ متمول گھرانوں میں جہاں وسائل کی کوئی کمی نہیں ہوتی تھی، لڑکوں کی بیکاری، ان کی تن آسانی اور پھر بے راہ روی کا سبب اکثر والدین کی ہی لاپروائی اور ریاست و امارت کا یہی غلط تصور ہوتا تھا۔ اسی لیے ہٹے کٹے نوجوانوں کی بے کاری اور سہل پسندی کو وہ کسی طرح جائز یا قابل معافی نہیں سمجھتے تھے۔ ایسے نکمے اور آرام طلب نوجوانوں سے انھیں واقعی نفرت ہوتی تھی اور ایسے لوگوں کی مدد کرنا تو دور کی بات ہے ان سے ہمدردی کا اظہار بھی وہ روا نہیں رکھتے تھے۔ اِس کے برعکس ضرورت مند کی ضرورتیں پوری کرنے کا جیسے انھیں شوق تھا۔ اگر انھیں اس بات کا اندازہ ہوجاتا کہ کوئی واقعی پریشان ہے تو اس کی امداد دامے درمے سخنے کرنے سے گریز نہیں کرتے تھے۔ شاید غریبوں اور ضرورت مندوں کی مدد ہی کا جذبہ تھا کہ اپنی مصروفیتوں کے باوجود انھوں نے ہومیوپیتھک کی پریکٹس شروع کی۔ دوا مفت دیتے تھے، گرمیوں میں مکان کے سامنے والے برآمدے میں اور سردیوں کے موسم میں باغ کی طرف والے برآمدے یا پھر چبوترے پر کہ وہاں دھوپ خوب ہوتی تھی، صبح کے وقت آرام کرسی رکھ دی جاتی تھی، کرسی کے ایک طرف ایک چھوٹی سی میز پر ہومیوپیتھی کی کتابیں اور دواؤں کی شیشیوں کا ایک بکسا رکھا رہتا تھا۔ بعض دواؤں کے لیے پانی کی ضرورت ہوتی تھی، اس لیے صاف پانی کا انتظام بھی پاس ہی ہوتا تھا۔ مرد، عورتیں، بوڑھے جوان اور بچے سب ہی تو آتے تھے دوا لینے۔ اللہ میاں نے ان کے ہاتھ میں شفا بھی خوب دی تھی۔ حال سن کر، مرض کی علامتوں کو سمجھ کر بڑی زوداثر اور مجرب دوائیں دیتے تھے۔ بڑے پرانے پرانے مریض آئے اور اللہ کے کرم سے ان کی دوا سے شفایاب ہوئے۔

''ہماری بُوبُو بھی بیمار رہتی تھیں، ٹی بی کے کچھ آثار تھے، ہم اس وقت پیٹ میں تھے ڈاکٹروں کو بھی شبہ تھا ٹی بی کا۔ انھوں نے مشورہ دیا کہ ان کو الموڑہ بھیج دو، چنانچہ انھیں الموڑہ بھیج دیا گیا۔ ہم چونکہ الموڑہ میں پیدا ہوئے تو ہمالیہ پہاڑ اور برف کی نسبت سے میاں جان نے ہمارا نام ہما رکھ دیا۔ 'ہم' سنسکرت زبان کا لفظ ہے اور اس کے معنی برف کے ہوتے ہیں، صاف شفاف برف کے۔

ہمارا دل پیدائش کے وقت سے ہی کمزور تھا۔ ہر بیماری ہم کو بہت جلد لگ جاتی تھی۔ چیچک پھیلی تو وہ بھی ہمیں ہوگئی، کوئی وبا آئی تو وہ بھی لگ گئی۔ بچپن سے دمہ تھا، سخت پرہیز تھا۔ ایک دفعہ سنکھیا بھی دوا کے طور پر دی گئی...... مجھے یاد ہے میں نے اٹھارہ مہینے تک پرہیز کیا، برسوں دوا کر ڈالی مگر دمہ نہیں گیا۔ ایک دن میاں جان بالکل صبح صبح گھر میں آئے اور ہمارے پلنگ پر ہمارے پاس ہی بیٹھ گئے۔ ہم سو رہے تھے، ان کے آنے پر ہماری آنکھ کھل گئی مگر ہم لیٹے رہے۔ اس وقت ہماری سانس بہت پھول رہی تھی، میاں جان نے سن لیا کہ ہماری سانس کچھ بے چین سی نکل رہی ہے۔ انھوں نے پوچھا کہ بیٹی کیا تمھاری سانس پھول رہی ہے۔ ہم نے جواب تو کچھ نہیں دیا بس رونے لگے۔ انھوں نے جب مجھے روتے دیکھا تو دلاسا دیا اور مجھ سے کہا گھبراؤ نہیں ہم تم کو دوا دیں گے۔ یہ کہہ کر مٹھو (ذاتی ملازم) کو بلوایا اور کہا کہ کتاب اور دوا کا بکسا اٹھا لاؤ۔ اب ہم کو یاد نہیں ہم بھول گئے کہ سویرے تڑکے داہنی یا بائیں کروٹ لیٹنے سے سانس پھولتی تھی۔ میاں جان نے ہماری تکلیف کی اسی خصوصیت پر انگلی دھری۔ دواؤں کا بکسا کھولا۔ ایک شیشی نکالی اور اس میں سے دوا کا ایک قطرہ ایک گلاس پانی میں ملا کر اللہ شافی اللہ کافی کہہ کر پلا دیا تو بھیا اس وقت سے لے کر اس وقت تک، اب جب ہم نوے برس کے ہوگئے ہیں، پھر سانس کی تکلیف نہیں ہوئی۔ کمال کی دوا تھی، تمام دمہ، ڈاکٹر حکیم سب ہار گئے علاج کر کر کے، ہم اچھے

ہوئے تو میاں جان کے دیے ہوئے ہومیوپیتھی کے ایک قطرے سے۔ ٹی بی اس زمانے میں تو بڑی خوفناک بیماری تھی، اس کے نہ جانے کتنے مریضوں کو میاں جان نے ٹھیک کیا۔

سلمان (چودھری صاحب کے بڑے بیٹے) میاں جان کے لیے بڑی قیمتی چیز تھے، علاقے کے وارث تھے۔ سلمان ہمیشہ سے بڑے Refined قسم کے آدمی تھے۔ بڑے مہذب اور بڑی خوبصورت باتیں کرنے والے (یہ ہنرمیاں جان سے ملا تھا انھیں) بہترین انگریزی بولتے تھے۔ میاں جان کو ان پر ناز تھا۔ فخر کرتے تھے ان پر، انھیں بے پناہ چاہتے تھے، وہ ایک سہارا بھی تھے میاں جان کے لیے۔ جس وقت سلمان ان کے پاس ہوتے تھے اور ان سے باتیں کرتے تو میاں جان کو ایسا لگتا تھا کہ جیسے کوئی بڑی خوبصورت شے ان کے پاس ہے، کسی نادر و نایاب خزانے کے مالک ہیں وہ، سلمان کے لیے بھی ڈاکٹروں نے ٹی بی کا خدشہ ظاہر کیا تھا۔ ہماری بُوبُو کو بھی آنتوں کی ٹی بی تھی اس لیے میاں جان سلمان کے سلسلے میں اور بھی پریشان رہتے تھے۔ اس پریشانی میں وہ اکثر ٹہلا کرتے تھے۔ سلمان کو دوا دینا چاہتے تھے مگر ڈرتے تھے کہ کہیں دوا کا اثر الٹا نہ ہو اور مرض بڑھ جائے۔ تذبذب کے اس عالم میں ان کا ٹہلنا اور بڑھ جاتا تھا۔ پریشان ہو ہوکر بُوبُو سے پوچھتے ''بیگم ہم سلمان کو دوا دے دیں؟'' کئی دن ٹہلنے اور پریشان رہنے کے بعد ایک دن بولے ''بیگم ہم دیے دیتے ہیں دوا'' اور آخر اللہ کا نام لے کر دوا دے دی۔ یہ اللہ کی قدرت اور اس کی مہربانی کہ دوا کارگر ثابت ہوئی۔ مرض ختم ہوگیا۔ سلمان بالکل ٹھیک ہوگئے۔''(27)

''ہمارے دادا میاں کے یہاں ایک بڑے میاں رہتے تھے۔ ناچ گانے کی محفلوں کا انتظام کرنا، ایسے موقعوں پر خاطر تواضع کا مناسب اہتمام کرنا، گھر کے دوسرے کاموں پر نظر رکھنا غرض سب ہی چیزوں کے ذمے دار تھے۔ بچپن سے دادا کے پاس تھے، میاں جان انھیں دادا کہتے تھے۔ ان کی دیکھا

دیکھی ہم سب لوگ بھی انھیں دادا ہی پکارتے تھے، ان کا نام تھا بنچو، بنچو دادا۔ بنچو دادا کی بیوی بھی ہمارے ہی یہاں رہتی تھیں۔ بنچو دادا کو شدید قسم کی گٹھیا تھی۔ ساری زندگی دیکھا کہ بیچارے کا پاجامہ تیل کے دھبوں سے کالا رہتا تھا۔ مالش کیا کرتے تھے مگر مرض جانے کا نام نہیں لیتا تھا۔ ایک دن بنچو دادا نے دیکھا کہ میاں جان آرام کرسی پر بیٹھے دوا بانٹ رہے ہیں اور روز کی طرح مریضوں کا مجمع ہے، نہ جانے اس دن کیسے خیال آ گیا، پچاس سال سے تکلیف میں مبتلا تھے، میاں جان کی کرسی کے پاس آئے اور بولے ''اے بھیا چمرو (ہماری دادی کے بچے زندہ نہیں رہتے تھے تو کسی نے کہا کہ اب کی جب بچہ ہو تو اسے بیچ دینا، زچہ خانے میں دائی اور وہاں کی صفائی کرنے کے لیے ایک مہترانی ہوا کرتی تھی۔ تو جب میاں جان پیدا ہوئے تو انھیں وہی کام کرنے والی چمارن کے ہاتھ بیچ دیا گیا، اسی نسبت سے ان کا گھر کا نام چمرو ہو گیا۔ قصبے میں انھیں عام طور پر لوگ چمرو میاں ہی کہتے تھے) سب کا اچھا کرَت ہو اور ہم اِتے دن سے پریشان ہَن، ہمرے کپڑن کا حال دیکھو، ایک زمانہ ہوئے گوا دَرد سے چھٹی نہیں ملی، مگر تم کا کبھی ہمرا خیال نہ آوا، ہم کا دوا دے کے اچھا نہ کیہو''۔ میاں جان سن کر ہنسے اور بولے ''اچھا ہم تم کا دوا دیبا'' ان کو بھی دوا دی اور اللہ کا کرنا کہ ان کی تکلیف بھی بہت کم ہو گئی۔ اس کے بعد ہم نے دیکھا کہ بنچو دادا کے کپڑے بالکل صاف رہنے لگے، پاجامے پر کوئی رتی بھر نہ داغ نہ کوئی میل کچیل۔ بنچو دادا کی شکایت کا میاں جان کے دل پر اس وقت کچھ ایسا ہی اثر ہوا جیسا ہمارے رونے کا ہوا تھا۔ ان کو کچھ ایسا لگا کہ اللہ ہم بیٹھے ہیں تو آخر بنچو دادا کی طرف توجہ کیوں نہیں کرتے ہیں۔ ایسے حالات میں ان کے ارادے میں کچھ جان سے آجایا کرتی تھی۔''(28)

''چودھری صاحب کی ڈاکٹری کا ذکر ہو ہی رہا ہے تو ایک قصہ اور بھی سن لو۔ قصہ سچا ہے اور دلچسپ بھی۔ کسی بیگم صاحبہ نے خط لکھا اور دوا کی فرمائش

کی۔ خط میں یہ بھی لکھا کہ استحارہ(29) صرف تیری دوا استعمال کرنے کا آتا ہے۔ خط میں مرض کی کوئی تفصیل بھی نہیں تھی۔ خط پڑھ کر چودھری صاحب کو بہت لطف بھی آیا اور جھنجھلاہٹ بھی بہت ہوئی۔ نہ مرض کا کوئی نام نہ بیماری کی کوئی تفصیل، دوا دی جائے تو کیوں کر؟ بہرحال دوا بھیجی اور ساتھ ہی ایک خط۔''

''محترمہ!

آخر کچھ انصاف ہے، گھر گھوڑی نخاس مول(30) کیسے مرض کی تشخیص کروں اور کیسے دوا تجویز کروں، تقریباً بڑے گاؤں کے تمام سادات ابو الخیرات کا یہی حال ہے۔ مگر کیا کروں، دوا دینے کا کام ہی اپنے سر لیا، دوا نہ دوں تو کیا کروں، یہ گولیاں اُسی طرح ارسال ہیں جیسے بعض شریر لڑکے رات کو ڈھیلے پھینکتے ہیں، اگر لگ گیا تو واہ واہ اگر نہ لگا تب بھی لوگ پریشان تو ہوں گے ہی، اگر خدانخواستہ اس دوا سے آپ کو دو ہزار دست آجائیں یا دو ہزار قے ہوجائیں یا نصیب دشمناں آپ کا خطرہ ٹل گیا تو مجھ سے شکایت نہ کیجیے گا۔ اندھے کی داد نہ فریاد۔ ''(31)

کہتے ہیں کہ گاؤں کے آسامیوں کے لیے ان کے مطب کا کوئی وقت مقرر نہیں تھا۔ صبح، دوپہر، شام، رات، آرام کا وقت ہو یا کھانے کا، بیٹھے پڑھ رہے ہوں یا کچھ لکھ رہے ہوں، دوستوں سے پرلطف گفتگو میں مصروف ہوں، اگر کوئی آسامی دوا لینے آگیا ہے تو وہ سب کچھ چھوڑ کر اسے دوا دیتے تھے۔ غریب اور ضرورت مند سے ہمدردی کرنے اور اس کے کام آنے کا ایک عجیب جذبہ تھا ان کے اندر۔

اکثر گاؤں جاتے، کبھی تفریحاً کبھی کسی کام کی بناء پر مگر کبھی ایسا نہیں ہوا کہ وہ وہاں خالی ہاتھ گئے ہوں۔ بچیوں کے لیے رنگین موتیوں کی تلریاں، بچوں کے لیے مٹھائی کے کھلونے لے کر جاتے تھے۔ اگر لکھنؤ کے کسی سفر میں کہیں نقلی مگر خوبصورت اور اچھے زیورات نظر آجاتے تو لڑکیوں کے لیے ضرور لاتے۔ یہ زیورات وہ اپنے پاس رکھتے تھے اور بانٹتے رہتے تھے۔ پاس کی مسجد میں نماز پڑھنے جاتے تو چھوٹے چھوٹے

بچے پیچھے لگ جاتے تھے۔ بچوں کا ایک جلوس ساتھ ہو جاتا تھا۔ ان بچوں کو بھی وہ پیسے دیتے جاتے تھے۔

محلے والوں کے دکھ درد کی خبر رکھتے تھے اور ان کی تکلیفوں کو حسب مقدور رفع کرنے کی کوشش کرتے تھے۔ نوکروں سے ان کا برتاؤ ایک خاص قسم کا تھا جس کی وجہ سے ہر نوکر ان کو دل سے چاہتا تھا، عزت کرتا تھا اور انتہائی لگن سے ان کا کام کرتا تھا علاقہ چلے جانے کے بعد اور وسائل کم ہو جانے کے باوجود پرانے سپاہی، خدمت گار اور ضلع دار وغیرہ ہر وقت دل و جان سے خدمت کے لیے تیار رہتے تھے۔

اپنی کتاب 'میرا مذہب' کے دیباچے میں انھوں نے ایک شعر لکھا ہے:

جی میں جو آئے کیجیو پیارے ایک ہونا نہ در پئے آزار

ان کی زندگی کا فلسفہ یہی تھا۔ ان کے قول، ان کے فعل یا ان کی ذات سے کسی کو تکلیف پہنچ جائے اس سے بڑا گناہ ان کے نزدیک شاید دوسرا نہیں تھا۔ ان کی مقبولیت خصوصاً عام لوگوں میں غالباً ان کے اسی رویّے کی وجہ سے تھی۔

چودھری صاحب کو تمام فنون لطیفہ سے صرف یہی نہیں کہ دلچسپی تھی، بلکہ ان میں سے اکثر کے رموز و اسرار سے اچھی طرح واقفیت رکھتے تھے۔ مجھے ان کی بہت بڑی اور بڑی موقر لائبریری یاد ہے اور مردانے مکان کے تمام کمروں میں عظیم فنکاروں کی شاہکار پینٹنگیں بھی یاد ہیں۔ اس کے علاوہ موسیقی کی کچھ وہ محفلیں بھی یاد ہیں جو تہذیب، حفظ مراتب، خوبصورت گفتگو اور شرفاء کے رکھ رکھاؤ کی جیتی جاگتی تصویریں ہوتی تھیں۔ ان سب کو دیکھ دیکھ کر اگر ایک طرف ان کے شوق کے تنوع پر حیرت ہوتی تھی تو دوسری طرف ذوق کی نفاست کا قائل ہونا پڑتا تھا۔

شعر و ادب اور موسیقی کے ذوق کے ساتھ ہی اودھ کے لوک گیت اور لوک سنگیت کے دل دادہ تھے۔ باغبانی سے بھی شغف تھا۔ افتادِ طبع کے ان ذاتی پہلوؤں کی تسکین اور ذاتی زندگی میں نفاست تہذیب اور حسن کا اہتمام کرنے کے ساتھ ساتھ سماجی کاموں سے بھی سروکار رکھتے تھے۔ وہ تعلقدار اور زمین دار کے روایتی تصور سے بالکل

مختلف تھے۔ اپنی رعایا کو لوٹنے کھسوٹنے، ان پر ظلم کرنے والے تعلقدار کے برعکس وہ ایک انسان تھے اور تمام انسانی خصوصیات کے حامل تھے۔ انھیں جس طرح اپنی رعایا کے مفاد کا خیال رہتا تھا، اُسی طرح جہالت، مفلسی اور بے روزگاری کے مسائل اور سماج پر مرتب ہونے والے ان کے اثرات بھی انھیں تردد میں مبتلا کرتے تھے، اسی لیے سماج کی فلاح و بہبود کے کاموں سے ان کو دلچسپی ہوتی تھی۔ یہ کوئی معمولی بات نہیں ہے کہ آج سے اسّی نوّے برس قبل انھیں لوگوں کو کوئی حرفہ سکھانے اور نوجوان لڑکوں کو کوئی پیشہ ورانہ تربیت دینے کا خیال آیا۔ ووکیشنل ایجوکیشن کی طرف توجہ آج کی بات ہے مگر چودھری صاحب کو ایسی تعلیم و تربیت کی ضرورت اور اہمیت کا اندازہ بہت پہلے ہی ہوگیا تھا۔ چنانچہ 192ء میں انھوں نے رودولی میں ایک لیدر اسکول قائم کیا جس میں چمڑے کی اشیاء مثلاً جوتے، پیٹیاں، جیکٹ اور سوٹ کیس وغیرہ بنانا سکھایا جاتا تھا۔ یہ کہنا شاید غلط نہ ہوگا کہ ملک میں اپنی نوعیت کا یہ ادارہ غالباً پہلا ادارہ تھا۔ چودھری صاحب نے جوتے بنانے کے فن پر بھی ایک کتاب لکھنا شروع کی تھی، مگر وہ مکمل نہ ہوسکی۔ تمکین کاظمی کے نام ایک خط مورخہ 23 مئی 1928 میں لکھتے ہیں ''......فی الحال ایک کتاب جوتا بنانے پر لکھنے کا سامان کر رہا ہوں، دیکھیے کب پورا ہو......''

سماجی کاموں میں ان کی دلچسپیاں ہی تھیں جس کی وجہ سے وہ چھ سال تک یو پی لیجس لیٹیو اسمبلی کے ممبر بھی رہے۔

اپریل 1936 میں کل ہند انجمن ترقی پسند مصنفین کی پہلی کانفرنس لکھنؤ کے رفاہ عام کلب میں منعقد ہوئی تھی، یہی وہ جگہ تھی جہاں 1901 میں رجعت پرستوں کی اردو دشمنی کے خلاف نواب محسن الملک کی صدارت میں ایک عظیم الشان احتجاجی جلسہ ہوا تھا، یہاں جدوجہد آزادی کے مختلف مراحل پر بڑے بڑے ہنگامہ خیز جلسے ہوچکے تھے جن میں برصغیر کے ممتاز رہنماؤں نے شرکت کی تھی۔ اپریل 1936 میں اسی جگہ برصغیر کی ہزاروں سال کی تہذیبی تاریخ میں علم و ادب کی سب سے بڑی انقلابی تحریک کی داغ بیل پڑ رہی تھی۔

کانفرنس کے منتظمین میں سجاد ظہیر، ڈاکٹر رشید جہاں، صاحب زادہ محمود الظفر اور پروفیسر احمد علی وغیرہ پیش پیش تھے، ان کے مددگاروں میں ڈاکٹر عبدالعلیم اور ابھرتے ہوئے نوجوان شاعر فیض احمد فیض تھے۔ کانفرنس کی صدارت منشی پریم چند نے کی تھی اور اس کی استقبالیہ کمیٹی کے چیئرمین تھے چودھری محمد علی رودولوی، سجاد ظہیر اپنی کتاب 'روشنائی' میں لکھتے ہیں:

''ہمیں اس کی فکر ہوئی کہ اگر لکھنؤ میں باقاعدہ استقبالیہ کمیٹی نہیں بنائی جاسکتی تو کم از کم استقبالیہ کمیٹی کے نام پر سو پچاس ٹکٹ بیچ کر کچھ چندہ ہی فراہم ہوجائے اور اگر کوئی کمیٹی نہیں تو کم از کم استقبالیہ کمیٹی کا ایک صدر ہی بنا لیا جائے۔ ہم نے آپس میں مشورہ کیا اور اس عہدے کے لیے سب سے زیادہ موزوں چودھری محمد علی صاحب رودولوی کو سمجھا۔ یوں تو چودھری صاحب تعلقدار ہیں اور اودھ کے رؤسا میں سے ہیں اور ہم سے ایک نسل پہلے کے فرد ہیں لیکن ان کی ذات میں کچھ عجیب خصلتیں جمع ہوگئی ہیں جن کی وجہ سے ان کی شخصیت سرزمین اودھ کی دلچسپ شخصیتوں میں سے ایک ہے، ان کے اخلاق و آداب اودھ کے قدیم رئیسوں کی طرح ہیں، ان کی صورت، داڑھی صاف، گورا چٹا رنگ جدید انگریزی تعلیم یافتہ نوجوان کی سی ہے۔۔۔ نوجوان ترقی پسندوں کو وہ ہمیشہ شفقت اور ہمدردی کی نظر سے دیکھتے تھے، وہ اردو ادب کی بہترین روایات سے واقف اور ایک لطیف طرزِ تحریر کے مالک تھے اور جدید ادب سے گہری دلچسپی رکھتے تھے۔ جب ہم نے ان سے اپنی استقبالیہ کمیٹی کے لیے کہا تو انھیں بڑا تعجب ہوا کہ یہ درخواست ان سے کی گئی۔ رسما نہیں بلکہ خلوص کے ساتھ انھوں نے اس سے اپنی معذوری کا اظہار یہ کہہ کر کیا کہ وہ کبھی کسی ''تحریک'' میں شامل نہیں ہوئے اور ہر قسم کے سیاسی جھگڑوں اور ہنگاموں سے دور بھاگتے ہیں، لیکن ہمارے اور خصوصاً (ڈاکٹر) رشید جہاں کے اصرار پر وہ نہیں بھی نہ کرسکے اور آخر میں راضی ہوگئے، اس کے بعد سب سے پہلا کام انھوں نے یہ کیا کہ بہت معذرت

کے ساتھ چپکے سے سو روپے ہمیں عطیہ بھی دیا۔ یہ ہمارے لیے نعمت غیرمترقبہ تھی، چودھری صاحب کو اس کی شرمندگی تھی کہ یہ رقم بہت کم تھی، انھیں معلوم نہیں تھا کہ ہمیں کانفرنس کے لیے کسی شخص سے بھی دس روپے سے زیادہ چندہ نہیں ملا تھا اور ہم کل جملہ سو ڈیڑھ سو روپے لے کر کل ہند کانفرنس کرنے چلے تھے۔''

کانفرنس کا افتتاحی اجلاس ہوا۔ ڈائس پر کانفرنس کے صدر منشی پریم چند کے ساتھ مولانا حسرت موہانی اور استقبالیہ کمیٹی کے چیئرمین چودھری محمد علی ردولوی بیٹھے۔ سجاد ظہیر صدر ہی کے پاس نیچے تخت پر بیٹھے تاکہ اجلاس کی کارروائی میں صدر کی مدد کرسکیں۔ سب سے پہلے چودھری محمد علی نے خطبہ استقبالیہ پیش کیا۔ افسوس ہے کہ یہ خطبہ باوجود ہزار کوشش کہیں نہیں ملا۔ سجاد ظہیر نے اپنی کتاب 'روشنائی' میں لکھا ہے:

''چودھری صاحب نے یہ خطبہ لکھ لیا تھا افسوس ہے کہ اب وہ ہمارے پاس نہیں ہے نہیں تو اس سے معلوم ہوتا کہ کس طرح ہماری (خاص طور سے لکھنؤ کی) قدیم تہذیب اور ادب کے رسیا نے جدید ترقی پسند ادب کی تحریک کا خیر مقدم کیا۔''

خلیق ابراہیم خلیق صاحب نے اپنی سوانح ''منزلیں گرد کے مانند..........'' میں چودھری صاحب کے خطبے کے مندرجہ ذیل جملے واوین میں لکھے ہیں:

''ترقی پسند تحریک نے ہم جیسے لوگوں کے لیے جو بڑھاپے کی سرحد میں داخل ہوچکے ہیں کایا پلٹ کا کام کیا ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ زندگی کو پربہار بنانے کے لیے ہم بھی ابھی بہت کچھ کرسکتے ہیں۔''

افسوس کی بات ہے کہ یہ خطبہ ضبط تحریر میں آنے کے باوجود اب نہیں ملتا ہے۔ خلیق صاحب سے رابطہ قائم کرنے کے باوجود خطبے کا کوئی سراغ نہیں مل سکا۔

چودھری صاحب، جیسا کہ میں نے پہلے کہا ہے کہ فنون لطیفہ سے بے پناہ شغف

رکھتے تھے۔ ان کی یہ دلچسپی صرف زبانی دلچسپی نہیں تھی، فن کے رموز سے واقفیت حاصل کرنے کی انھوں نے شعوری کوشش کی تھی۔

''ایک دفعہ ایک صاحب مفلوک الحال کہیں سے آ گئے۔ چودھری صاحب کے سامنے لائے گئے۔ بتایا کہ سوز پڑھتا ہوں، چودھری صاحب نے کچھ دیر ان سے گفتگو کی پھر فرمائش کی کہ ''کوئی سوز پڑھیے'' سوز جنگلا پیلو میں شروع ہوتا ہے۔ قدیم سوز ایسا خوبصورت بندھا ہوا کہ میر علی، شیخ عطاء، مہدی بخش یاد آ گئے۔ صحت کی راگنی، بلمپت کی گائیکی، گلے کا نام نہیں، گانے سے ایسا علاحدہ جیسے رذیل سے شریف۔ ایسے خوبصورت کھٹکے، سُر کا سوت، استادی کی چھوٹی چھوٹی مرکیاں، خوش مذاقی کی ترکیبیں کہ واہ واہ، ہم آنسوؤں کے تر سے خوب روئے۔''

دُھرپت بھی اسی ٹھاٹ سے گاتے ہیں، پھولتے پھلتے نہیں مگر واقف کار کہتے ہیں صحت ضرور ہے۔ شعر سے مشق اور تلاش کا پتہ چلتا ہے— نہ مسطر نہ پرکار، قلم نہ روشنائی، خالی پنسل اور کاغذ سے وصلیاں بھی خوب بناتے ہیں۔''(32)

"چودھری صاحب کو کتابوں کا بڑا شوق تھا اور مطالعہ بے پناہ وسیع تھا۔ ان کی لائبریری بہت اچھی تھی۔ اس میں ہر موضوع اور ہر مذاق کی لاتعداد کتابیں تھیں۔ اب معلوم نہیں کہ ان کی وہ ساری کتابیں کس حال میں ہیں۔(33)

''ویسے سنا ہے کہ میاں جان کی کتابیں ضائع نہیں ہوئیں۔ اِس خبر سے ہم کا انتہائی خوشی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ میاں جان کے علم کی وسعت بے پناہ تھی۔ ہمہ رنگ، ہمہ جہت۔ متنوع مطالعے کا شوق بے پناہ تھا۔ ہزاروں کتابیں تھیں قیمتی اور نایاب۔ میاں جان مختلف ملکوں سے کتابیں منگوایا کرتے تھے۔ شاید ہی کوئی سبجیکٹ ایسا ہو جن کی کتاب ان کی لائبریری میں نہ ہوئیں۔ اردو، ہندی، عربی، فارسی اور انگریزی، شعر و ادب، اقتصادیات،

سماجیات، سیاسیات، نفسیات غرض ہر موضوع اور ہر زبان کی کتاب ان کے کتب خانے میں موجود تھی اور سب سے بڑی بات یہ تھی کہ کتابیں الماریوں کی محض زینت نہیں تھیں۔ تقریباً ہر کتاب ان کی پڑھی ہوئی اور اتنی سنجیدگی اور اتنی تفصیل سے پڑھی ہوئی تھی کہ کتابوں پر جگہ جگہ نشان لگے ہوئے اور موقع موقع پر اشارات لکھے ہوئے دیکھے جاسکتے تھے۔ قرآن کے بہت سے نسخے تھے، قرآن کے اردو اور انگریزی ترجموں کی خاصی تعداد تھی۔ ان کا قرآن کا مطالعہ بھی خاصا تھا۔ اس کے معنی و مطالب پر گہری نظر تھی۔ ہم لوگوں کو قرآن کی باقاعدہ تعلیم دلوائی گئی تھی۔ یہ میاں جان کے دل میں قرآن کی اہمیت ہی تھی جو ہم لوگوں کو عربی پڑھوائی گئی۔ ایک مولانا محمد حسین تھے جو ہمیں عربی پڑھانے آیا کرتے تھے۔

یوں تو ہم سب ہی، مگر میں خاص طور پر جب میاں جان کے پاس بیٹھتی، ان کی باتیں سنتی تو اکثر یہ سوچا کرتی یا اللہ عربی، فارسی، انگریزی، اردو، شاعری، ادب، موسیقی، گانے، گانے والوں کے سر، ٹھمری اور راگ سب ہی کے بارے میں تو انھیں معلومات تھی، اس زمانے کے مخصوص گانے جو میراثنیں گایا کرتی تھیں، ٹھمری، دادرا، سوہلے، بنرے ان سب کے بارے میں بھی میاں جان کا علم بہت تھا۔ یہ راگ اور موسیقی کی یہ چیزیں بڑی نفیس اور لطیف تھیں، انھیں سن کر جیسے ایک تسکین ہوتی تھی۔ موسیقی کی ان باریکیوں کو سمجھنے کے معاملے میں ہمارے رضا (ہما اخلاق حسین کے بیٹے) جو ہیں وہ بھی طاق ہیں۔ رضا نے آرٹ سنٹر کے نام سے ایک باقاعدہ ادارہ ہی قائم کر رکھا ہے، جہاں موسیقی، مصوری اور دوسرے فنون لطیفہ کا چرچا رہتا ہے۔ میاں جان کو اللہ میاں نے ایسا دماغ دیا تھا کہ کبھی کبھی تو ہمیں خیال ہوتا تھا کہ اللہ جانے ہم لوگ ان سے کتنا حاصل کرسکیں گے، ہمارا دماغ تو چھوٹا سا ہے، ہم تو شاید اتنا سب کچھ نہ سمجھ پائیں، یہ سوچ کر ہمیں جیسے اپنی سمجھ میں ایک کمی کا احساس ہوتا تھا۔ ایک تشنگی ہمیشہ رہی، مگر اب نہ وہ

دماغ رہے نہ چیزوں کو سمجھنے کا شوق رہا اور نہ ہی حسن اور خوبی سے لطف اٹھانے کا جذبہ، نہ ذوق نہ ہی صلاحیت۔

ہمارے رضا بہت سی باتوں میں میاں جان سے ملتے ہیں۔ ہم کو میاں جان سے اور میاں جان کو ہم سے ایک خاص تعلق رہے۔ ہم ان سے اور ان کی سب کوالٹیز سے بہت متاثر رہئن، خصوصی تعلق کی یہی وجہ رہے۔ اسی تعلق کی وجہ سے ہم ان کی ہر بات سمجھ لیت رہئن۔ مطلب یہ کہ ہم ان کے خیالات اور ان کے جذبات کو پہچان لیت رہئن۔ ہم کوشش کرت رہئن کہ ان کا ہر چیز ان کی پسند کے مطابق مل جائے اور ان کا ہر کام ان کے مزاج اور ان کی خواہش کے مطابق ہوئے جائے۔ ان کا کوئی تکلیف نہ ہوئے۔ کتابن کے سلسلے میں او ہم سے اکثر کہن کہ "پڑھنا تم، ہم تم کو دیں گے کتاب"۔ وہ اکثر نئی نئی کتابیں پڑھنے کے لیے دیا کرتے تھے۔"(34)

چودھری صاحب کی ادبی حیثیت کے تعین میں ان کی کہانیاں اور ادبی مضامین کی اہمیت تو ہے ہی، میں سمجھتا ہوں کہ ان کے خطوط بھی بڑی اہمیت کے حامل ہیں اور سخن فہموں کی توجہ کے مستحق۔ بیگم ہما اخلاق حسین نے چودھری صاحب کے خطوط کو جمع کر کے اور ان کو شائع کرا کے (گویا دبستان کھل گیا، کے نام سے خطوط کا یہ مجموعہ شائع ہو چکا ہے) ایک بہت اہم کام کیا ہے اور اردو ادب پر ایک احسان۔ یہ خطوط اگر ایک طرف غالب کے خطوط کی بے تکلفی، برجستگی اور شگفتگی، کی یاد دلاتے ہیں تو دوسری طرف ان کی اہمیت یہ بھی ہے کہ ان میں چودھری صاحب کے شائستہ و پرلطف اسلوب نگارش کے ساتھ ساتھ برصغیر کے مسلمانوں کی تہذیب کے خصوصی خدوخال اور اس تہذیب کے عروج و زوال کو بھی دیکھا جاسکتا ہے اور قصباتی زندگی کی دلچسپیوں، شرفاء کے مشاغل اور ان کے شب و روز کی کیفیتوں سے بھی روشناس ہوا جاسکتا ہے۔ "گویا دبستاں کھل گیا" اس لحاظ سے بڑی اہم کتاب ہے۔

"ان کے خطوط اور ان کی کہانیاں ساری تو ہم کو مل نہیں سکیں۔ شروع میں ہم نے میاں جان پر ظاہر نہیں کیا کہ ہم ان کے خطوط وغیرہ جمع کرنا چاہت

ہمن۔ خیال ای رہے کہ اگر کہیں کہہ دیا تو پھر کہیں خط لکھنا کم نہ کردیں اور پھر یہو خیال رہے کہ پھر خطوں میں آورد ہوئے جیسے اور ان کا فطری مزہ بھی باقی نہ رہیے۔ بعد کا جب ہم ان سے کہا کہ میاں جان ہم آپ کے خط چھپوائے رہی ہمن تو کہن بی بی اب بتایو تم، ہم نے تو کبھی کوئی خط رکھا نہیں اپنے پاس— پھر بھی خطوط کے مجموعے میں مرزا عسکری اور ابوجعفر وغیرہ کے نام کے خطوط میرے کہنے کے بعد کے ہیں۔"(34)

خطوط بہرحال بڑے ذاتی اور نجی قسم کے ہوتے ہیں۔ چنانچہ چودھری صاحب کے خطوط اگر ایک طرف اپنے عزیزوں، رشتے داروں بلکہ سارے قصبے کے حالات کی جھلکیاں دکھاتے ہیں تو دوسری طرف ان کے نجی مسائل اور ذاتی دکھ سکھ کی تصویرکشی بھی کرتے ہیں۔ اکثر خطوط میں اولادوں سے جدائی کی تکلیف کا ذکر ملتا ہے۔ اسے پڑھ کر ان کی بے قراری اور قلق کا شدید احساس ہوتا ہے اور اندازہ ہوتا ہے کہ زندگی کے آخری دنوں میں انھیں اگر ایک طرف زمینداری کے خاتمے کا افسوس تھا تو اس سے کہیں زیادہ اپنی اولادوں سے بچھڑ جانے کا غم انھیں کھائے جاتا تھا۔

''ہم لوگوں کی جدائی کا انھیں بہت احساس تھا اور شدید تکلیف تھی، آخر عمر میں تو ان کی یہ تکلیف بہت بڑھ گئی تھی۔ اس کی وجہ بھی تھی۔ شروع شروع میں تو ہم لوگ ہندستان کا چکر لگالیتے تھے مگر بعد کو جب خود ہم لوگوں کی مصروفیات بڑھیں، گھر بار ہوا، بچے ہوئے، وہ بڑے ہوئے، ان کی پرورش، ان کی تعلیم، ایسی صورت میں کام اتنے بڑھ جاتے ہیں کہ کہیں آنے جانے کی فرصت ہی نہیں ملتی۔ میاں جان یوں تو ہم سب ہی لوگوں کو بے پناہ یاد کرتے تھے مگر سب سے زیادہ تکلیف انھیں سلمان کے چلے جانے کی تھی۔ سلمان نے جب ایک بار رودولی چھوڑی تو پھر دوبارہ ادھر کا رخ نہیں کیا۔ کچھ خفا ہوگئے تھے کسی بات پر۔ میاں جان بھی کچھ کہہ دیہن ہوئی ہیں۔ بڑے حساس آدمی تھے سلمان۔ ان کو بھی کچھ برا لگ گوا ہوئیے۔ ایسی ہی کسی خفگی کے بعد وہ رودولی سے چلے گئے۔ اس کے بعد پھر رودولی نہیں

گئے۔ ہم بہت بہت کہا مگر وہ گھر اور وطن کا رخ کبھی نہیں کیہن۔ بہت بڑا علاقہ تھا جس کے وارث تھے سلمان، مگر اس سب کی انھوں نے پروا نہیں کی۔ شاید میاں جان کی کوئی بات ان کو کچھ ایسی ہی بری لگ گئی بہت رنج ہوا ان کو...... میاں جان کبھی غصے میں کچھ کہہ دیہن ہوئی ہیں۔ چلے جاؤ...... وغیرہ۔ ہم کو خود ٹھیک معلوم نہیں کہ حقیقتاً ہوا کا؟ نہ میاں جان بتائن نہ کبھی سلمان ہی کوئی تذکرہ کیہن۔ ہم میاں جان سے کبھی پوچھا بھی نہیں...... مگر سلمان کی خفگی سے میاں جان تڑپ تڑپ کر مرے۔ بہت تڑپے، یہاں پاکستان میں ہمری سلمان سے ملاقات ہوئے جاوا کرت رہے تو کبھی کبھی باتوں سے ایسا لگت رہے کہ شاید سلمان میاں جان سے ملنے چلے جائیں، کچھ امید اور کچھ میاں جان کو تسلی دلانے کی خاطر ہم اپنے خط میں لکھ دیا کرتے تھے کہ میاں جان، سلمان آپ سے ملنے آنے والے ہیں۔ تو میاں جان جواب میں غالب کا یہ شعر لکھ بھیجتے تھے ؎

کہتے تو ہو تم کہ ''بت غالیہ مو آئے''
یک مرتبہ گھبرا کے کہو کوئی کہ ''وہ آئے

اور لکھتے تھے کہ کاش ایسا ہوجائے۔ آخری زمانے میں ان کی بس ایک یہی خواہش تھی کہ وہ سلمان کو ایک نظر دیکھ لیں۔ سلمان اب چوراسی پچاسی برس کے ہوگئے ہیں۔ اسے کیا کہیے کہ اب انھیں پرانی باتیں بہت یاد آتی ہیں، رودولی کا گھر، وہاں کا ماحول، وہاں کے لوگ، غرض وہاں کی ایک ایک بات اب یاد کرتے ہیں۔ سلمان پیدا بھی رودولی میں ہوئے، ان کی پرورش بھی وہیں ہوئی، بچپن سارا وہیں گزرا، وہاں ان کو ہر طرف سے محبتیں ملیں چنانچہ اب اس عمر میں رودولی ان کے دماغ میں گھوما کرَت ہے۔ آج اگر ان کو کوئی رودولی والا وہاں (کینیڈا میں) مل جاتا ہے تو رودولی کی ایک ایک بات اس سے پوچھتے ہیں، گھر کے پیڑ پودوں کا حال، وہاں کے گلی کوچوں کا حال۔ (35)

میاں جان کے انتقال کی خبر آئی، تار آوا، ہم گلبرگ (لاہور) میں تھے۔ شروع شروع میں خبر ہم سے چھپائی گئی۔ بہرحال معلوم تو ہو ہی گیا۔ زندگی اور موت کا یہ سلسلہ تو ہمارے آپ کے بس کا نہیں ہے۔ اللہ کی مرضی میں ہم انسانوں کا کیا دخل۔ افسوس ضرور ہوا کہ میاں جان کی خواہش کے مطابق رودولی کے جتنے چکر ہم کو لگانے چاہئیں وہ ہم نہیں لگاپائے۔ حالانکہ ان بیچارے کی ہمیشہ یہی خواہش رہی کہ ہم لوگ رودولی آئیں، بار بار آئیں اور سارے وقت ان کے ساتھ رہیں۔

میاں جان کا انتقال 10رستمبر 1959 کو ہوا۔ میری سسرال میں بھی میاں، ساس، دیور سب ختم ہوگئے اور میکے میں بھی سب ہی مر گئے۔ مائے، باپ اور بہنیں۔ سلمان، اللہ میاں ان کی زندگی دراز کریں، ابھی حیات ہیں۔(33) ریٹائر ہوچکے ہیں۔ اب کوئی کام نہیں کرتے۔ کینیڈا میں اپنے بیٹے کے ساتھ رہتے ہیں۔ ہم نوے برس کی ہوئے گئی ہن۔ اب لکھنے پڑھنے کا کام بھی مشکل ہوئے گوا ہے۔(36)

چودھری صاحب کی چھوٹی بیٹی رقیہ بیگم عرف ہما (میری رشتے کی خالہ ہیں، یہ مضمون ان ہی کی بتائی ہوئی باتوں کی مدد سے لکھا گیا ہے) کو میں نے چمرونانا (چودھری محمد علی) کے بارے میں کچھ بتانے کے لیے خط لکھا تھا۔ اس کا جواب انھوں نے اسی دن دیا۔ مجھے خط بھی بھیجا اور ایک ٹیپ پر بہت سی باتیں ریکارڈ کرکے بھیجیں۔(37) نامناسب نہ ہوگا اگر اپنے نام ان کے خط کا کچھ حصہ یہاں نقل کردوں۔ ان کی عمر نواسی برس کی ہے۔تحریر پر عمر کا پورا اثر ہے۔ حروف بہت بڑے بڑے اورقلم میں کپکپاہٹ............

"............آج تمھارا خط کیا پڑھا مدت کی پیاس بجھ گئی!! اپنا ہم مذاق اور ہم مزاج آج زمانے کے بعد نصیب ہوا!!!! جیو بھیا خوش رہو، آباد رہو...... قریب 89 سال کی ہوگئی ہوں بذریعہ خط زندگی لوٹ آئی...... برسوں سے

بیماریوں کا حملہ ہے۔ فالج، دل کا سخت حملہ، شوگر بھرتوڑ اور اس کے ہمہ رنگ
شعبوں کی دست برد سے پسپائی نے لکھنا پڑھنا تو درکنار ہر کام ہر سوچ اور
ہر ارادہ ناقص کردیا ہے۔ تمھارا ہر حکم بجا لاؤں گی انشاء اللہ۔ مگر ٹوٹا پھوٹا
سب ہوگا..... جیو بھیا بہت خوش بہت کامیاب رہو ہمیشہ ہمیشہ۔ آمین ثم
آمین۔ فی امان اللہ۔ وہاں سب سے دعائیں اور پیار۔

دعا گو

تمھاری ہما خالہ (38)

اس وقت رودولی میں چودھری صاحب کی زوجہ ثانی اور ان کے بیٹے سعید مصطفیٰ محمد علی رہتے ہیں۔ سعید مصطفیٰ کی چار اولادیں ہیں۔ ایک لڑکی اور تین لڑکے۔ بیٹی کی شادی ہوچکی ہے۔ بڑا لڑکا قیصر محمد علی دہلی میں انگریزی کے موقر روزنامے ''ایشین ایج'' میں اسپورٹس ڈیسک کا سربراہ ہے۔ باقی دو بچے زیرِ تعلیم ہیں۔ پہلی بیوی سے ہونے والی تمام اولادیں پاکستان چلی گئیں۔ وہاں یہ سب ہی لوگ اعلیٰ عہدوں پر فائز رہے۔ پہلی تین بیٹیوں، چار دامادوں اور دونوں بیٹوں کا انتقال ہوچکا ہے۔ ان سب لوگوں کی اولادیں خدا کے فضل سے بہت لائق اور خوش حال ہیں۔ ہما اخلاق حسین چوتھی اور سب سے چھوٹی بیٹی ہیں لاہور میں قیام ہے۔

چودھری صاحب کی علمی اور ادبی تخلیقات کو محفوظ کرنے اور اس میدان میں ان کی خدمات کی نشاندہی کرنے میں اُن کی اِن بیٹی نے بڑی خدمات انجام دی ہیں۔ اگر ہما اخلاق حسین نے اس کام کی طرف توجہ نہ کی ہوتی تو شاید چودھری صاحب کی بہت سی تخلیقات اور ان کے تخلیقی اور ادبی کاموں کی بہت سی جہتیں ہمیشہ کے لیے گمنامی کے گرد و غبار میں محو ہوکر رہ جاتیں۔

چودھری صاحب کو اللہ نے سب کچھ دیا تھا۔ صحت، تندرستی، دولت، حسن اور ہونہار اولادیں۔ زندگی کے آخری دنوں میں انھیں سب سے زیادہ تکلیف ایک تو زمینداری کے خاتمے کی تھی اور دوسرا غم اولادوں کے بچھڑنے کا۔ خصوصاً اپنے بیٹے

سلمان محمد علی کی جدائی ان کے لیے سوہانِ روح تھی۔ آخری زمانے میں روز و شب کا کوئی لمحہ ایسا نہیں تھا جس میں وہ ان لوگوں کو یاد نہ کرتے ہوں۔ فالج نے چلنے پھرنے سے معذور کردیا تھا۔عموماً آرام کرسی پر بیٹھے رہتے تھے۔ جسمانی بے بسی کا شدید احساس تھا۔ زمینداری کے خاتمے کا ان پر ضرورت سے زیادہ ہی اثر ہوا، اولادوں کی یاد نے اور بھی توڑ دیا۔ چھوٹے بیٹے جابر علی دماغی طور پر کچھ کمزور تھے ان کا انتقال پہلے ہوگیا تھا۔ ان کی بیماری اور موت نے بھی چودھری صاحب کے غموں میں بڑا اضافہ کردیا۔

فالج کے بعد دنیا کی بے ثباتی اور (اپنے خیال میں) معصیت سے پُر زندگی کا شدید احساس پیدا ہوگیا تھا، اولادوں کی فرقت، گناہوں کا خوف، جسمانی معذوری اور کم ہوتے ہوئے مالی وسائل نے ان کے جسم کے ساتھ ساتھ ذہن و دل کو بھی شدید جھٹکے لگا دیے تھے۔ ہم لوگ ان کے پاس جایا کرتے تھے۔ ایک بار میں اور میرے چچازاد بھائی جنیدالحق ان کے پاس بیٹھے تھے۔ جنید صوفے پر پاؤں چڑھائے بیٹھے تھے۔ کافی دیر ادھر ادھر کی گفتگو کے بعد اچانک جنید سے مخاطب ہوئے اور کہا ''بھیا شاید تم نماز بہت پابندی سے پڑھتے ہو'' جنید خاصے خوش ہوکر بولے ''جی ہاں، نانا'' چمردنا نانے کہا ''یہی وجہ ہے کہ تمرے پاؤں اتنے صاف ہیں۔ مگر بھیا صوفے پر پاؤں چڑ ھائے کے نہ بیٹھا کرو۔'' ان کی خوش گفتاری گل افشانی کی جھلکیاں اب بھی نظر آجاتی تھیں مگر محض جھلکیاں۔ عاقبت کی فکر اور اس کا خیال انھیں ساری زندگی رہا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ انھوں نے ایک اچھی زندگی گزاری، بھرپور زندگی گزاری، کوئی عیش و آرام ایسا نہ ہوگا جس سے وہ محروم رہے ہوں مگر اس سب کے باوجود اپنے قادرِ مطلق کو یاد کرنا، روزِ جزا کا ڈر اور عتابِ الٰہی کا خوف ان کو ہمیشہ رہا۔ ہمیشہ میں اس لیے کہہ رہا ہوں کہ توبہ استغفار کی کیفیت دیکھنے والوں نے ان کے آخری زمانے میں مجبوریوں اور معذوریوں کی حالت میں دیکھی مگر سچ تو یہ ہے کہ خوفِ خدا انھیں ہمیشہ رہا اور اللہ کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے وہ اپنے بس بھر اپنے عمل پر نظر رکھے رہے۔ اپنی بیٹی ہما بیگم کے نام ان کا ایک خط ہے 19/نومبر 1949 کا۔ یعنی انتقال سے کافی پہلے کا۔ اسے دیکھیے۔ دنیا میں بہت سے لوگوں نے 'اعترافات' کے نام پر بہت کچھ لکھا ہے

صاف گوئی سے بھی اور غالباً ایمانداری سے بھی۔ چودھری محمد علی نے اس عنوان کے تحت کوئی کتاب نہیں لکھی صرف ایک خط لکھا۔ خط جو بڑی نجی چیز ہوتی ہے جسے دنیا نہیں پڑھتی۔ اسی لیے اس خط میں ان کے اعترافات کو میں بڑا ایماندارانہ سمجھتا ہوں اور ایمان کے استحکام کی ان کی خواہش اور مغفرت کی ان کی آرزو بڑی حقیقی مانتا ہوں۔ یہ خط ان کی فطرت کی بنیادی نیکی پر صاد ہے۔

''رودولی 19 رنومبر 1949

میری جان، دعا! تمھارا محبت نامہ آیا۔ خدا تم کو خوش رکھے اور تمھاری مرادیں پوری کرے۔ جو پند و نصائح تم کرتی ہو وہ میرے دل میں بھی آتے ہیں۔ مگر دل پر اللہ میاں نے قفل چڑھائے ہیں، وہ کسی طرح نہیں کھلتے۔ اگر قفل کھل جائے تو پھر کیا کہنا۔ اب نماز بھی جی لگا کر پڑھتا ہوں اور دعا بھی بہت جی سے مانگتا ہوں، اس کے رحم و کرم کا خیال جی میں جماتا ہوں مگر ۔

مرا دل ایست بہ کفر آشنا کہ چندیں بار
بہ کعبہ بردم و بازش برہمن آوردم

اور اوقات میں بھی غور و فکر کر کے ایمان کے عقیدے دل میں مضبوط کرتا ہوں۔ مگر صبح کے وقت جس کو حضوری کا وقت کہو اس وقت دل میں وہی خیالات یلغار بولتے رہتے ہیں جن سے ایمان متنفر ہے۔

عالم بخروش لا الہ الا اوست
غافل بہ گماں کہ دشمن است یا دوست
دریا بوجود خویش نظے رارد
خس پندا رو کہ ایں کشاکش با اوست

یہاں جی چاہتا ہے کہ خاص تعلق ہوتا جس کو Personal God کہتے ہیں مگر وہاں قاعدہ ہی اور دکھائی دیتا ہے۔ نماز کے بعد بارگاہ خدا میں عرض کرتا

ہوں کہ بار الٰہا ایمان دے۔ اللہ میاں فرماتے ہیں' ہمارا کام ہی ہے ایمان بخشنا، مگر تم خود اپنے دل میں ڈھونڈو، یہ طلب تمھاری صادق ہے؟ میں عرض کرتا ہوں میرے مالک میری تمنا کہ ایمان کی روشنی سے سینہ جگ مگ جگ مگ کرنے لگے، جی سے معلوم ہوتی ہے۔ وہاں سے ارشاد ہوتا کہ ہاں ہاں یہ تو ٹھیک ہے مگر غور کرو تم نے جوانی میں بہت سی عورتوں کو جانا بھلا ایمان سے کہو اُس بے تابی، تڑپ شوق کا کچھ بھی شائبہ ہماری تلاش میں پاتے ہو؟ میں عرض کرتا ہوں جی نہیں اس طرح کی تڑپ بے چینی تو نہیں پاتا، ایک دوسری طرح کی خواہش ضرور ہے وہ فرماتے ہیں ہم تمھارے دل کا حال تم سے بہتر سمجھتے ہیں۔ یہ خواہش جو تم محسوس کرتے ہو تو یہ ہماری محبت کی وجہ سے نہیں ہے بلکہ بوڑھے ہوگئے ہو، عورت منھ نہیں لگاتی، طاقت جواب دے رہی ہے، موت کھڑی گھور رہی ہے اس لیے اس طرح کے خیالات دل میں پاتے ہو۔ میں عرض کرتا ہوں بار الٰہا، اب تیرے سمجھانے سے سمجھ میں آتا ہے۔ واقعی تیری خواہش ان ہی مجبوریوں سے ہوگی مگر ہے تو، جوانی میں نہ سہی بڑھاپے میں سہی مگر اب تو ہے۔ اس کا خیال فرما کر رحم کر اور دے دے دولت ایمان۔ جواب ملتا ہے کہ ہاں ہاں چلے چلو۔

چہرو وظیفہ تو دعا کردن است و بس
در فکرِ آں مباش کہ نشنید یا شنید

اس میں بھی تمھارا فائدہ کچھ نہ کچھ تو ہے ہی۔ میں عرض کرتا ہوں ارے میرے رب میں تو اس سے زیادہ کی آس لگائے ہوں۔ تو رحیم ہے کریم ہے غفار ہے، تیرا کیا نقصان ہے اگر اس سے زیادہ دے دے میرے قلب کو تسکین ہوجائے۔ حکم ہوتا ہے زیادہ بک بک مت کرو۔ کہہ تو دیا کہ چلے چلو اور کچھ نہیں تو جھوٹ سچ تمھاری عبودیت تو مضبوط ہوتی جائے گی۔ مگر مانتے ہی نہیں قفل کھولو قفل کھولو کی رٹ لگا دی ہے۔ ابے ہم تیرے رگ پٹھے سے واقف ہیں۔ بہرو پیا، جھپ جھالیا دنیا بھر کا، آیا ہے وہاں سے ہوا باندھنے،

میں عرض کرتا ہوں اب حضور مالک ہیں جو جی چاہیں کہیں۔ چھوٹا منہ بڑی بات۔ حضرت ابراہیم نے یہی کہا تھا کہ قائل تو تو نے کردیا مگر دل کو تسکین تو نہیں ہوئی۔ وہ بڑے آدمی تھے، تیرے مقرب تھے ان کو کچھ نہیں کہا اور ہمارے اوپر خفا ہوتے ہیں۔ پھر آپ سے نہ کہیں تو کس سے کہیں، آخر کہاں جائیں کس سے عرض حال کریں۔ میں ساڑھے تین برس کا تھا آپ نے باپ کا سایہ میرے سر سے اٹھا لیا، کہیے ہاں، اس کے بعد بیوقوف چاہنے والی ماں نے لاڈ پیار کی انتہا کردی۔ اگر میں نے کسی کو مارنا چاہا تو اس نے ازار بند سے چونی کھول کر اس کو دی اور کہنے لگی کہ میرا بچہ یتیم ہے۔ یہ چونی لو اور اس کو مار لینے دو۔ اس کا جی چھوٹا نہ کرو۔ گھر میں بجودادا رہتے تھے۔ وہ والد کے قصے سنایا کرتے تھے کہ تمھارے باپ نے یہ کیا وہ کیا۔ میرے دل میں بھی شوق پیدا ہوتا تھا کہ ہم بھی بڑے ہوں گے تو یہی کریں گے۔ اس کے بعد ہم کالون اسکول بھیج دیے گئے۔ وہاں سب طرح کے خیالات دل میں ڈالے گئے۔ جب جوانی قریب آئی تو تو ہی نے خیالات میں آزادی دی۔ خود رائے قائم کرنے کی قوت بخشی۔ ہربرٹ، اسپنسر، مِل کے خیالات دل میں جمنے لگے۔ کفر و الحاد کی بنا پڑ گئی۔ جس طرح تو نے خسرہ مقرر کیا ہے کہ سب کو نکلے اسی طرح شروع جوانی میں تیرے ہی حکم سے خیالات میں آزادی آتی ہے جیسے بعضوں کو اسی خسرہ سے سینہ کی بیماری ہوجاتی ہے جو جان لے کر جاتی ہے۔ اسی طرح شروع جوانی کے خیالات بھی کہ بعضوں پر ان کا اثر نہیں رہتا اور بعض بیچارے ایسے بدقسمت ہوتے ہیں جن کو خیالات کی دق ہوجاتی ہے۔ جیسے دق کی دوا کرنے میں دوڑ دھوپ کرتے ہیں اسی طرح ان خیالات کو بھی دور کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ بہت سے خوش قسمت بچ جاتے ہیں بہت سے ہمارے ایسے جوانا مرگ پاتے ہیں۔ اب اس میں ہمارا کیا بس تھا اور کون بس ہے۔ حضور جاں بخشی ہو تو ایک بات عرض کروں۔ ہاتف غیب، کہو کہو، کہے جاؤ ہم سنتے ہیں...... میں...... نیاؤ نہ کہن، کہن ٹھکرائی، ہاتف غیب کی آواز میں

ایک ذری سی ہنسی اور خوش دلی کا انداز پایا جاتا ہے۔ بڑے منطقی ہو، خوب زبان چلتی ہے، گھبراؤ نہیں چلے چلو، ہم وعدہ نہیں کرتے مگر اتنا کہے دیتے ہیں کہ بے آس مت ہو، جاؤ۔ اسی طرح سجدے میں پڑا رہتا ہوں، حکم ہوتا ہے ہم سب کچھ جانتے ہیں مگر تم اپنے دل کی بھڑاس نکال لو، کہو کہو، کوئی حرج نہیں، ہم اپنے بندوں کے عرض حال کو برا نہیں مانتے، کہہ چلو۔ میں۔ بار الہا تیرے مذہب کی تعلیم دینے والے کہا کرتے تھے کہ بس خدا میں یقین رکھو۔ ہم یقین کے معنی وانی تو سمجھتے نہیں تھے مگر سن لیتے تھے، اس دن ایک امریکن کی کتاب میں نکلا To believe in God is to desire His existence and what is more to act as if life existed. لے بھلا حضور ہی فرمائیں۔ ایک تو منطق نے عقل کو باؤلا کر رکھا ہے دوسرے مولوی بے ایمان دنیا بھر کے خرافات بچپن سے دماغ میں ٹھونس رہے ہیں۔ اگر آپ کے بندے گڑبڑا جائیں تو کیا تعجب ہے۔ ہاتف، سنو محمد علی تم یوں ہی چلے چلو، ہم اپنا قاعدہ تو تمھارے لیے بدلیں گے نہیں مگر اتنا جان رکھو کہ ہم قہار جبار بھی ہیں اور رحیم اور کریم بھی۔ ہم جانتے ہیں کہ تم کو ابھی اپنی بک بک سے سیری نہیں ہوئی ہے مگر تمھارا بکنا بالکل تحصیل حاصل ہے کیونکہ ہم سب کچھ سمجھتے ہیں، ہم تم پر مشیت کے راز اپنے کھولنا نہیں چاہتے مگر اتنا بتائے دیتے ہیں کہ الایمان بین الخوف الرجا۔ بس اٹھو سجدے سے، اپنا کام دیکھو، ہما پیاری! دنیاوی مصائب جو میں نے بیان کیے ہیں ان میں ممکن ہے کہ کچھ مبالغہ ہو مگر ہیں اور بہت شدید ہیں...... لیکن میں ہر بات کے لیے تیار ہوں۔ اپنی موت سب سے سخت ہے جب میں اس پر راضی ہوگیا تو پھر کچھ اور کہنے کی حاجت نہیں..... ہما بیگم، اب دنیا کی ہر ہوس کم ہوگئی ہے مگر کتابوں کا شوق ویسا ہی ہے......"(39)

پاس بیٹھنے والوں کو وہ اب بھی اپنی گفتگو سے ہنساتے تھے مگر اب انھیں ہنساتے ہنساتے دفعتاً خود رونے لگتے، پاس رکھی ہوئی دعاؤں کی کتاب اٹھاتے، زور زور سے

کوئی دعا پڑھنا شروع کردیتے۔ ایک طرف توبہ استغفار کا سلسلہ شروع ہوجاتا اور دوسری طرف آنکھوں سے آنسوؤں کی جھڑی لگ جاتی۔ عیش و آرام تو خاتمہ زمینداری کے اعلان کے ساتھ انھوں نے خود ہی ترک دیے تھے۔ سیدھی سادی زندگی تھی اور نماز، تلاوتِ قرآن اور یہی توبہ و استغفار مشغلہ۔

خدا رحمت کند ایں عاشقان پاک طینت را

چودھری صاحب دنیا اور دین دونوں کے آدمی تھے۔ تعلقدار ہونے کے باوجود کٹر قوم پرست تھے۔ میں نے باوجود اس لیے کہا کہ تعلقداری اور قوم پرستی اُن دنوں بڑی حد تک باہم متضاد چیزیں تھیں۔ یہ صحیح ہے کہ تعلقداری اور ریاست کے مطالبات ایسے تھے کہ انگریز کے سامنے اپنی وفاداری کا بھرم قائم رکھنا اس طبقے کے تمام افراد کے لیے ناگزیر تھا۔ چودھری صاحب کو زندگی کے اس نشیب و فراز کا احساس تھا اور وہ اس کا خیال بھی رکھتے تھے لیکن اگر کبھی ان کی تربیت اور ان کی سوچ پر زد پڑ رہی ہو تو وہ زمانے کے مطالبات اور حالات کے تقاضوں سے چپ چاپ نظر بچا لے جاتے تھے۔

''ایک انگریز ڈپٹی کمشنر میرے دوست تھے، ایک دن انھوں نے مجھ سے کہا ''میں تمھارا بہی خواہ ہوں اور تمھارے لیے میں نے ایک کام تجویز کیا ہے جس میں تم کو بڑے فائدے ہوں گے اور وہ کام یہ ہے کہ جو باتیں تم دوسروں کو کرتے سنو اس کی رپورٹ ہم کو دیا کرو۔'' میں نے کہا ''دوستی کی آڑ لے کر اور باتوں باتوں میں آپ مجھ سے سب کچھ پوچھ سکتے ہیں کیونکہ مجھ کو راز رکھنے کی حکمت ہی نہیں معلوم، لیکن اگر ارادتاً آپ کو اس قسم کی رپورٹیں دوں گا تو میرا دل مجھ کو اس قدر برا کہے گا کہ میں شاید سو نہ سکوں۔ وہ مجھ سے بہت مایوس ہوئے اور دوسرے ہی دن ایک صاحب کو اسی خدمت کے لیے مامور کردیا۔ ان کو ہزار روپے معافی ملی، خان بہادر ہوئے اور دوسرے اعزاز بھی ہاتھ آئے۔''(40)

اس واقعے سے چودھری صاحب کے کردار اور ان کی افتادِ طبع کا اندازہ لگایا

جاسکتا ہے۔ قوموں کی زندگی میں متوسط طبقے کا کردار بڑا اہم ہوتا ہے۔ ہندستانی مسلمانوں کی سیاسی اور تہذیبی زندگی میں جب تجدید کی رو چلی تو ہراول اسی جاگیر طبقے کے لوگ تھے۔ دینی تعلیم اور علوم دنیوی پر توجہ ہوئی، ادارے (دارالمصنفین اعظم گڑھ، ندوۃ العلماء لکھنؤ، دارالعلوم دیوبند، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ) قائم ہوئے، زمانے کی تبدیلیاں تیز رفتار تھیں اور ''ترقیاں'' ہورہی تھیں نئی نئی سڑکیں نکل رہی تھیں اور گلیاں اور کوچے سنسان ہوتے جارہے تھے، ایک نیا اقتصادی بحران سر اٹھا رہا تھا اور طبقاتی کشمکش میں شدت پیدا ہوچلی تھی۔ نتیجتاً بھانت بھانت کی سیاسی جماعتیں جنم لینے لگیں، لوگ سیاسی جماعتوں سے وابستہ ہونے لگے، حکومت کی حلیف پارٹیوں نے جاگیرداروں اور امراء و رؤسا کو ساتھ لیا، دوسری پارٹیوں نے نکبت و افلاس کے مارے کسانوں اور کامگاروں اور نئے پرولتاری طبقے کو ساتھ لانے کی کوشش کی۔ تجدید اور تبدیلیوں کے اس دَور میں اور تغیر مائل انیسویں صدی کے اختتام اور بیسویں صدی کے آغاز پر اردو زبان میں بہت سے لکھنے والے سامنے آئے۔ پریم چند نے اپنے دور کی عکاسی کی، ان کی توجہ کا علاقہ بہت وسیع و عریض ہے اور انداز گہری اور ''اعلیٰ سنجیدگی'' کی پرتوں میں لپٹا ہوا۔ اسی زمانے کے دوسرے بہت سے ناموں کے ساتھ سرشیخ عبدالقادر اور چودھری محمد علی کے نام بھی لیے جاسکتے ہیں، ان دونوں نے صرف یہی نہیں کہ اعلیٰ درجے کی نثر لکھی بلکہ انھوں نے اپنی تحریروں کو عوام کے دلوں کی دھڑکن اور امنگ سے ہم آہنگ کرنے کی سعی کی۔

چودھری صاحب کے افسانوں اور خاکوں میں حقیقت اور خیال آفرینی کا بڑا اچھا امتزاج ملتا ہے اور چونکہ وہ اپنے مشاہدے اور اپنے تجربے میں صداقت کا دامن کبھی نہیں چھوڑتے اور تخیل کو کبھی بے لگام نہیں ہونے دیتے اس لیے یہ امتزاج ادب میں ایک نہایت معیاری شکل اختیار کرلیتا ہے۔ چودھری محمد علی کا موضوع عموماً خود انسان اور اس کا وہ عالم خیال ہے جس میں وہ اپنی زندگی گزارتا ہے، اس کا مطلب یہ نہیں کہ ان کی تخلیقات محض ان کے تخیل کی دین ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ چودھری صاحب اگرچہ اپنی فکر کو افسانے کا ملبوس عطا کرتے ہیں مگر اس سچائی سے اختلاف ممکن نہیں کہ وہ

بنیادی طور پر مفکر نہیں ہیں وہ تو سیدھے سادے وقائع نویس اور افسانہ نگار ہیں، وہ کہانی اس لیے سناتے ہیں کہ اس کے وسیلے سے وہ اپنی کسی فکری رَو یا اپنے کسی تخلیقی تجربے سے قاری کو روشناس کرانا چاہتے ہیں۔

''سنیے صاحب مجھ کو بکنے کی عادت ہے اس کی شروع کیوں کر ہوئی یہ بھی سن لیجیے۔

بچپن میں کالون کالج میں پڑھتا تھا، ایک دن شام کے وقت فٹ بال ہو رہا تھا۔ مزاج کی ناسازی کی وجہ سے میں شریک نہیں تھا۔ فیلڈ کے باہر پرنسپل صاحب کے ساتھ کھڑا تھا دو ایک لڑکے بھی اسی طرح کھڑے تھے، اتنے میں ایک راجہ صاحب ان سے ملنے آئے۔ پرنسپل صاحب نے مختلف چیزوں پر ان سے گفتگو شروع کی مگر راجہ صاحب نے ایک 'ہاں' یا 'ناں' میں ہر موضوع کا گلا گھونٹ دیا۔ پرنسپل صاحب نے مزاج پرسی کے بعد کہا 'آج موسم اچھا ہے' راجہ صاحب نے ایک زیرلبی 'ہوں' میں بات ختم کردی۔ کچھ وقفے کے بعد پرنسپل صاحب نے کہا 'اب کی فصل میں آپ کے یہاں انبہ کیسا ہوا؟'' راجہ صاحب ''معمولی'' لیجیے یہ بھی دفن ہوگیا۔ پرنسپل صاحب نے کچھ دیر بعد کہا ''آپ کے مکان سے ریل کتنی دور ہے؟'' راجہ صاحب ''تھوڑی دور'' اے لو یہ بھی گیا۔ پرنسپل صاحب ''فٹ بال کا کھیل بڑا مردانہ کھیل ہے'' راجہ صاحب ''جی ہاں'' ۔ انا للہ و انا الیہ راجعون۔''(40)

یعنی چودھری صاحب کہانی اس لیے سناتے ہیں کہ اسے سنائے بغیر وہ نہیں رہ سکتے۔ ایسا لگتا ہے کہ وہ دل کا غبار نکالنا اور اپنے اعصاب کا بوجھ کم کرنا چاہتے ہیں۔ معاشرتی اصلاح ان کا مقصد نہیں، سماج کے نت نئے تقاضے بھی انھیں اکساتے نہیں۔ طوائف کے تزکیہ نفس کی خواہش اور اس کی اخلاقی تربیت یا مزدور طبقے کے دکھوں کا مداوا بھی ان کا مطمحِ نظر نہیں وہ تو زندگی کے ایک ذہین اور باشعور مشاہد ہیں، ان کی آنکھیں روشن اور ان کا دماغ بیدار ہے، وہ اپنے آس پاس کی زندگی کو غور سے دیکھتے

ہیں، ہمہ رنگ اور ہزار پہلو زندگی کی معمولی اور غیر معمولی، لطیف اور کثیف اور مضحک اور ثقہ ہر صورت حال پر ان کی نظر پڑتی ہے اور وہ اپنے تجربات اور مشاہدات کو بلا تکلف بڑے سلیقے سے، پرلطف اور بلیغ ڈھنگ سے ہمارے سامنے رکھ دیتے ہیں اور بس۔ انھیں یہ بات کبھی پریشان نہیں کرتی کہ آپ ان کی تحریر سے کیا اثر لیں گے۔ ان کے انداز نگارش کے بارے میں کیا رائے قائم کریں گے۔ ان کی یہ خود رَوی صرف موضوع کے انتخاب تک محدود نہیں، زبان و بیان کے سلسلے میں بھی ان کا رویہ کم و بیش یہی ہے۔

ان کا یہ رویہ ان کے خالص فنی زاویہ نگاہ کا غماز ہے۔ اگر یہ کہا جائے تو شاید غلط نہ ہوگا کہ وہ تصنع کا سہارا کبھی نہیں لیتے۔ مصلحت کا دامن پکڑ کر آمد پر جبری آورد کو ترجیح دے کر اصلاح و تبلیغ کے نام نہاد اعلیٰ مقاصد کو اپنے سینے سے لگائے نہیں رکھتے۔ وہ تو جو دیکھتے ہیں وہی دکھا دیتے ہیں اور جو محسوس کرتے ہیں بس اسے اپنے پڑھنے والے کو پیش کر دیتے ہیں۔ وہ اپنے مشاہدات، تجربات اور احساسات کو اظہار کا پیکر اس لیے دیتے ہیں کہ وہ مجبور ہیں، انھیں ''بکنے کی عادت'' ہے۔ فطرتاً سخی ہیں اور مسرتوں کو اُس دولت کی طرح لٹاتے ہیں جو لٹانے سے بڑھتی ہے، اپنے دکھوں کو بھی وہ اپنے اوپر مسلط نہیں ہونے دیتے، ان میں بھی دوسروں کو شریک کرتے ہیں کہ دکھ بھی بانٹنے سے کم ہوتے ہیں۔

چودھری محمد علی رودولی میں پیدا ہوئے۔ رودولی جس کے ایک طرف نواب شجاع الدولہ کا فیض آباد تھا اور دوسری طرف کچھ فاصلے پر آصف الدولہ اور واجد علی شاہ کا لکھنؤ تھا۔ یہاں کے شاہانہ تزک و احتشام کی چھوٹ اور یہاں کی تہذیب و نفاست کا سایہ تمام قصبات پر دکھائی دیتا تھا۔ رودولی اس لحاظ سے شاید دوسرے قصبات کے مقابلے میں کچھ زیادہ خوش قسمت (یا بدقسمت) تھا کہ اسے دو دو راجدھانیوں کا قرب حاصل ہوا۔ اسی قصبے کی خوشگوار فضا اور سست خرام زندگی چودھری صاحب کی دنیا تھی۔ چنانچہ ان کی ادبی تخلیقات اور ان کے فنی کارناموں میں یہی سبک سبک سی فضا جاری و ساری ہے۔ ان کے قلم کا یہ اعجاز ہے کہ ان کی کہانی کا ماحول چشم زدن میں پڑھنے

والے کے لیے مانوس ماحول ہو جاتا ہے اور ان کے کرداروں کے دلوں کی دھڑکنیں خود قاری کے دل کی دھڑکنیں بن جاتی ہیں۔ ان کے دکھ درد ان کے رنج و غم ان کے ذاتی دکھ درد ذاتی رنج و غم ٹھہرتے ہیں۔ کرداروں کی خوشیاں اور ان کے سکھ پڑھنے والے کو اپنی خوشیاں اور اپنے سکھ معلوم ہوتے ہیں۔

میں چودھری صاحب کا مقابلہ آج کے افسانہ نگاروں سے نہیں کرنا چاہتا کہ ادبی تصورات اور ادب فہمی کے پیمانے بدل چکے ہیں، زمانہ بہت ترقی کر چکا ہے اور ترقی کی یہ منزلیں کچھ اتنی سرعت سے طے ہو رہی ہیں کہ ہم جیسے لوگوں کا اپنی جگہ کھڑے کھڑے ہی سانس پھول جاتا ہے۔ یہ احساس بہرحال سر اٹھاتا ہے کہ آج آرٹ بھی سائنس ہوتا جا رہا ہے۔ حقیقت پسند افسانہ طاقِ نسیاں کی زینت تو بن ہی رہا ہے ساتھ ساتھ مردود بھی ہوتا جا رہا ہے۔ ''نیا لکھنے والا صوم و صلوٰۃ کے فضائل اس طرح بیان کرتا ہے کہ ہر پابندِ صوم و صلوٰۃ خود کو ولی کامل سمجھنے لگتا ہے۔'' میرا خیال ہے کہ اس رویّے سے نقصان بہت ہوا ہے، اسی لیے آج کے افسانے میں وہ کھلنڈرا پن وہ خوش طبعی اور وہ تیزی طراری نہیں رہ گئی ہے جو لکھنے والے کو ناآزمودہ کار کی جرأت جیسی صفت سے متصف کرتی ہے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ آج 'گناہ کا خوف' 'عشق بالواسطہ' 'نیلم کا نگ' اور 'امیری کی بو' جیسی کہانیاں اور 'راجہ پرتھی پال سنگھ' 'مرزا منش میر باقر' اور 'میر یوسف' جیسے خاکے لکھے ہی نہیں جا سکتے کیونکہ آج افسانہ وجود اور مابعدالطبیعاتی مسائل سے سروکار رکھتا ہے۔ اسے ساختیات اور پس ساختیات کے پیمانوں اور کسوٹی پر پورا اترنا ہوتا ہے۔ سماج، نفسیات اور اخلاق کی عکاسی اور ترجمانی تو بے چارے اگلے وقتوں کے حقیقت پسند افسانہ نگار کرتے تھے۔ دراصل مصیبت یہ ہے کہ آج لکھنے والے 'سنجیدہ' بہت ہو گئے ہیں، انسانیت کی روح یعنی حِس ظرافت کا فقدان ہوتا جا رہا ہے۔ بقول وارث علوی:

> ''افسانہ قدروں کا بیان کرتا ہے لیکن وقت اور مکان کی قید میں رہ کر افسانے کا پورا آرٹ پتھریلی زمین پر قدم جمائے گہری کھائیوں اور تاریک غاروں میں جھانکنے کا آرٹ ہے، افسانہ نگار کے لیے ان بلندیوں پر پرواز

> کرنا خطرے سے خالی نہیں جہاں مظاہرِ حیات آنکھوں سے اوجھل ہوجائیں اور گاؤں بستی میں اور آدمی آبادی میں گم ہوجائے۔ اردو کا نیا افسانہ بستیوں کا ذکر کرتا ہے، اس میں گاؤں کی فضا نہیں، لوگ آبادی کی شکل میں رہتے ہیں سماج کا نام و نشان نہیں، کردار بے چہرہ اور بے نام ہیں اور پوری فضا داستان، اسطوری کہانی اور پیغمبرانہ مکاشفے کی لرزشوں سے کانپتی ہے، نفسیات کی جگہ روحانیت، پلاٹ کی جگہ کہانی اور تخیل کی جگہ فنتاسی نے لے لی ہے۔"(42)

یہ کاریگری ہے فن کاری نہیں، اس طرح کی مہارت رکھنے والے لوگ بڑے کاریگر تو ہوسکتے ہیں فن کار نہیں ہوسکتے۔ چودھری محمد علی کو اگر کسی زمرے میں رکھا جاسکتا ہے تو وہ ایک فطری اور سیدھے سادے فنکار کا زمرہ ہوسکتا ہے۔ ان کی خوبی یہی ہے کہ وہ اپنے نجی مشاہدات اور اپنے ذاتی علم کی سرحدوں سے باہر قدم نہیں نکالتے ہیں وہ اپنے نجی مشاہدات اور اپنے ذاتی علم یعنی زندگی کی محض عکاسی نہیں کرتے اس سے روشنی اخذ کرتے ہیں اور پھر یہی روشنی ان کی تحریر میں پھیل جاتی ہے۔ وہ فوٹوگرافر نہیں، آرٹسٹ ہیں وہ زندگی کی تصویریں بناتے ہیں اور ان میں رنگ اپنی طرفہ افتاد، اپنے باغ و بہار انداز اور اپنی طبع کے فطری چنچل پن سے بھرتے ہیں۔ وہ محسوسات کے اگر تصویر گر ہیں تو ساتھ ہی نفسیات کے ماہر بھی، ان کی کہانیوں کے موضوعات اور ان کے کردار عموماً کسی نہ کسی نفسیاتی پہلو کے حامل ہوتے ہیں اسی لیے ان کی بنائی ہوئی تصویریں بے جان لکیریں نہیں بلکہ بولتی ہوئی شبیہیں ہوتی ہیں، یہ شبیہیں آپ کو صرف متاثر ہی نہیں کرتیں آپ کے دل و دماغ پر چھا جاتی ہیں۔ الفاظ ومعنی پر قدرت کاملہ اور اظہار خیال کے وسائل پر گرفت جس حد تک چودھری صاحب کے یہاں نظر آتی ہے وہ آپ اپنی مثال ہے۔ ان کی کہانیاں، جن کے موضوع عام طور پر جنس اورانسانی نفسیات سے متعلق ہیں، ان کی دیدہ وری اور ژرف نگاہی کی داد دیتی ہیں۔ وہ ایک فنکار اور مصنف کی طرح تو سامنے آتے ہی ہیں ان کی کہانیاں ان کے تبحر علمی، جنسیات میں ان کے ادراک اور سماج کے اساسی عوامل پر ان کی گہری نظر کی

بھی گواہی دیتی ہیں۔ حقیقت تو یہ ہے کہ جنس ان کے لیے شجر ممنوعہ نہیں ہے، اس کا ذکر وہ تلذذ کے لیے بھی نہیں کرتے، جنس پر سات پردے ڈالنا یا جنسی مسائل پر کانا پھوسی کرنا بھی ان کا شعار نہیں ہے۔ اس موضوع پر وہ بہ بانگ دہل بولتے ہیں کیونکہ جنس کو وہ لذت کوشی کا سامان نہیں صحت مند انسانی زندگی کا ایک فطری اور اہم جزو سمجھتے ہیں۔ انھوں نے خود ایک بھرپور زندگی گزاری، اسے بغور دیکھا، پرکھا اور برتا، وہ نہ تو لذت کوش ہیں اور نہ ہی لذت فروش۔ اردو زبان میں ایسا بے عیب جنسی کہانیاں لکھنے والا کوئی دوسرا نظر نہیں آتا۔ 'کشکول' میں 'مس ہیلن' 'دھوکا' 'نیلم کا نگ' وغیرہ میں یہی ساری خصوصیات ہمیں نظر آتی ہیں۔

چودھری محمد علی کو بصارت کے ساتھ ساتھ بصیرت بھی ودیعت ہوئی ہے۔ ان کے مشاہدے اور ان کے تجربات کی گہرائی کے پیچھے اسی بصیرت کی کارفرمائی ہے۔ ان کی تمام کہانیاں عموماً کسی حقیقی واقعے پر مبنی ہیں۔ واقعے کی یہی صداقت اور ان کی فطری پیشکش کا ان کا مخصوص انداز ان کی تحریر کو اعلیٰ ادب کا نمونہ بنا دیتا ہے۔ وہ کہانی لکھتے نہیں سناتے ہیں، ان کی تحریر، اس کا موضوع چاہے جنس ہو یا مذہب خطوط ہوں یا تقریر حقیقتاً پڑھنے اور سننے والے سے گفتگو ہوتی ہے۔ اپنی حِکائی روایت سے استفادے کا یہ میلان ہمارے افسانہ نگاروں میں عام نہیں ہے۔ تحریر کا دوستانہ ماحول، حقیقی کردار، سچے واقعات اور اس پر چودھری صاحب کا باغ و بہار انداز ہی ہے جو ان کی تخلیقات کو دلچسپ بنانے کے ساتھ ساتھ انھیں اعلیٰ معیار بھی عطا کرتا ہے۔

> ''چودھری محمد علی کا سا پیرایہ بیان ہمارے عہد کے کسی افسانہ نگار کو نصیب نہیں ہوا۔ حقیقت پروری اس پر نثار اور دلنوازی اس پر تصدق ہے اور ان کی کامیابی کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ جو کچھ وہ کہنا چاہتے ہیں اس کے لیے انھیں کوئی اہتمام یا تکلف نہیں کرنا پڑتا، فطرت ایک ورق روشن کی طرح ان کے پیش نظر رہتی ہے اور اس کے جو اسرار ان کی نگاہ انتخاب میں سما جاتے ہیں وہ انھیں بے محابا اپنا بنا لیتے ہیں۔ محمد علی کسی موضوع کو سامنے رکھ کر اس کی تعمیر کے لیے اپنے تخیل سے مسالہ نہیں مانگتا بلکہ زندگی اپنی

بوقلموں کیفیتوں کو لیے ہوئے اس کے پیچھے پیچھے بھاگتی ہے اور فن کار جب
کبھی اس کا جی چاہتا ہے اور جو کچھ بھی چاہتا ہے اس کے دامن دولت سے
مٹھیاں بھر بھر کر لے لیتا ہے۔ تو یہ ہے محمد علی، زندگی کا ایک زیرک ناظر،
اردو کا ایک صاحب طرز ادیب اور ہماری زبان کا اولین فطرت نگار۔''(43)

پرانے ماحول اور پرانی اقدار سے ایک جذباتی لگاؤ رکھنے والے، انسانیت پرست، تہذیبی قدروں کے قتیل اور پاسبان اور یہ پاسبان اس احساس کے ساتھ کہ ان کا اپنا طبقہ، ان کی اپنی تہذیب قدر و قیمت سے محروم ہوتی جارہی ہے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ اپنے سماج کی اُن تصویروں میں جو چودھری صاحب نے گرد و پیش کی زندگی سے اخذ کی ہیں، اور اپنے انحطاط پذیر ماحول کی عکاسی میں ان کے یہاں صداقت اور دردمندی کی ایک زیریں لہر صاف محسوس کی جاسکتی ہے، اس کے ارتعاشات ان کی تحریروں کی اثر آفرینی کی ضمانت ہیں۔ اس پر مستزاد ان کا طرز تحریر۔

''اردو افسانے میں جو طرز بیان، برجستگی، شوخی اور بانکپن محمد علی اپنے ساتھ
لائے.... وہ اتنا انوکھا اور منفرد ہے کہ کوشش کر کے بھی اس طرح کی دو
سطریں نہیں لکھی جاسکتیں۔ ''(44)

ایک کہانی کا اقتباس ملاحظہ ہو:

''ایک مرتبہ یہ (میر باقر) امین آباد کے ایک بالا خانے پر ایک صاحب کے
مہمان تھے۔ اس بالا خانے کے نیچے کی دکان پر ایک حافظ جی لال داڑھی،
لانبا کرتا، ٹوٹی دار پائجامہ، مذہبی سنجیدہ آدمی ایک بڑی دکان رکھتے تھے۔
رات کے وقت کوئی گیارہ کا عمل رہا ہوگا ایک صاحب حافظ جی کی تلاش
کرتے ہوئے آئے۔ ان کو خیال تھا کہ اوپر کے حصے میں حافظ جی کے
علاوہ اور کون ہوگا۔ سڑک پر سے انھوں نے حافظ جی کو پکارنا شروع کیا، ان
کی بے تابی بتاتی تھی کہ کوئی بڑی تاک ہے کیونکہ وہ بار بار پکارتے تھے اور
یہ بھی کہتے جاتے تھے کہ ایک دو منٹ سے زیادہ زحمت نہ دیں گے۔ یہاں

بجائے حافظ جی کے جنگلے سے چارپائی ملائے میاں باقر لیٹے ہوئے تھے۔ ہر آواز کے ساتھ ان صاحب کی بے تابی بڑھتی جاتی تھی۔ دوچار آوازوں کے بعد یہاں سے نہایت اطمینان کی نپی تلی اور مدھم سروں میں آواز آئی۔ ''ذوت'' وہ صاحب سمجھے نہیں، انھوں نے کہا ''کیا فرمایا حافظ جی'' یہاں سے پھر مناسب وقفے کے بعد آواز آئی ''ذوت'' اب تو اس شخص نے آواز بھی سنی اور معنی بھی سمجھا مگر اس کو یقین نہ آیا کہ ''ذوت'' کہا گیا ہوگا۔ یہاں سے بھی مقررہ وقفے کے بعد پھر وہی ''ذوت'' کہا گیا۔ تعجب کے لہجے میں نیچے سے آواز آئی ''ایں یہ کیا؟'' مقررہ وقفے کے بعد اسی اطمینان اسی سنجیدگی سے ان ہی مدھم سروں میں ''ذوت''۔ ''ارے یہ کیا شرافت ہے؟''۔ ''ذوت'' پھر وہی ''ذوت'' یہ دیکھئے بڑا حافظ بن کر آیا ہے، ہاتھ بھر کی داڑھی لگائے، چوری نگلے ہوئے اور حرکات یہ... ''ذوت'' اب تو وہ سڑک پر اینٹیں پتھر تلاش کرنے لگا۔ مگر اول تو سڑک صاف تھی دوسرے ان تک کوئی ڈھیلا پہنچ ہی نہیں سکتا تھا ''ذوت'' پھر وہی کمینہ پن۔ کیا پاجی آدمی ہے ''ذوت'' وہ جاتے جاتے پھر پلٹ پڑا اور حافظ جی کو گالیاں دینے لگا۔ اب برابر یہی ہوتا ہے کہ وہ حافظ صاحب پر نفریں کرتا ہوا جانا چاہتا ہے مگر ''ذوت'' کی آواز پھر اس کو کھینچ لاتی ہے اور وہ نئی نئی گالیاں حافظ صاحب کی خدمت میں پیش کرتا جاتا ہے۔ وعدہ تو کر کے گیا تھا کہ وہ صبح کو اپنے مخاطب یعنی حافظ صاحب قبلہ کی جوتوں سے مدارات کرے گا مگر باقر صاحب تڑکے ہی گاڑی سے چلے آئے اس وجہ سے پتہ نہ چل سکا کہ ان دونوں میں صحبت کیوں کر گرم ہوئی......'' (45) (میر باقر)

بات سے بات نکالنا اور کہانی میں اپنی بات کہنے کا ڈھنگ، الفاظ کا انتخاب موثر اور دلچسپ انداز اور بیان پر گرفت کا اندازہ مندرجہ بالا اقتباس سے کیا جا سکتا ہے۔

''کشکول محمد علی شاہ فقیر'' کے عنوان کے تحت شائع ہونے والی چیزیں، جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے میں نے سب سے پہلے 1948 میں جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی سے، ڈاکٹر

عابد حسین کی ادارت میں شائع ہونے والے ہفت روزہ رسالے ''نئی روشنی'' میں پڑھی تھیں۔ بعد کو کچھ کہانیوں اور کچھ خاکوں کے ساتھ یہی چیزیں ان کے مجموعے ''کشکول'' میں شائع ہوئیں۔ اس عنوان کے تحت وہ مختلف اور متنوع موضوعات پر چھوٹی چھوٹی عبارتیں لکھا کرتے تھے۔ موضوعات بڑے اہم ہوتے تھے اور ان میں بڑے کام کی باتیں ہوتی تھیں۔

چودھری صاحب نے افسانوں اور خاکوں کے علاوہ بھی بہت کچھ لکھا ہے، جیسا کہ ہم عرض کر چکے ہیں نفسیات اور اس سے متعلق مسائل سے انھیں خاصی دلچسپی تھی۔ اسی طرح مذاہب، مسالک اور عقائد اور ان کی باہمی اکھاڑ پچھاڑ سے بھی انھیں فطرتاً تشویش رہتی تھی، ان معاملات پر انھوں نے خاصی سنجیدگی کے ساتھ غور و خوض کیا۔

شیعہ سنّی چپقلش اودھ کی خصوصیت رہی ہے۔ چودھری صاحب خود بھی اس کے شکار رہے۔ وہ شیعہ گھرانے میں پیدا ہوئے تھے، ان کی تربیت بھی شیعہ ماحول میں ہوئی تھی مگر ان کی سوچ میں چونکہ شدت نہیں تھی اس لیے خود ان کی مذہبی فکر نکتہ چینیوں کی ہدف بنی، ان پر بھی طعن و تشنیع کے تیر چلے، وہ اپنے ایک خط میں لکھتے ہیں؟

> ''کوئی متعصب، شیعہ کہتا ہے، کوئی سنیوں کا خوشامدی کہتا ہے، کوئی ڈھل مُل یقین کہتا ہے، کوئی دہریہ کہتا ہے......''(46)

اسی خط میں آگے لکھتے ہیں:

> ''ذری یار و خدا لگتی کہو، اگر میں ائمہ علیہم السلام کی جگہ دل میں رکھتا ہوں تو شیعہ کیسے ہوگیا، اگر حضرت ابوبکر کا معترف ہوں تو سنی کیسے ہوگیا۔''(47)

اسی سب و شتم سے غالبًا دل برداشتہ ہوکر انھیں اپنے عقائد سے متعلق ایک باقاعدہ کتاب ''میرا مذہب'' لکھنا پڑی (اپریل 1951) (48)

> ''یہ (رسالہ) کسی کو تعلیم دینے کے لیے نہیں لکھا گیا۔ یہ تو ایک اعتراف ہے جو ایک گنہگار اپنے پروردگار اور اس کے بندگان، نیکوکار کے آگے کر رہا

ہے...... دل میں ایک چھپی ہوئی خواہش یہ تھی کہ کاش اس رسالے سے ''واعتصموا بحبل اللہ جمیعا و لاتفرقو'' کی صورت بھی بندھ جاتی مگر افسوس یہ سعادت میری تقدیر میں نہ تھی...... میری پہلی شادی کے وقت نکاح کا تجربہ مجھ کو کم تھا جو جو آفتیں سنی شیعہ اعزا کے ہاتھوں میری مرحومہ بی بی اور مجھ کو جھیلنی پڑی ہیں وہ ہم ہی جانتے ہیں یا ہمارے اعزا بروز قیامت انشاء اللہ جانیں گے......''

''میری پہلی بیوی مرحومہ پر زور ڈالا جاتا تھا کہ وہ شیعہ ہوجائے۔ میں نے اس مرحومہ کو صلاح دی کہ وہ اپنے ضمیر کے خلاف ہرگز اپنا مذہب نہ بدلے چنانچہ مرحومہ کا اپنے قدیم طریقے پر انتقال ہوا اور اسی طریقے پر سپرد خاک ہوئی۔ اناللہ و انا الیہ راجعون.

میں خود وصیت کرچکا ہوں اور کہتا ہوں کہ خدا ایسا کرے کہ ہر لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ کہنے والا مجھ کو سپرد خاک کرے اور میرے لیے نماز مغفرت پڑھے نہ یہ کہ میرے جنازے پر لاٹھیاں اٹھ جائیں اور میرا مردہ اس آخری حق سے بھی محروم رہے جو کلمہ شہادتین پر یقین رکھنے والے کا حق ہے۔''(49)

کہانیوں اور خاکوں کے مجموعوں اور مذہب سے متعلق ان کی کتابوں کے علاوہ دو اور کتابیں ہیں۔ ان کتابوں کا موضوع ایسا ہے کہ جس پر اردو زبان میں اظہار خیال کرنے والے وہ شاید اولین فرد ہیں۔ جنس کے مسائل پر گفتگو ہماری تہذیب میں بدتہذیبی اور کسی حد تک غیراخلاقی تصور کی جاتی رہی ہے۔ چودھری صاحب کی دور بینی اور اخلاقی جرأت کی داد دیجیے کہ انھوں نے جنسیات کے علم کی اہمیت اور نوجوان لڑکوں اور لڑکیوں کے لیے اس کی ناگزیریت کو سمجھا اور اس موضوع پر عام آدمی کی تعلیم و تربیت کی خاطر 'معلمین اخلاق' کی ناراضگیوں سے بے پروا ہوکر قلم اٹھایا۔ وہ اپنی گفتگو میں بھی اس موضوع پر اگر ضرورت ہوتی تھی تو کھل کر بات کرتے تھے۔ انھوں نے

اس موضوع پر جو کچھ لکھا اس میں وہ سب کچھ لکھا جس کا جاننا نوجوان لڑکوں اور لڑکیوں کے لیے انھوں نے ضروری سمجھا۔ جنس کی طرف ان کا رویہ بڑا صحت مند تھا جس کی جھلک ہمیں ان کے افسانوں میں بھی نظر آتی ہے۔ جنسیات سے انھیں نہ تو بیر ہے اور نہ ہی یہ ان کے لیے کوئی اجنبی یا نامانوس چیز ہے، فرد کی زندگی میں جنس کی اہمیت کو وہ اچھی طرح جانتے ہیں اور ایک صحت مند اور خوشگوار زندگی گزارنے کے لیے اس سے واقفیت کی ضرورت کا بھی انھیں شدید احساس ہے۔ جنس کے موضوع پر ان کا ایک کتابچہ ''پردے کی بات'' ضبط تولید سے متعلق ہے اور لڑکیوں کے لیے ہے۔ دوسری کتاب 'صلاح کار' لڑکوں کے لیے جنسی معلومات فراہم کرتی ہے۔

''پردے کی بات'' چودھری صاحب نے خود چھپوائی، اس کی کوئی قیمت نہیں تھی، دلچسپی رکھنے والوں کو وہ مفت دیتے تھے، اس کتاب کا سائز بھی انھوں نے جیبی رکھا تھا شاید رازداری کے خیال سے۔

دوسری کتاب ''صلاح کار'' کے دو ایڈیشن چھپے۔ 'صلاح کار' کے دیباچے میں چودھری صاحب نے لکھا ہے:

> ''کردن صد عیب نہ کردن یک عیب، جنسی موضوع پر کتاب لکھنا اور نوجوانوں کے ہاتھ میں دینا ذمہ داری سے خالی نہیں، لیکن جن ڈھونڈیاں تن پائیاں، گھر سے پانی پیٹھ جب تک کوئی شخص جرأت نہ کرے جوکھم نہ اٹھائے کام کیوں کر چلے گا۔ یہی خیال تھا جس نے ہمت برقرار رکھی اور یہی خیال تھا جس سے عذر خواہی کی ضرورت نہیں سمجھتا ہوں۔ پھر بھی اگر کوئی پڑھنے والا مجھ کو خطادار مان کر معاف کردے گا تو مجھے کوئی عذر نہ ہوگا......''(51)

جنوری 1954 میں فالج کا حملہ ہوا، صاحب فراش ہوئے، بعد کو چھوٹی چھوٹی اور تکلیفیں پیدا ہوتی رہیں اور بالآخر:

> ''ہنسی کی عمر ختم ہوئی اور فالج میں مبتلا ہونے کے بعد ہنسوڑ نے اب مستقلاً رونا شروع کیا اور یہ کہ گریہ و زاری خوف آخرت سے...... فرنگی محلی، ندوی

کسی قسم کی مذہبی شخصیت کو پاجاتے تو رو رو کر اس سے دعائے مغفرت کا
وعدہ لیتے، اس کا ہاتھ اپنے سینے پر رکھتے اور یہ مبارک کیفیت دو دن نہیں
مدتوں رہی ۔

اے خنک چشمے کہ آں گریان اوست
اے خنک قلبے کہ آں برہان اوست

10 دسمبر 1959 کو جمعرات کے دن کوئی گیارہ بجے طبیعت اچانک بگڑ گئی۔ نماز ظہر لیٹے لیٹے ادا کی، پھر کبھی درود شریف پڑھتے کبھی اللہ اللہ کہتے اور اسی عالم میں روح پرواز کر گئی۔''(52)

تدفین شب جمعہ ہوئی۔ نماز دو بار حسب وصیت پڑھی گئی۔ ایک بار سنیوں نے ایک بار شیعوں نے۔ ان نمازوں میں شرکت بہت بڑی جماعتوں نے کی۔

شیعہ حضرات کی نماز میں امامت چودھری ارشاد حسین (رئیس رودولی) کی مسجد کے پیش امام مولوی ابن حسن نانپاروی نے کی جبکہ سنی حضرات کی نماز کے امام چودھری صاحب مرحوم کے برادر نسبتی حاجی چودھری عظمت رسول نے کی۔ تدفین رودولی کے قبرستان 'عیدی میراں' میں ہوئی۔''(53)

چودھری صاحب کی تصانیف

چودھری صاحب کی تصانیف کی مستند ترین فہرست وہی ہوسکتی ہے جو انھوں نے ڈاکٹر نورالحسن کو بھیجی تھی، ڈاکٹر نورالحسن نے رسالے 'فروغ اردو' کے لیے چودھری صاحب سے ان کی کتابوں اور اپنے کچھ حالات لکھ کر بھیجنے کی فرمائش کی تھی۔ مندرجہ ذیل فہرست ڈاکٹر نورالحسن کے نام چودھری صاحب کے خط مورخہ 18/اکتوبر 1954 میں ہے اور وہیں سے لی گئی ہے۔ کتابوں کے ناموں کے علاوہ دوسری تفصیلات مختلف جگہوں سے حاصل کی گئی ہیں۔

1۔ اتالیق بی بی — ''یوں ہی بے دام عبدالحلیم شرر مرحوم کو دی تھی۔ تیس سال سے زائد ہوئے ہوں گے یا اس کے لگ بھگ (ہما بیگم کے نام خط مورخہ 23/جولائی 1948 گویا دبستان کھل گیا) خطوط میں آنے والے ذکر سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ کتاب غالباً 1918 میں چھپی۔ گمان غالب ہے کہ شائع ہونے والی ان کی پہلی کتاب یہی ہوگی۔ نایاب ہے۔

2۔ صلاح کار — کتاب مردوں کی جنسی تعلیم سے متعلق ہے۔ چودھری صاحب نے خود چھپوائی، یونائیٹڈ انڈیا پریس لکھنؤ سنہ اشاعت یا حقوق وغیرہ کا کوئی ذکر نہیں ہے۔ نایاب ہے۔

3۔ یادگار مولانا کرامت حسین مرحوم — منوہر لال بھارگو بی اے، سپرنٹنڈنٹ کے اہتمام سے نول کشور پریس لکھنؤ میں چھپی (اندازاً 1918 میں) حقوق اور قیمت وغیرہ کا کوئی ذکر نہیں۔ نایاب ہے۔

4۔ گناہ کا خوف
مولفہ: محمد علی رودلوی، نیا سنسار، پرنٹڈ بائی شنکر بھارگو، ایٹ دی فائن پریس لکھنؤ تاریخ طباعت اور تحفظ حقوق کا کوئی ذکر نہیں ہے۔ خطوط میں آنے والے ذکر سے اندازہ ہوتا ہے کہ کتاب 1952 میں شائع ہوئی۔ نایاب ہے۔

5۔ میرا مذہب
1951 میں مکمل ہوئی۔ خورشید صاحب کے نام خط مورخہ 12/اپریل 1951 میں اس کا ذکر ہے۔ کتاب کی اشاعت غالباً 1952 میں ہوئی۔ پہلے چودھری صاحب نے خود چھپوائی ادھر چند برس ہوئے خدابخش لائبریری پٹنہ نے نیا ایڈیشن شائع کیا۔ اس اڈیشن میں کتاب کا انتساب غائب ہے۔

6۔ پردے کی بات
ضبط تولید سے متعلق کتابچہ، عورتوں کے لیے (جیبی سائز) کتابچے کی کوئی قیمت نہیں تھی، چودھری صاحب نے خود چھپوایا، مفت ہی تقسیم ہوا۔ نایاب ہے۔

7۔ کشکول محمد علی شاہ فقیر
پہلا ایڈیشن 1951 تعداد ایک ہزار، منیجر صدیق بک ڈپو نے نامی پریس لکھنؤ میں چھپواکر شائع کیا۔ تحفظ حقوق سنہ طباعت اور قیمت وغیرہ کا کوئی تذکرہ نہیں ہے۔ اسی نام کا مجموعہ سید علی کاظم صاحب نے مرتب کیا جو ان ہی کی فرمائش اور تعاون سے اردو اکادمی سندھ کراچی نے شائع کیا۔ (1980) اس مجموعے میں چودھری صاحب کی تین کتابیں کشکول محمد علی شاہ فقیر، 'گناہ کا خوف' اور 'اتالیق بی بی یکجا کردی گئی ہیں۔ کم یاب ہے۔

8۔ گویا دبستان کھل گیا	چودھری صاحب کی چھوٹی صاحبزادی ''محترمہ ہما بیگم جسٹس سید اخلاق حسین نے مرتب کی اور ان ہی کی فرمائش اور اشتراک سے اردو اکادمی سندھ، کراچی نے 1977 میں شائع کیا۔ (اضافہ شدہ ایڈیشن، حقوق بحق مرتب محفوظ۔ قیمت پچہتر روپے
9۔ نقادی کے نکتے	قلمی تصاویر کی پرکھ سے متعلق کتابچہ، سرفراز قومی پریس لکھنؤ۔ اب نہیں ملتی ہے۔
10۔ خبطی	مزاحیہ کوئی چیز ہے، انوار بک ڈپو، طبع اول 1940۔ اب نہیں ملتی ہے۔
11۔ سیرۃ الاقطاب	(سوانح) نول کشور، 1944 سے پہلے کبھی لکھی گئی۔ کوئی سراغ نہیں ملتا۔

ان کتابوں کے علاوہ وہ مضامین اور افسانے ہیں جو حکیم عبدالوالی (لکھنؤ) کے رسالے ''معلومات'' اور ''اودھ پنچ'' میں شائع ہوئے۔ کتابی صورت میں نہیں آئے۔ 'معلومات' میں چودھری صاحب کے ایک ایکٹ کے تین ڈراموں ''عیاش کسان'' ''سعید اور سلمہ'' اور ''کسان'' کا تذکرہ ملتا ہے۔ مگر یہ ڈرامے نہیں ملتے۔ چودھری صاحب نے آسکر وائلڈ کی ایک تحریر کا (قندموت De profundis جو ایک خط کی شکل میں ہے) اور جارج برنارڈ شاہ کی بعض نگارشات جیسے ''پیراڈاکس'' کا ترجمہ بھی کیا تھا مگر ان کا سراغ بھی نہیں ملتا ہے۔

انجمن ترقی پسند مصنفین کی پہلی کانفرنس (لکھنؤ 1936) میں چودھری صاحب استقبالیہ کمیٹی کے صدر تھے، انھوں نے لکھا ہوا خطبہ استقبالیہ بھی پڑھا تھا۔ خلیق ابراہیم خلیق (کراچی) نے اپنی خودنوشت سوانح عمری ''منزلیں گرد کے مانند......'' میں اس خطبے کے دو تین جملے واوین میں لکھے ہیں۔ خلیق صاحب سے معلوم کرنے کے باوجود پورے خطبے کا پتہ نہیں چلا۔

ایک اسکول کے ایک مشاعرے کی صدارتی تقریر کے دو صفحے خود چودھری صاحب کے ہاتھ کے لکھے ہوئے ہیں، جو میرے پاس ہیں، یہ مشاعرہ کب ہوا اور کس اسکول میں ہوا اس کا کوئی ذکر نہیں ہے۔

چودھری صاحب کی ادبی تخلیقات کو محفوظ رکھنے کی طرف سے جو بے توجہی خود ان کی زندگی میں نظر آتی ہے اسے دیکھ کر تاسف ہوتا ہے۔ اس سے زیادہ افسوس اس بات پر ہوتا ہے کہ جن کتابوں کی قسمت میں طباعت و اشاعت آئی وہ بھی انتہائی لاپروائی کا شکار ہوئیں۔ ان کی ایک کتاب بھی ایسی نہیں ہے جس کی طباعت کو معیاری کہا جاسکے۔ واجبی بھی نہیں ہے۔ کاغذ خراب، کتابت خراب، طباعت خراب، اس خرابی کا احساس خود چودھری صاحب کو بھی تھا۔

''میری دونوں کتابیں ایسی کس مپرسی کے عالم میں چھپی ہیں کہ کچھ انتہا نہیں، جتنی غلطیاں صحت نامے میں بتائی گئیں اسی قدر اور رہ گئیں......
(ہما بیگم کے نام خط، گویا دبستان کھل گیا، صفحہ 219)

''میرا مذہب'' اور ''کشکول'' محمد علی شاہ فقیر حاضر ہیں۔ یہ دونوں کتابیں اتنی غلط چھپی ہیں کہ دل سے اتر گئیں، مگر پھر بھی پیاری ہیں جیسے چیچک نکلنے کے بعد اولاد ہوتی ہے......'' (ضامن علی خان کے نام خط گویا دبستان کھل گیا، صفحہ 259)

ایک دوسرے خط میں لکھتے ہیں:

''چھپائی ایسی کہ جیسے یتیم بچے کا منہ ہوتا ہے غلطیاں ایسی کہ جیسے برے گھر کی لونڈی ہوتی ہے......'' (گویا دبستان کھل گیا، صفحہ 72)

ایک دوسری کتاب کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں...... ''دوسری طبع میں صرف یہی نہیں کہ کاغذ بودا کردیا ہو لکھائی ستے داموں والی کردی ہو بلکہ اصلاحیں بھی دے دیں۔ سہو کاتب نہیں قتل عمد......''

(نقوش مکاتیب نمبر جلد دوم، صفحہ 809)

چودھری محمد علی رودلوی کو یاد کرنا اردو کی ادبی اور تہذیبی روایت کو یاد کرنا ہے۔ وہ اس روایت کے بہت ممتاز نمائندے تھے اور آج سے چالیس پچاس سال پہلے تک ان کا نام تمام اردو حلقوں میں احترام اور محبت کے ساتھ لیا جاتا تھا، مگر آج یہ نام کچھ نامانوس سا ہے۔ یہ جاننے والے اب کم رہ گئے ہیں کہ وہ ایک صاحب طرز ادیب تھے، انھوں نے افسانے لکھے ہیں، کہانیاں اور خاکے لکھے ہیں اور جنس اور مذہب جیسے موضوعات پر کتابیں لکھی ہیں۔ وہ ایک نہایت دلچسپ اور رنگارنگ مجلسی شخصیت کے مالک تھے۔ گفتگو کے آداب اور فن میں ان کی جیسی مہارت کم لوگوں کے حصے میں آئی۔ اس مقبولیت کے باوجود اپنے زمانے میں بھی ادیب کی حیثیت سے وہ بہت مشہور نہیں ہوئے۔ مولانا عبدالماجد دریاآبادی نے ان کے بارے میں ایک جگہ لکھا تھا ''ایسے لکھنے والے مگر گمنامی میں پڑے ہوئے ہیں۔''

بیسویں صدی کی غالباً چوتھی دہائی تھی جب کرشن چندر نے ان کا ایک افسانہ ''تیسری جنس'' اپنے مرتب کیے ہوئے انتخاب ''نئے زاویے'' میں شائع کیا تھا۔ یہی افسانہ بعد کو محمد حسن عسکری نے افسانوں کی ایک اینتھولوجی ''میرا بہترین افسانہ'' میں شائع کیا۔ چودھری صاحب کے اس افسانے کا موضوع ہم جنسی کا رجحان تھا۔ اس زمانے میں سعادت حسن منٹو اور عصمت چغتائی کا چرچا تھا، جنس چونکانے والا، مقبول اور ترقی پسندوں کا پسندیدہ موضوع تھا۔ چنانچہ 'تیسری جنس' کی تعریف بھی ہوئی اور افسانہ نگار کا ذکر بھی ہوا۔ اس کے بعد پھر سناٹا، چودھری محمد علی کا تذکرہ بس کچھ دن چلا، بالعموم لکھنے والوں کے حلقے میں، قصبے میں قیام اور تعلقات عامہ کی ترکیبوں سے نابلدی کی وجہ سے وہ جس توجہ کے مستحق تھے وہ انھیں نصیب نہ ہوئی۔ وہ تو کہیے کہ ان کی چھوٹی بیٹی بیگم ہما اخلاق حسین نے ان کے خطوط کو مرتب اور شائع کر کے ایک بڑی خدمت انجام دے دی۔ ان خطوط کی اشاعت کے بعد ادبی حلقوں میں پھر کچھ سُن گُن

شروع ہوئی اور ایک بار پھر چودھری محمد علی رودولوی کا تذکرہ ہوا۔ بازیافت کی کوششوں کے کچھ آثار نظر آنے لگے۔

خود میں نے بھی ان کی ایک آدھ چیز بہت بعد میں پڑھی، اتنے دنوں بعد کہ ان کی تخلیقات کا ملنا بھی محال ہو چکا تھا اور اکثر چیزیں طاق نسیاں کی زینت بن چکی تھیں۔ اسی منزل میں تھا، یہ نومبر 1995 کی بات ہے کہ انتہائی غیر متوقع طور پر مجھے 'سوغات' (بنگلور، ہندستان) کے ایڈیٹر محمود ایاز صاحب کا ایک خط ملا (12/نومبر 1995) محمود ایاز صاحب نے لکھا تھا:

> "جناب شمیم حنفی صاحب سے پتہ چلا کہ آپ مرحوم چودھری محمد علی رودولوی سے ربط خاص رکھتے ہیں۔ میں نے 'سوغات' کے تازہ شمارے (نمبر9) کے لیے ایک گوشہ مرتب کیا تھا اس وقت مجھے علم نہیں تھا ورنہ ضرور آپ کو زحمت دیتا۔ اگر آپ اپنی یادوں پر مشتمل ایک شخصی خاکہ یا مضمون مرحوم پر عنایت کریں تو آئندہ شمارے میں اس کی اشاعت بہت برمحل اور مناسب رہے گی......"

میں نے ان کی فرمائش پر ایک مضمون لکھا۔ اس مضمون کے سلسلے میں میں نے چودھری صاحب کی سب سے چھوٹی بیٹی بیگم ہما اخلاق حسین سے جو رشتے میں میری خالہ ہوتی ہیں رابطہ قائم کیا۔ یہ ان کی محبت ہے کہ انھوں نے چھرو نانا (چودھری محمد علی نجی حلقوں میں اپنی اسی عرفیت سے جانے جاتے تھے) کے بارے میں بہت سی باتیں ایک ٹیپ پر ریکارڈ کر کے مجھے بھیجیں (یہ ریکارڈنگ 11 / مارچ 1996 ہما خالہ کے گھر پر لاہور پاکستان میں ہوئی تھی) مضمون، حسب وعدہ میں نے محمود ایاز صاحب کو بھیج دیا۔ 26/نومبر 1996 کو ان کا ایک خط پھر آیا:

> "آپ کا کرم نامہ، خطوط اور مضمون آج موصول ہوا۔ بہت بہت شکریہ۔ شمارہ گیارہ پریس کو جارہا ہے ورنہ اسی میں شامل کرلیتا۔ اب بارہویں شمارے میں آسکے گا، کوئی حرج نہیں مقصد صرف یہ ہے کہ چودھری صاحب کے بارے میں جو کچھ معلومات فراہم ہوسکیں جمع ہوجائیں تاکہ مستقبل میں کوئی کام کرنا چاہے تو اسے سہولت ہو......"

اسے بدقسمتی ہی کہیے کہ چند دنوں بعد ہی محمود ایاز صاحب کا انتقال ہوگیا۔ چودھری صاحب پر میرا مضمون ان کے رسالے میں شائع نہیں ہوا۔ کچھ دنوں بعد میرا جانا کراچی ہوا۔ کراچی میں مشفق خواجہ صاحب سے ملاقات ہوئی، ان سے مضمون کا تذکرہ ہوا۔ انھوں نے فرمایا کہ مضمون میں انھیں بھیج دوں۔ 'سوغات' والوں کے پاس مسودہ گم ہو چکا تھا، شکر ہے کہ میرے پاس مضمون کی نقل تو نہیں تھی مگر نوٹس موجود تھے چنانچہ میں نے مضمون دوبارہ لکھا اور مشفق خواجہ صاحب کو بھیج دیا۔ وہاں اس کی اشاعت میں جب بہت دیر ہوئی تو میں نے یہ مضمون انجمن ترقی اردو (ہند) کے رسالے 'اردو ادب' کے حوالے کیا۔ اسلم پرویز صاحب نے جولائی اگست ستمبر 2001 کے شمارے میں اسے شائع کیا۔ ایک طرف محمود ایاز صاحب کی اس بات نے کہ چودھری صاحب کے بارے میں جو کچھ معلومات جمع ہوسکیں جمع کرلی جائیں تاکہ مستقبل میں کوئی کچھ کام کرنا چاہے تو اسے سہولت ہو اور دوسری طرف ہما خالہ کی اس خواہش نے کہ چمرو نانا کی ادبی تخلیقات کو ایک بار پھر لوگوں کے سامنے لانے کا اہتمام کرنا چاہیے یہ خیال پیدا کیا کہ چودھری صاحب کی ساری تخلیقات کو ڈھونڈھ ڈھانڈھ کر جمع تو کر ہی دینا چاہیے تاکہ وہ محفوظ ہوجائیں اور گم نامی سے بچ جائیں۔ بہرحال اس خیال کے آنے کے بعد سے اس کام میں لگا رہا۔ یہ سارا قصہ 1995 اور اس کے بعد کا ہے۔ رودولی، دریا آباد، بارہ بنکی، لکھنؤ، علی گڑھ، پٹنہ اور ممبئی وغیرہ کے علاوہ کراچی اور لاہور میں چودھری صاحب سے ذرا بھی تعلق رکھنے والوں سے رابطہ قائم کیا اور چیزوں کو حاصل کرنے کی کوشش کی۔ چودھری صاحب کی ادبی اور علمی تخلیقات کا یہ مجموعہ ان ہی کوششوں کا نتیجہ ہے۔ یہاں پر ایک بات اور عرض کردوں۔ میں نے اس کُلّیات میں وہ مواد بہم پہنچایا ہے جو چودھری صاحب کی تخلیقات کے پہلے ایڈیشنوں، میں ہے۔ چنانچہ تعارف، دیباچہ پیش لفظ کے عنوانات کے تحت صرف وہی چیزیں دی گئی ہیں جو ان اولین اشاعتوں میں تھیں۔

مسعودالحق

مآخذ اور مصادر

1۔ رشید حسن خاں (مرتب) گزشتہ لکھنؤ (مکتبہ جامعہ دہلی، 1992) صفحہ 8

2۔ رشید حسن خاں (مرتب) گزشتہ لکھنؤ (مکتبہ جامعہ دہلی 1992) صفحہ 9

3۔ نورانی امیر حسن 'سوانح منشی نول کشور' (خدا بخش لائبریری پٹنہ) صفحہ 7

4۔ نورانی امیر حسن، 'سوانح منشی نول کشور' (خدا بخش لائبریری پٹنہ) صفحہ 15

5۔ نیا دور، اودھ نمبر، حصہ دوم، 1994

6۔ محمد علی چودھری 'امیری کی بو' (گناہ کا خوف) نیا سنسار لکھنؤ صفحات 11-9

7۔ قرۃ العین حیدر 'داستان طراز' (مضمون) سوغات 9 بنگلور، صفحہ 315

8۔ قرۃ العین حیدر 'داستان طراز' (مضمون) سوغات 9 بنگلور، صفحہ 316

9۔ قرۃ العین حیدر 'داستان طراز' (مضمون) سوغات 9 بنگلور

10۔ ملازمہ کو بہت گلے ہوئے چاول پکانے کی ہدایت، بزرگ خواتین آج بھی اسی طرح دیتی ہیں۔

11۔ انتہائی ہلکے رنگ کو سمجھانے کے لیے یہ طرزِ اظہار عام ہے۔

12۔ بیگم ہما اخلاق حسین سے ایک گفتگو

13۔ عبدالماجد دریا آبادی مولانا، 'معاصرین' سوغات، بنگلور

14۔ بیگم ہما اخلاق حسین گفتگو

15۔ محمد علی چودھری نے کرامت حسین صاحب کے بارے میں ایک کتابچہ 'یادگار مولانا کرامت حسین مرحوم لکھا تھا جو مفت تقسیم ہوا تھا۔ اب کم یاب ہے۔

16۔ بیگم ہما اخلاق حسین سے گفتگو

17۔ ہما اخلاق حسین کے نام خط : 'گویا دبستان کھل گیا' (چودھری صاحب کے خطوط کا مجموعہ) اردو اکادمی سندھ، کراچی صفحہ 142

18۔ بیگم ہما اخلاق حسین سے ایک گفتگو۔

19۔ بیگم ہما اخلاق حسین سے ایک گفتگو۔

20۔ بیگم ہما اخلاق حسین سے ایک گفتگو۔

21۔ بیگم ہما اخلاق حسین سے ایک گفتگو۔

22۔ بیگم ہما اخلاق حسین سے ایک گفتگو۔

23۔ بیگم ہما اخلاق حسین سے ایک گفتگو۔

24۔ بیگم ہما اخلاق حسین سے ایک گفتگو۔

25۔ بیگم ہما اخلاق حسین سے ایک گفتگو۔

26۔ بیگم ہما اخلاق حسین سے ایک گفتگو۔

27۔ بیگم ہما اخلاق حسین سے ایک گفتگو

28۔ بیگم ہما اخلاق حسین سے ایک گفتگو

29۔ شیعوں میں کچھ لوگ ایسے ہیں جو تسبیح پر کچھ پڑھ کر اپنے کاموں میں خدا سے مشورہ کرتے ہیں۔ اسی کو استخارہ دیکھنا کہتے ہیں۔

30۔ لکھنؤ میں ایک محلّہ ہے جہاں پرانی اور نئی چیزوں کی بہت بڑی بازار پہلے ہر جمعرات کو لگتی تھی اب غالباً ہر اتوار کو لگتی ہے۔

31۔ ہما اخلاق حسین: ''گویا دبستان کھل گیا'' چودھری صاحب کے خطوط کا مجموعہ۔ اردو اکادمی سندھ، کراچی، 1977۔ صفحہ 42

32۔ ہما اخلاق حسین: گویا دبستان کھل گیا' چودھری صاحب کے خطوط کا مجموعہ، اردو اکادمی سندھ کراچی، 1977، صفحہ 169

33۔ اب کوئی باقاعدہ لائبریری تو نہیں ہے مگر یہ ضرور کہا جاسکتا ہے کہ کتابیں ضائع نہیں ہوئیں کہ جس کا خدشہ تھا۔ چودھری صاحب کے بیٹے سعید مصطفیٰ نے بہت سی قیمتی اور نادر کتابیں علی گڑھ یونیورسٹی کو دے دی ہیں اور جو باقی ہیں، وہ گھر میں بڑے سلیقے سے الماریوں میں رکھی ہیں۔ ان کی دیکھ بھال ہوتی ہے، ان کتابوں کو بھی کسی مناسب ادارے کو دینے کا خیال ہے پھر بھی کچھ کتابیں ہیں جو توجہ کی مستحق ہیں۔

34۔ ہما اخلاق حسین سے گفتگو۔

35۔ مئی ۱۹۹8 میں کنیڈا میں ان کا انتقال ہوگیا۔

36۔ ہما اخلاق حسین

37۔ مضمون کی زبان کے سلسلے میں عرض کردوں کہ میں نے کئی جگہوں پر وہی زبان لکھ دی ہے جس میں ہما خالہ نے بات کی تھی۔ ہم لوگ گھر میں یہی زبان بولتے ہیں۔ نہ جانے کیوں اسے کچی زبان اور باقاعدہ بولی جانے والی زبان کو پکی بولی کہتے تھے۔

38۔ مرتب کے نام ہما خالہ کے خط کا اقتباس

39۔ ہما اخلاق حسین کے نام خط : ''گویا دبستان کھل گیا'' چودھری صاحب کے خطوط کا مجموعہ اردو اکادمی سندھ کراچی، 1977، صفحات 163-158

40۔ محمد علی چودھری : 'گناہ کا خوف' (دیباچہ)

41۔ محمد علی چودھری: ''گناہ کا خوف'' (دیباچہ، پہلا ایڈیشن) نیا سنسار لکھنو، صفحات 3-4

42۔ وارث علوی: 'جدید افسانہ اور اس کے مسائل' (آج کی کتابیں، کراچی) صفحہ 22

43۔ صلاح الدین احمد مولانا : سوغات 9 بنگلور میں اقتباس، صفحہ 313

44۔ قرۃ العین حیدر: 'افسانہ طراز' (مضمون) سوغات9 بنگلور، صفحہ 319

45۔ محمد علی چودھری : میر یوسف (خاکہ)

46۔ ہما اخلاق حسین کے نام خط : 'گویا دبستان کھل گیا' (چودھری صاحب کے خطوط کا مجموعہ) اردو اکادمی سندھ کراچی 1977، صفحہ 103

47۔ ہما اخلاق حسین کے نام خط : گویا دبستان کھل گیا (چودھری صاحب کے خطوط کا مجموعہ) اردو اکادمی سندھ، کراچی 1977، صفحہ 105

48۔ محمد علی چودھری : ''گویا دبستان کھل گیا'' مرتبہ ہما اخلاق حسین۔ اردو اکادمی سندھ کراچی، 1977 صفحہ 97

49۔ محمد علی چودھری : 'میرا مذہب' پہلا ایڈیشن (یونائیٹڈ پریس انڈیا پریس، لکھنؤ) صفحہ 5

50۔ انور حسین : 'چودھری محمد علی - حیات اور ادبی خدمات' میں صدق جدید کے حوالے سے صفحہ 57-56

51۔ انور حسین : 'چودھری محمد علی - حیات اور ادبی خدمات' میں صدقِ جدید کے حوالے سے صفحہ 58

52۔ محمد علی چودھری : 'صلاح کار' سرفراز قومی پریس، لکھنؤ طبع ثانی) صفحہ 3

53۔ نقوش مکاتیب نمبر جلد دوم صفحہ 809

''چودھری محمد علی پر کوئی پچاس سال قبل قرۃ العین حیدر نے ایک مضمون 'داستان طراز' کے عنوان سے لکھا تھا۔ 'داستان طراز' کی اشاعت کے چار پانچ سال کے اندر محمد علی اللہ کو پیارے ہوگئے۔ 'سوغات' کے تیسرے شمارے (دور اول) میں ایک مختصر نوٹ نکلا۔ دوسرے کچھ رسائل اور اخبارات میں شاید چند سطریں آئی ہوں گی اور اردو والوں کو پتہ بھی نہ چلا کہ کیسا زبردست انشا پرداز، ایک طرز اور اسلوب کا موجد اور خاتم، تحریر میں باتوں کے پھول کھلانے والا ان کے درمیان سے اٹھ گیا...''

(محمود ایاز : سوغات 9 بنگلور)

محمود ایاز نے اردو زبان و ادب کے جس المیے کی طرف اشارہ کیا ہے وہ ایک حقیقت ہے۔ یہ ہماری لاپرواہی ہی ہے کہ ہم اپنے ایسے باغ و بہار ادیب کو تقریباً بھول چکے ہیں، اس کی تخلیقات، کتب خانوں کی الماریوں میں بھی نہیں ملتی ہیں۔ اس کلیات کی ترتیب و تدوین کے سلسلے میں، کوشش بسیار کے بعد بھی ان کی بہت سی چیزیں دستیاب نہ ہوسکیں۔ نہ ملنے والی چیزوں میں ان کے ڈرامے، ان کے ترجمے، ان کی مزاحیہ تحریریں ہیں۔ انھیں تلاش کرنے کی ضرورت ہے لگن اور تگ و دو چاہیے۔ اس کلیات کی اشاعت کے بعد امید بندھتی ہے، شاید آجائے کوئی آبلہ پا۔

(مرتب)

(پیدائش : ۱۵ مئی ۱۸۸۲)

"........ ساڑھے تین برس کا تھا آپ نے باپ کا سایہ میرے سر سے اٹھا لیا۔ کہیے ہاں، اس کے بعد بے وقوف چاہنے والی ماں نے لاڈ پیار کی انتہا کردی، اگر میں نے کسی کو مارنا چاہا تو اس نے ازار بند سے چوئنی کھول کر اس کو دی اور کہنے لگی کہ میرا بچہ یتیم ہے یہ لو چوئنی اور اس کو مار لینے دو۔ اس کا جی چھوٹا نہ کرو، گھر میں ننھودادا رہتے تھے وہ والد کے قصے سنایا کرتے تھے کہ تمھارے باپ نے یہ کیا وہ کیا۔ میرے دل میں بھی یہی شوق پیدا ہوتا تھا کہ ہم بھی بڑے ہوں گے تو یہی کریں گے........"

(ہما بیگم کے نام خط مورخہ ۱۹ر نومبر ۱۹۴۹)
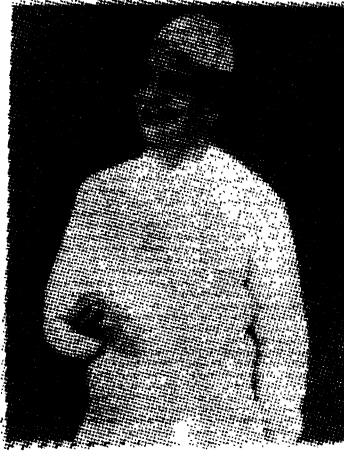
''..........ہمارے ساتھی تو قریب قریب ختم ہو چکے۔ پہلے تو ہم نے اپنے سے کم سن لوگوں سے رسم بڑھائی تھی، گویا سینگ کٹا کر بچھڑوں میں داخل ہوگئے تھے، مگر خدا کا کرنا ایسا ہے کہ ان سے بھی واسطہ نہ رہا۔ اب دو ایک بڈھے رہ گئے ہیں ان سے کبھی ملاقات ہوجاتی ہے تو آپس میں ایسی باتیں ہوتی ہیں جیسے ہم لوگ اعراف میں بیٹھے ہیں۔ ایک ایک پرانا قصہ بیس بیس بار بیان ہوتا ہے، سنتے سنتے جگہیں مقرر ہوگئی ہیں کہ کس مقام پر ہنسنا چاہیے اور کس مقام پر افسوس کرنا چاہیے۔ قصہ مختصر زندہ ام مردہ مردہ ام مگر زندہ۔ ہماری لڑکیاں کجن، الن، ہما سنا ہے بڑھیا ہوگئیں (عالیہ میں ماشاء اللہ ابھی خفیف جوانی کی جھلک دکھائی دیتی ہے) سنا ہے کہ سلمان کے ماتھے کے بال اڑ گئے، گالوں پر بڑھاپے کا گوشت بھر آیا ہے۔ جب یہ حال ہو تو ہمارے چہرے کا کیا پوچھنا، کوشش کرتے ہیں کہ خط بنانے میں بھی چہرے پر نظر نہ پڑے اور اگر پڑ جاتی ہے تو جی چاہتا ہے کہ تھپڑ ماریں۔ معلوم ہوتا ہے کہ شیخ حبیب اللہ مرحوم کے والد شیخ عنایت اللہ مرحوم بیٹھے ہیں۔ جب ہماری شادی ہوئی تھی اعزہ میں دو ایک جوان لڑکیوں کی مائیں جن کو حسد ہوتا تھا ان میں سے ایک تھیں جو ہماری بی بی مرحومہ سے جلن نکالنے کے لیے کہتی تھیں ''ارے دولھا کی چاند ایسی صورت دیکھ کر شیعہ ہوجائے گی۔ آج یہ قصہ جس سے بیان کریں وہ کہے یہ بڈھا بہت جھوٹ بولتا ہے..........''

(ڈاکٹر حسین ظہیر کے نام ۱۸/اگست ۱۹۵۱)

''.......... نماز کے بعد بارگاہ خدا میں عرض کرتا ہوں کہ بار الہا ایمان دے اللہ میاں فرماتے ہیں کہ ہمارا کام ہی ہے ایمان بخشنا، مگر تم خود اپنے دل میں ڈھونڈھو، یہ طلب تمھاری صادق ہے؟ میں عرض کرتا ہوں میرے مالک میری تمنا ایمان کی روشنی سے سینہ جگ مگ جگ مگ کرنے لگے جی سے معلوم ہوتی ہے، وہاں سے ارشاد ہوتا ہے کہ ہاں ہاں یہ تو ٹھیک ہے مگر غور کرو تم نے جوانی میں بہت سی عورتوں کو جانا، بھلا ایمان سے کہو اس بے تابی، تڑپ، شوق کا کچھ بھی شائبہ ہماری تلاش میں پاتے ہو؟ میں عرض کرتا ہوں جی نہیں اس طرح کی تڑپ بے چینی تو نہیں پاتا ایک دوسری طرح کی خواہش ضرور ہے۔ وہ فرماتے ہیں، ہم تمھارے دل کا حال تم سے بہتر سمجھتے ہیں۔ یہ خواہش جو تم محسوس کرتے ہو تو یہ ہماری محبت کی وجہ سے نہیں ہے بلکہ بوڑھے ہو گئے ہو، عورت منھ نہیں لگاتی، طاقت جواب دے رہی ہے، موت کھڑی گھور رہی ہے اس لیے اس طرح کے خیالات دل میں پاتے ہو، میں عرض کرتا ہوں بار الہا اب تیرے سمجھانے سے سمجھ میں آتا ہے۔ واقعی تیری خواہش ان ہی مجبوریوں سے ہوگی۔ مگر ہے تو، جوانی میں نہ سہی بڑھاپے میں سہی مگر اب تو ہے، اسی کا خیال فرما کر رحم کر اور دے دے دولتِ ایمان..........''

(ہما بیگم کے نام خط ۱۹ر نومبر ۱۹۴۹)

افسانے اور کہانیاں

عرضِ مرتّب

'ادبی دنیا' (پاکستان) کے ایڈیٹر مولانا صلاح الدین احمد نے چودھری محمد علی کو اردو کا اولین فطرت نگار قرار دیا تھا اور قرۃ العین حیدر انھیں داستان طراز کہتی ہیں۔ اور حقیقت بھی یہ ہے کہ چودھری صاحب نے اپنے بیان کی شگفتگی، اظہار کی سلاست اور ادائے مطالب کی بے مثل صلاحیتوں سے اعلیٰ درجے کی نثر تو لکھی ہی ساتھ ہی انھوں نے تخلیق کو عوام کے دل کی دھڑکن سے ہم آہنگ کرکے ادب کی ایک لازوال خدمت انجام دی۔

محمد علی اگرچہ اپنے افسانوں اور خاکوں کی بنیاد بیشتر محسوسات خارجی ہی پر رکھتے ہیں لیکن اپنے موضوع کی طرف ان کی پیش قدمی خالصتاً داخلی اور نفسیاتی ہوتی ہے۔ وہ حقیقت پرستی اور خیال آفرینی کا ایک بے رحمانہ امتزاج پیش کرتے ہیں، ان کا یہ امتزاج فنی ادب میں ایک نہایت صحت مند معیار کا درجہ رکھتا ہے اور اس معیار پر بہت کم فنکاروں کی تخلیقات اترتی ہیں۔ وہ مفکر نہیں. بنیادی طور پر افسانہ نگار ہیں، وہ ہمیں کہانی اس لیے نہیں سناتے کہ وہ اپنی فکر کی کسی کاوش یا اپنے تخیل کی کسی گرفت کا اظہار کرنا چاہتے ہیں بلکہ وہ کہانی اس لیے سناتے ہیں کہ اگر نہ سنائیں تو شاید بیمار پڑ جائیں۔ چودھری صاحب کسی مقصد یا نظریے کی تبلیغ کے لیے کہانیاں بناکر ہمیں نہیں سناتے، وہ زندگی کے ایک زیرک طالب علم ہیں اور زندگی کے مطالعے میں جو غیر معمولی یا لطیف یا مضحکہ خیز صورتیں اور نتائج ان کے سامنے آتے ہیں انھیں لطیف و بلیغ اور سلیس و رنگین پیرائے میں ہمارے سامنے رکھ دیتے ہیں۔ وہ خالص آرٹسٹ ہیں اور اپنی تخلیقات سے انھیں اسی حد تک سروکار ہے کہ وہ اِس نہاں خانہ محسوسات سے نکل کر لباس اظہار پہن لیں۔ وہ ذریعہ اظہار یعنی زبان اور الفاظ کی نسبت بھی ایک انفرادی بلکہ خودسرانہ رویہ رکھتے ہیں۔

چودھری صاحب کا میدان تنگ و تاز اودھ کی قصباتی فضاء اور اس کی نرم رو زندگی ہے۔ اس فضاء میں انھوں نے اپنی ذاتی زندگی کے کم و بیش ستر سال گزارے ہیں۔ اور یہ ایک فطری بات تھی کہ وہ اپنی فنی کارناموں میں اسی فضاء کا عکس پیش کریں۔ دنیا میں جتنے بڑے فنکار گزرے ہیں سب نے ایسا ہی کیا ہے۔

محمد علی کو بصارت کے ساتھ بصیرت بھی ارزانی ہوئی ہے، وہ مصور محسوسات ہونے کے ساتھ ساتھ ایک زیرک ماہر نفسیات بھی ہیں، اسی لیے آپ دیکھیں گے کہ ان کی بیشتر تخلیقات علم النفس خصوصاً اس کے جنسی پہلو کے بیش بہا مطالعات اور دستاویزات کی حیثیت رکھتی ہیں۔

چودھری صاحب کا سا پیرایہ بیان ہمارے عہد کے کسی افسانہ نگار کو نصیب نہیں ہوا، حقیقت پروری اس پر نثار اور دلنوازی اس پر تصدق۔ اس کے لیے انھیں کوئی اہتمام نہیں کرنا پڑتا، زندگی اپنی بوقلمونی کو لیے ہوئے ان کے پیچھے پیچھے بھاگتی ہے اور فنکار محمد علی جب کبھی اس کا جی چاہتا ہے اور جو کچھ جی چاہتا ہے اس کے دامن سے مٹھیاں بھر بھر کے لے لیتا ہے...... ان کی تقریباً تمام کہانیاں کسی حقیقی واقعے پر مبنی ہیں اور سارے کردار وہی ہیں جو ان کے چاروں طرف چلتے پھرتے ہیں۔

چودھری صاحب کے بارے میں سجاد ظہیر نے لکھا ہے:

"وہ اردو لکھتے ہیں تو اس میں وہ لوچ اور لطیف طنز ہوتا ہے جس سے پرانے لکھنؤ کی مہک آتی ہے۔ باتیں کرنے پر آتے ہیں تو جنسیات اور نفسیات کے ماہرین فرائڈ اور ہیلاک ایلس ان کی زد میں ہوتے ہیں، بزرگوں اور بڑوں کے درمیان ہوتے ہیں تو ان سے آخرت، جائداد اور اولاد کا تذکرہ کریں گے، اور نوجوانوں میں ہوں گے تو جنسیات کے مسائل پر ایسی محققانہ گفتگو کریں گے کہ بڑے بڑے رنگین مزاجوں کی آنکھیں کھل جائیں...... ان کی شخصیت کی اسی ہمہ گیری نے انھیں اردو کا پہلا اسٹائلسٹ افسانہ نگار ہونے کا درجہ بخشا ہے"

'گناہ کا خوف' اور کشکول محمد علی شاہ فقیر میں ان کی تمام کہانیاں اس اعتبار سے منفرد ہیں کہ ان سب میں خارجی محسوسات کو داخلی تجربات کی سی حیثیت حاصل ہوجاتی

ہے۔ قرۃ العین حیدر نے ان کی کہانیوں کے بارے میں بہت صحیح کہا ہے کہ چودھری صاحب کے یہاں قصے کہانی اور ان کے کردار خیالی یا فرضی نہیں ہیں، یہ ہماری رچی بسی عوامی زندگی کی جیتی جاگتی تصویریں ہیں۔ یہ حکایتیں جزئیات نگاری کا شاہکار ہیں۔ لکھنے والے نے انھیں انتہائی ہمدردی، یگانگت اور بڑے خلوص کے ساتھ اپنے پڑھنے والوں سے متعارف کرایا ہے۔

چودھری صاحب کی کہانیوں کا ایک نمایاں عنصر بلاشبہ جنسیات کا ہے مگر یہ نہ تو لذت کوشی ہے اور نہ ہی لذت فروشی۔ جنس کا یہ عنصر محمد علی کے یہاں ہمیشہ ایک داخلی اور نفسیاتی حوالے کے ساتھ ہوتا ہے۔

ان کہانیوں میں غالباً پہلی بار ہمیں حقیقت نگاری اور رومان انگیزی دونوں کا ایک خوبصورت اور معنی خیز امتزاج نظر آتا ہے۔ ان کے ہم عصروں کے یہاں یہ رجحان ناپید ہے۔

ان کہانیوں کی ایک دوسری خصوصیت مٹتی ہوئی تہذیبی اقدار ہیں بالخصوص اودھ کی قصباتی زندگی کے پس منظر میں۔ اسلوب نگاری میں پروقار ظرافت اور گوارا شوخی کو دیکھ کر انھیں اگر اردو کا شائستہ ترین طنز نگار کہا جائے تو شاید بے جا نہ ہوگا۔ مکالمہ اور بیانیہ دونوں پر انھیں غیر معمولی عبور حاصل ہے۔ زندگی کی تصویر کشی میں وہ ایک طرف معتبر ماہر نفسیات نظر آتے ہیں تو دوسری طرف زندگی کی زیریں سطح پر مٹتی ہوئی تہذیب کے بامعنی نوحہ گر۔

ہمارے لیے ان کہانیوں کی معنویت اس لیے اور بھی بڑھ جاتی ہے کہ چودھری محمد علی کا ذہن تجسس، فکر اور جمالیاتی بصیرت سے پر ہے اور بات کہنے کا ان کا بے باک اور بے ٹوک انداز جدید ترین رویّوں کی غمازی کرتا ہے۔ (ماخوذ)

مسعود الحق

از

جناب چودھری محمد علی صاحب رئیس ردولی

مینیجر صدیق بک ڈپو لکھنؤ

نے

صفحات تعارف [illegible]

نامی پریس لکھنؤ میں چھپوا کر شائع کیا

بار اول ۱۰۰۰ جلد

سنہ [illegible]

سرورق اشاعت اوّل کا عکس

عرضِ مرتّب

'کشکول محمد علی شاہ فقیر' پہلی بار 1951 میں منیجر صدیق بک ڈپو لکھنؤ نے نامی پریس لکھنؤ میں چھپوا کر شائع کی۔ اس مجموعے کا خیال غالباً چودھری صاحب کے وقتاً فوقتاً ضبط تحریر میں آئے ہوئے متفرقات کو یکجا کردینے کی خواہش سے پیدا ہوا۔ یہ متفرقات غالباً ملک کے مختلف رسائل میں شائع ہوتے رہے۔ متنوع موضوعات پر ان کی ایسی پہلی مختصر تحریر میں نے بہرحال سب سے پہلے ڈاکٹر سید عابد حسین کی زیرادارت جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی سے 1948 میں نکلنے والے ہفتہ وار رسالے 'نئی روشنی' کے 24 فروری 1949 کے شمارے میں دیکھی تھی۔ 'نئی روشنی' میں اس سے پہلے 'کشکول' کے عنوان کے تحت مختلف حضرات کے بعض متفرقات شائع ہوتے تھے۔ 24 فروری 1949 کے شمارے سے 'کشکول' کا عنوان 'کشکول محمد علی شاہ فقیر' ہوگیا۔ اس کالم کی ابتدا ادارے کے مندرجہ نوٹ سے ہوئی تھی۔ ''یہ شاہ صاحب میدان ادب کے ایک چابک دست شہسوار ہیں جن کا انداز قد فقیری کے جامے میں بھی صاف پہچانا جاتا ہے''۔

نیاز فتح پوری نے 'نگار' میں لکھا تھا ''......اس کتاب کا نام فاضل مصنف نے اپنے موجودہ رجحانات تصوف کی بنا پر 'کشکول' رکھا ہے اور خوب ہے۔ لیکن غالباً 'ملفوظات محمد علی شاہ زیادہ موزوں نام ہوتا ...... وہ لکھتے نہیں بات کرتے ہیں اور ان کی ہر بات پر غالبؔ کا یہ شعر سامنے آجاتا ہے۔

بلائے جاں ہے غالبؔ اس کی ہر بات
عبارت کیا، اشارت کیا، ادا کیا

...... چودھری صاحب شمالی ہند کے اُس کلچر کا نمونہ ہیں جس کے دیکھنے کو آج آنکھیں ترستی ہیں۔ وہ نوجوانوں، بچوں اور بوڑھوں میں ہر جگہ اپنی جگہ پیدا کرلیتے ہیں

اور ہر شخص متمنی رہتا ہے کہ وہ کچھ کہیں اور ہم سنیں۔ پھر ان کی گفتگو فضول وقت گزاری نہیں ہوتی بلکہ وہ اس میں ایسے ایسے نفسیاتی اور ادبی نکتے بیان کر جاتے ہیں کہ سن کر لطف آجاتا ہے۔ یہ کتاب ایسے ہی نوادر سے لبریز ہے"۔

(ہما بیگم کے نام خط میں حوالہ: گویا دبستان کھل گیا)

فہرست

اِنتساب

میرے بچّوں کے نام جو اِس بُڑھاپے میں
مجھ سے دور دور جا پڑے

مصنّف

تعارف از صلاح الدین احمد

(از جناب صلاح الدین احمد صاحب بی۔اے ایڈیٹر ادبی دنیا لاہور)

محمد علی رُدولوی
اُردو کا اوّلین فطرت نگار

انیسویں اور بیسویں صدی کے سنگم پر ہماری زبان میں دو ایسے لکھنے والے نمودار ہوئے جنھوں نے اپنے بیان کی شستگی اور اظہار کی سلاست اور ادائے مطالب کی بے مثال صلاحیتوں سے اردو کی حُدود کو حدِ نظر تک پھیلا دیا اور عوام کو پہلی بار نہ صرف اعلیٰ درجے کی نثر سے لطف اندوز ہونے اور فائدہ اٹھانے کا موقع دیا، بلکہ اُس رشتے کی تخلیق کی جو مصنف کے قلم کی لرزش کو جمہور کے دل کی دھڑکن سے ہم آہنگ کر کے ادب کی ایک لازوال خدمت انجام دیتا ہے۔ یہ دونوں اپنے اپنے رنگ میں منفرد تھے اور اگرچہ بنیادی طور پر ان میں ایک یک جہتی پائی جاتی تھی، لیکن دونوں اسالیب نگارش اپنی علاحدہ علاحدہ امتیازی حیثیت بھی رکھتے تھے۔ نہ صرف یہ، بلکہ دونوں کے کام کے میدان بھی جدا جدا تھے۔ ایک اگر خارجی دنیا کے میدانِ ناپیدا کنار کا شہسوار تھا تو دوسرا دریائے دل کی گہرائیوں کا غوطہ زن۔ ایک اگر ابلق صحافت پہ سوار، جادۂ ادب کی نئی نئی منزلیں طے کر رہا تھا تو دوسرا مجلسِ احباب میں تکیہ لگائے اپنی موہنی کے عمل سے دلوں کے قلعے تسخیر کیے چلا جا رہا تھا۔ اتفاقِ زمانہ دیکھیے کہ ایک نے کم و بیش چالیس برس ہوئے اپنی بساطِ عمل تہہ کر کے رکھ دی اور دوسرا جس آہستگی اور خاموشی سے اس میں داخل ہوا تھا، آج بھی اُس کے پُر بہار راستوں پر اسی طرح دبے پاؤں چل رہا ہے۔ اور اپنی اس سیر صبح گاہی میں کبھی کبھی ہمیں بھی شریک کر لیتا ہے۔ ناظرین! ان میں سے ایک کا نام عبدالقادر اور دوسرے کا نام محمد علی ہے۔ وہ دونوں ہم سن ہیں۔ اور خدا کرے کہ ایک عرصۂ دراز تک اس زندگی میں ہم سن ہی رہیں۔

اردو ادب کا کوئی سنجیدہ طالب علم عبدالقادر کی ساحرانہ سلاست سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ وہ سہلِ ممتنع لکھتے ہیں اور اپنی آسان نگاری میں بڑی بڑی نازک باتیں نہایت صفائی اور صحت کے ساتھ سامنے لے آتے ہیں۔ اسی طرح محمد علی جب اپنے عروج پر پہنچتے ہیں تو بُوانصیبن یا امامن مہری کی زبان میں نفسیات انسانی کی وہ گتھیاں سلجھا کے رکھ دیتے ہیں کہ ناظر ششدر رہ جاتا ہے۔ مطالب کے لحاظ سے دونوں میں بنیادی فرق یہ ہے کہ عبدالقادر کا موضوع بیشتر خارجی ہوتا ہے اور وہ خارج سے داخل کی طرف بالعموم رجوع نہیں کرتے، بلکہ اپنی بیرونی دنیا کے مسائل و مناظر ہی میں کھو جاتے ہیں۔ اس کے خلاف محمد علی اگرچہ اپنے افسانوں اور خاکوں کی بنیاد بیشتر محسوسات خارجی ہی پر رکھتے ہیں، اور وہ جو کچھ اپنی ظاہری آنکھوں سے دیکھتے ہیں وہی کچھ عین مین ہمیں دکھانے کی کوشش کرتے ہیں، لیکن اپنے موضوع کی طرف ان کی پیش قدمی خالصتاً داخلی اور نفسیاتی ہوتی ہے اور اکثر ایسا ہوتا ہے کہ وہ اپنے ناظر کا ہاتھ پکڑے ایک نامحسوس انداز میں اُسے اس دنیائے سنگ و خشت سے نکال کر، اس عالم خیال میں لے کر اتر جاتے ہیں، جن کی رنگینی، حقیقت کی عُریاں سادگی سے آنکھیں ملاتی ہے اور مجوب نہیں ہوتی۔ محمد علی حقیقت پرستی اور خیال آفرینی کا ایک بے رحمانہ امتزاج پیش کرتا ہے، اور از بسکہ وہ اپنے مشاہدے میں صداقت سے کبھی آنکھیں نہیں چراتا، اور اپنے بیان میں تخیل کی باگیں کبھی ڈھیلی نہیں چھوڑتا، اور اس لیے اُس کا پیش کردہ امتزاج فنی ادب میں ایک نہایت صحت مند معیار کا درجہ رکھتا ہے۔ اور اس معیار پر بہت کم فن کاروں کی تخلیقات پوری اترتی ہیں۔ عبدالقادر سے میں نے اس کا مقابلہ محض اس کی سلاستِ زبان اور لطافتِ بیان کے پیش نظر کیا ہے۔ ورنہ یہ مخفی نہیں کہ دونوں کے میدان اور میلان بالکل مختلف ہیں۔ عبدالقادر افادی ادب کے بہت بڑے معمار ہیں۔ اور انھوں نے بیانیہ نثر کا ایک بے نظیر اور ترقی پذیر اسلوب ہماری زبان کو بخشا ہے۔ وہ فنی ادب سے چنداں دل چسپی نہیں رکھتے اور ان کا موضوع انسان نہیں بلکہ وہ عالم ہست و بود ہے جس میں انسان رہتا ہے۔ ظاہر ہے کہ ایسی صورت میں نھیں فنی ادب اور اس کی مقتضیات سے چنداں واسطہ نہیں ہوسکتا۔ اس کے خلاف محمد

علی کا موضوع بیشتر صورتوں میں خود انسان اور اس کا وہ جہان خیال ہے جس میں وہ اس مختصر زندگی کے چند لمحے بسر کرتا ہے۔ اس سے یہ نہیں سمجھ لینا چاہیے کہ ان کی تخلیقات بیشتر ان کی تخیل کی مرہون ہوتی ہیں۔ یا وہ اُن کی تعمیر کا مسالہ سراسر اس دنیائے داخلی سے حاصل کرتے ہیں جو ان کے اپنے ذہن رسا میں آباد ہے۔ نہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ اگرچہ محمد علی اپنے فکر کو زیادہ تر افسانے کا لباس پہناتے ہیں اور اپنے افسانوں میں نفسیات انسانی کے بعض نازک ترین پہلوؤں کو بھی بے نقاب کر جاتے ہیں۔ لیکن اس میں قطعاً کلام نہیں کہ وہ بنیادی طور پر مفکر نہیں بلکہ خالص افسانہ نگار ہیں۔ وہ آپ کو اس لیے کہانی نہیں سناتے کہ اس کے ذریعے سے وہ اپنی فکر کی کسی کاوش یا اپنے تخیل کی کسی گرفت کا اظہار چاہتے ہیں۔ بلکہ وہ اس لیے سناتے ہیں کہ انھیں اسے سنائے بغیر چارہ نہیں اور اگر وہ نہ سنائیں تو شاید بیمار ہو جائیں۔ وہ نہ تو نذیر احمد کی طرح کسی معاشرتی اصلاح کے علمبردار ہیں، نہ پریم چند کی مانند سماج کے بعض انوکھے تقاضوں کے ناز بردار۔ اور نہ انھیں ہمارے ترقی پسند دوستوں کی طرح جسم فروش یا مزدور طبقے کے مسائل کا کوئی افسانوی حل تلاش کرنے کی مجبوری ہے۔ میری ناچیز رائے میں وہ زندگی کے محض ایک خوش نظر تماشائی ہیں کہ اس کے پُر رونق بازار میں سے اس کی رنگا رنگ کیفیتوں کا جائزہ لیتے ہوئے خراماں خراماں چلے جا رہے ہیں۔ اور جہاں کہیں ان کی نگاہ کسی دلچسپ چیز پر پڑتی ہے وہ ایک لمحہ کے لیے رک کر اُسے نظر بھر کر دیکھ لیتے ہیں۔ اور پھر آگے بڑھ جاتے ہیں۔ یہ دوسری بات ہے کہ ان کی نگاہ کیوں اور کہاں رکتی ہے اور اس انتخاب کے عناصر کیا کیا ہوتے ہیں۔ ان عناصر کا ایک ہلکا سا جائزہ ہم آگے چل کر لیں گے، یہاں مجھے صرف اس امر کا اظہار مقصود ہے کہ محمد علی کسی مقصد یا نظریے کی تبلیغ کے لیے کوئی کہانی بنا کر ہمیں نہیں سناتا، نہ اپنے کسی تخیل پارے کو پھیلا کر افسانے کے لباس میں پیش کرتا ہے بلکہ وہ زندگی کا ایک زیرک طالب علم ہے۔ اور اس کے مطالعے میں جو غیر معمولی یا لطیف یا مضحکہ انگیز صورتیں اس کے سامنے آتی ہیں یا اپنے طویل مشاہدے اور تجربہ کی پناہ پر وہ زندگی کی مختلف کیفیتوں سے جن نتائج کا استخراج کرتا ہے ان صورتوں اور نتائج کو وہ ایک

نہایت لطیف و بلیغ پیرائے ہیں، کہ سلاست و رنگینی سے بہ یک وقت متصف ہوتا ہے ہمارے سامنے رکھ دیتا ہے۔ اور پھر اس بات سے قطعاً بے نیاز ہوجاتا ہے کہ ہم اس کی پیش کش سے کس طرح متاثر ہوتے ہیں۔ وہ ایک خالص آرٹسٹ ہے، اور اسے اپنی تخلیقات سے یہیں تک سروکار ہے کہ وہ اس نہاں خانۂ محسوسات سے نکل کر لباسِ اظہار پہن لیں۔ رہا یہ کہ ہم ان کے جمال جہاں آرا سے کیا اثر قبول کرتے ہیں، اس سے اسے کوئی غرض نہیں۔ اس کا یہ اندازِ نظر اپنے موضوع تک ہی محدود نہیں بلکہ وہ اس کے ذریعہ اظہار یعنی زبان اور الفاظ کی نسبت بھی ایک انفرادی بلکہ خودسرانہ رویہ روا رکھتا ہے۔ وہ اس بارے میں کسی سمجھوتے کا بھی قائل نہیں اور وہ ایک مخصوص ذہنی کیفیت کو عین وہی الفاظ دینے پر اصرار کرتا ہے، جن میں وہ اُس پر وارد ہوئی اور اگر آپ قبول عام یا رواجِ ادب یا خوفِ محتسب کے پیشِ نظر اُسے کسی متبادل لفظ یا ترکیب کی طرف متوجہ کریں، تو وہ اُسے سو میں سے نوے صورتوں میں رد کر دے گا اس سلسلے میں مجھ سے چودھری صاحب کی متعدد جھڑپیں ہوئیں، اور اگرچہ انھوں نے میرے ادارتی اختیارات سے مجبور ہو کر اکثر میری بات مان لی، لیکن کس طرح مانی، یہ ان کا دل ہی جانتا ہے۔ دو ایک موقعوں پر البتہ وہ میری ترمیم سے خوش بھی ہوئے لیکن یہ مواقع بہت شاذ تھے۔ تو اس سے ان کے خالص فنی زاویۂ نگاہ کا پتہ چلتا ہے۔ فن کار اپنی غیر مرئی محسوسات کو لباسِ اظہار پہناتا ہے، اولاً اس لیے کہ وہ اس کے لیے اپنے آپ سے مجبور ہے اور ثانیاً اس لیے کہ وہ قدرت کی طرف سے تقسیم مسرت کی خدمت پر مامور ہے مسرت کی تقسیم کا اندازہ وہ خود مقرر کرتا ہے۔ اور اس بارے میں اسے کسی تعلیم یا تلقین کی ضرورت نہیں۔ فن کی منزلِ اصلی یہی ہے، اس سے آگے جو راستہ جاتا ہے وہ تصنع آورد مصلحت، اصلاح، تبلیغ اور پروپیگنڈے کی پستیوں میں اتر جاتا ہے۔

محمد علی کا میدانِ تگ و تازہ اودھ کی قصباتی فضا اور اس کی نرم رو زندگی ہے۔ اس فضا میں اس نے اپنی ذاتی زندگی کے کم و بیش ستر برس گزارے ہیں۔ اور یہ ایک فطری تقاضا تھا کہ وہ اپنے فنی کارناموں میں اسی فضا کا عکس پیش کرے۔ دنیا میں جتنے بڑے فن کار گزرے ہیں، سب نے ایسا ہی کیا ہے اور جب تک ادب میں خالص فن

کی قدریں باقی ہیں۔ ایسے ہی فن پاروں کو عظمت و عزّت کے وہ مقامات حاصل رہیں گے، جو فطری طور پر ان کا حق ہیں۔ آپ میں سے جن حضرات نے والٹر سکاٹ کا ''آئی ون ہو۔'' پڑھا ہے یا ایمیلی برانٹی کی ''وودرنگ ہائٹس'' یا گورکی کی ''ایک خزاں کی رات،'' یا موپساں کی ''سکیپ گوٹ'' یا کالی داس کی ''شکنتلا'' کا مطالعہ کیا ہے یا شرت چندر کا ''اناپورنا کا مندر'' دیکھا ہے، ان سے میں یہ سوال کرنا چاہتا ہوں کہ اپنے مطالعے کے استغراق میں کیا انھوں نے یہ محسوس نہیں کیا کہ وہ کسی طلسمی جھولے میں بیٹھ کر خود اس دنیا میں پہنچ گئے ہیں، جس دنیا میں ان کا داستان گو سانس لے رہا ہے۔ وادیٔ نربدا کے کسی لہلہاتے ہوئے جنگل کی معطر گپھائیں ہوں، یا شمالی برطانیہ کے ویران پہاڑی قلعوں کی سنگین اور کپکپاتی ہوئی نیم روشن خلوتیں، ہمارے حواس ظاہری نے دونوں میں سے کسی ایک کو محسوس نہیں کیا لیکن فن کار کی طلسمی چھڑی کی ایک ہی جنبش سے ہم چشم زدن میں ان فضاؤں میں جا پہنچے ہیں۔ اور ان رومانوں اور کہانیوں کے کرداروں کے دل کی دھڑکنیں ہمارے اپنے دل کی دھڑکنوں سے ہم آہنگ ہو جاتی ہیں۔ اور ہیرو کی آنکھوں کی چمک اور ہیروئن کے سانس کی خوشبو ہمارے کلبۂ ذہن اور مشامِ جان میں سرایت کر جاتی ہے۔ اور ہم ان کے رنج و راحت کے شریک اور ان کے حاضر غائب کے رفیق بن جاتے ہیں۔

اس کے خلاف آپ نے بیسیوں ایسے افسانے ملاحظہ کیے ہوں گے اور درجنوں ایسی کہانیاں پڑھی ہوں گی جو آپ کو بس یونہی چھوتی ہوئی سی گزر جاتی ہیں اور آپ کے دل، یا دماغ پر اپنا کوئی نقش دیرپا نہیں چھوڑتیں۔ افسانے کی ان مختلف صورتوں میں فرق یہ ہے کہ اول الذکر کا خالق اپنی تخلیق کے عناصر میں کسی مقصدِ خاص کو شامل نہیں کرتا۔ وہ جس طرح کی زندگی کو دیکھتا ہے۔ جس طرح اسے محسوس کرتا ہے، عین اسی طرح اسے اپنے تصور کے خلوص اور اظہار کی شدّت کی تائید سے ہم تک منتقل کر دیتا ہے۔ اور اس عملِ انتقال میں وہ اہلیتِ کم یاب جو اُسے ارزانی ہوئی ہے، اور جسے ہم فن کا نام دیتے ہیں، بروئے کار آتی ہے۔ اور اظہار محض کو حسنِ اظہار سے آراستہ کرتی اور سخنِ سادہ کو گرمیٔ گفتار عطا کرتی ہوئی اپنی منزل کو جا لیتی ہے۔ دوسری قسم کی تصانیف

ان صاحبوں سے نسبت رکھتی ہیں، جو فن کار نہیں بلکہ محض کاری گر ہوتے ہیں اور وہ ایک دیے ہوئے نمونے پر گاہک کے حسبِ منشا اس کے کام کی چیز تیار کر دیتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ ایسی مصنوعات سے زندگی کے ادنیٰ اور معمولی کام تو لیے جا سکتے ہیں۔ لیکن وہ شئے لطیف جسے اہتزازِ نفس اور بالیدگیٔ روح کا منبع کہیے اور جو سوز و ساز کی ہمہ رنگ کیفیتوں سے ہم آغوش ہوتی ہے، ان کاریگروں کے تصور سے بھی ماورئی رہتی ہے۔ اور عنقا کی طرح ان کی پست بستیوں پر اپنا سایہ بھی نہیں ڈالتی۔

اردو کے فن کار ادیبوں میں جو مادرِ فطرت کے آغوش میں پلے اور بڑھے ہیں اور جن کی سحر بیانی اسی کے سہانے بولوں کی مرہون اور جن کی فکر و دانش اسی کی بتائی پہیلیوں کی ممنون ہے۔ محمد علی ایک یکتا اور ممتاز حیثیت رکھتے ہیں۔ میں نے یکتا کا لفظ پورے ارادے اور ذمّے داری سے استعمال کیا ہے۔ وہ اس لحاظ سے یکتا ہیں کہ وہ اپنے ذاتی مطالعے کی حدود سے کبھی باہر نہیں جاتے وہ اس اعتبار سے منفرد ہیں کہ وہ بنیادی طور پر ایک قصہ گو ہیں۔ اور ان کا کوئی قصہ کسی اڑتے ہوئے جذبے یا کسی اُبلتی ہوئی تحریک سے جنم نہیں لیتا۔ بلکہ ہمیشہ ان کے کسی خیال افروز مشاہدے یا اضطراب انگیز سے جنم نہیں لیتا۔ بلکہ ہمیشہ ان کے کسی خیال افروز مشاہدے یا اضطراب انگیز مطالعے کا نتیجہ ہوتا ہے اور وہ اس حیثیت سے بھی ایک امتیاز خاص کے مالک ہیں کہ وہ من و تو کی حدود کو ایک بے مثال شان بے تکلفی سے عبور کر کے اپنے ناظر سے اس طرح گھل مِل جاتے ہیں گویا وہ خود قصہ نہیں لکھ رہے بلکہ وہ اور ان کا پڑھنے والا دونوں، ہاتھ میں ہاتھ دیے، اُس قصّے میں سے روحانی طور پر گزر رہے ہیں۔ یہ کیفیت ہمارے یہاں اُنھیں سے خاص ہے۔ میری اس گزارش سے یہ غلط فہمی نہیں ہونی چاہیے کہ وہ زندگی کے محض ایک چابک دست عکاس ہیں ہرگز نہیں۔ زندگی کی تصویر کھینچنے کے ساتھ ساتھ وہ اس تصویر میں بڑے لطیف اور نادر رنگ بھی بھرتے جاتے ہیں۔ اور یہ رنگ اپنی شوخی، ان کی شوخیٔ طبع اور سُرخی، ان کے خونِ دل سے مستعار لیتے ہیں، زندگی کا ہر کامیاب مصور ایک دیدہ بینا کے ساتھ ایک چشم باطن سے بھی بہرہ یاب ہوتا ہے۔ محمد علی کو بصارت کے ساتھ بصیرت بھی ارزانی ہوئی ہے وہ ایک نادرہ کار

مصوّرِ محسوسات ہونے کے ساتھ ساتھ ایک زیرک ماہر نفسیات بھی ہیں۔ اور ان کے بیشتر افسانے علم النفس، خصوصاً اس کے جنسی پہلو کے بیش بہا مطالعات اور دستاویزات کی حیثیت رکھتے ہیں۔ زندگی کی تصویر کشی وہ نہایت اخلاص سے کرتے ہیں۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ اس کا پس منظر بھی نمایاں کرتے ہیں اور اس کی پہیلیوں کا حل بھی بتاتے ہیں حقیقتاً وہ تصویر کشی کے لیے بھی زندگی کا وہی پہلو چنتے ہیں جس میں کوئی نفسیاتی خصوصیت پائی جاتی ہو۔ اس لیے ان کی تصویریں سپاٹ نہیں ہوتیں بلکہ وہ ناظر کے حواس پر چھا جاتی ہیں اور بیشتر اوقات اس پر حملہ بھی کر بیٹھتی ہیں اور اس کے پندار کو چھلنی چھلنی کر دیتی ہیں۔ مثلاً ان کے ناظرین میں کوئی ادھیڑ عمر کی صحت مند بیوہ ہو جب ان کے افسانے ''دھوکا'' میں ناظمہ اور اُس کے اندر والے کا مکالمہ پڑھتی ہے تو بجز اس کے کہ وہ اپنا منہ نوچ لے یا سر پیٹ لے اور کیا کر سکتی ہے، زیادہ سے زیادہ یہی کہ کہانی کو دیا سلائی دکھا دے اور جائے نماز بچھا کر ستر نفلوں کی نیت باندھ لے۔ اب آپ مضطرب ہوں گے کہ میں اس مکالمے کی ایک جھلک آپ کو یہیں دکھا دوں اس لیے پہلے ہی سے تعمیل ارشاد کیے دیتا ہوں۔

صغیر کے چلے جانے کے بعد ناظمہ بیگم کے دل کے اندر کوئی ان سے باتیں کرنے لگتا تھا۔

''سنیے صاحب۔ میں کہانی لکھتا نہیں ہوں کہانی کہتا ہوں۔ اگر آپ کو اس میں دُوبدُو باتیں کرنے کا مزا نہیں آتا تو اس کو دور دفان کیجیے۔ اگر اچھی معلوم ہوتی ہو تو سنتے جایئے کہ ناظمہ بیگم صاحبہ کی سلیم عقل نے کیا کہا۔ اُن کی دبی ہوئی خواہش نے کیا کہا۔ اور ان کی حِس باطن نے عقل و خواہش سے کیا کچھ کہلایا:

اندر والا: سنو بی بی ناجو! تم اور صغیر (یہ ان کے ہمدرد کا نام ہے) پردے سے ملے، گھڑیوں باتیں کیا کرتے ہو، اور جو کوئی کچھ کہہ دے۔

ناجو: مجال ہے جو کوئی کچھ کہہ دے۔ کرنہیں تو ڈر کس کا۔ بھلا مجھ سے آٹھ برس چھوٹا اور پھر وہ تو مجھ کو چچی کہتا ہے۔

اندر والا: یہ تو ٹھیک ہے مگر تم جب دیکھو اس کی بی بی کا ذکر کیوں کرتی ہو۔

ناجو : تو اس میں کیا حرج ہے، اگر میرے خیال دوسرے ہوتے تو اس کی بی بی نگوڑی کا ذکر کیوں آتا۔

اندر والا : تم ہنسنے زیادہ لگی ہو۔

ناجو : ہنسی آتی ہے تو کوئی کیا کرے۔

اندر والا : پہلے کیوں نہیں ہنستی تھیں۔ ہنسی تو پھنسی پرانی مثل۔

ناجو : ہوا کرے مثل اپنے بڑھے پر سے ہزاروں جوان صدقے اتارے ہیں۔ خیر اب اس کا ذکر ہی کیا جب جوانی میں اس طرح کے خیالات نہیں آئے تو اب بڑھاپے میں اس کا ذکر کیا ہے۔

اندر والا : بوڑھی تو تم بالکل نہیں ہو، اس کو تم بھی سمجھتی ہو۔

ناجو : میرے تو ایک لڑکا بھی ہوا ہے۔ اس کی بیوی تو ویسی ہی پٹھیا ہے۔

اندر والا : مگر وہ صورت میں تو تمھارے تلووں کے برابر نہیں ہے۔

ناجو : یہ تو ٹھیک ہے مگر اس سے ملاپ تھوڑی ہونے کو ہے۔

اندر والا : اور جو ہو جائے۔

ناجو : ہو جائے تو ہماری جوتی سے لتر سے، پاپوش سے۔ مگر نہ ہوتا تو اچھا تھا۔

اندر والا : یہ دیکھو کھلانا۔ یہی تو میں کہتا تھا۔

ناجو : ہوگا بھئی۔ ہم کیا کریں نیند نہیں آتی تو یہی سوچنے لگتے ہیں۔ کوئی نہ کوئی خیال آئے گا ضرور۔

اندر والا : اور اسی کو سوچتے سوچتے سو بھی تو جاتی ہو۔

ناجو : ہاں سو جاتے ہیں، تب نہیں تو اب سو جاتے ہیں۔ منصرم صاحب تو ہیں نہیں۔ ہمیں ڈر کس کا پڑا ہے۔ کر ہی لیں تو ہمارا کوئی کیا کر لے گا۔

اندر والا : ہاں۔ اب ٹھیک راستے پر آگئیں۔ یہی تو میں کہتا تھا کہ جو کچھ کرو ہم سے صلاح مشورہ لے کر کرو۔ ہم تمھارے ساتھ ہیں۔ واقعی اگر صغیر کے ساتھ ہو جائے تو بیجا نہیں۔ گو اور سب باتوں کا آرام رہا مگر ہم سن کو جی ترس گیا۔

اور پھر اس کے بعد کہانی جس موڑ سے گزرتی ہے ہمیں اس وقت اس سے غرض نہیں لیکن لگے ہاتھوں اُس افراتفری کی بھی ایک جھلک دیکھتے چلیے جو صغیر کے بامراد ہونے کے بعد اس کے دل میں اسی اندر والے نے مچائی۔

صغیر احمد نے ناظمہ کی جھلک یونہی کبھی دیکھ لی ہوگی۔ اب بامراد دیکھا۔ وہ صورت شکل، وہ رعب حُسن وہ تناسب اعضا، وہ مزاج کی شگفتگی۔ اور یہ ٹھہرے بھوکے بنگالی۔ آنکھوں میں چربی چھائی ہوئی۔ ساون کے اندھے کو ہرا ہی ہرا سوجھتا ہے۔ ایسے میں سِن کا فرق کس کو دکھائی دیتا۔ (واضح رہے کہ ناظمہ بتیس برس کے پیٹے میں تھی اور صغیر ان سے آٹھ برس چھوٹا) البتہ دو چار برس کے بعد کچھ کچھ فرق معلوم ہونے لگا۔

صغیر: بڑی پیاری چیز تقدیر سے ہاتھ آگئی ہے۔ ہاتھ پاؤں کے گوشت میں وہ سختی نہیں ہے تو اس سے کیا ہوتا ہے۔ اور کسی بات میں بڑھاپا تو نہیں ہے۔

اندر والا: بڑھاپا تو نہیں ہے۔ مگر وہ پنڈے کا کساؤ کہاں ہے۔

صغیر: اجی محبت اصل چیز ہے۔ پنڈا ونڈا کہاں رہتا ہے۔

اندر والا: محبت الگ چیز ہے، جوانی الگ ہے، ان دونوں کو ملاتے کیوں ہو۔

صغیر: جوانی گے دن کی چیز ہے، محبت تو ہمیشہ کی ہے۔

اندر والا: ہے تو ہمیشہ کی، مگر جوانی میں بھی مقناطیس کا اثر ہے۔

صغیر: محبت کا لوہا مقناطیس کو نہیں مانتا۔

اندر والا: اس سے کس کو انکار ہوسکتا ہے۔ محبت جیسے پلاؤ اور جوانی جیسے بیسنی روٹی۔ ہم مانتے ہیں کہ پلاؤ پلاؤ ہی ہے۔ بیسنی بیسنی ہی ہے۔ مگر کیا روز روز پلاؤ کھا کر کبھی کبھی بیسنی کو جی نہیں چاہتا؟ وہ بیسنی والی سنداہٹ تو تمھاری پہلی بی بی ہی میں ہے۔

صغیر: میں نے کہہ دیا ہے کہ اور جو باتیں جی چاہے کیا کرو ہماری اس بی بی کا نام ہمارے سامنے نہ آوے۔

اندر والا : ارے میاں تمھاری بی بی سے ہم سے مطلب! ہم تو جوان عورت کا خواب دیکھتے ہیں۔ وہ تمھاری بیوی ہو یا کوئی اور ہو۔ تمھاری بیوی کا نام تو اس وجہ سے آیا کہ وہاں تک پہنچ آسان ہے اور کوئی بات نہیں۔

صغیر : یار یہ تو ہے، مگر ناظمہ غریب کی چھاتی پھٹ جائے گی۔ اور مجھ کو چین نصیب نہ ہوگا۔

اندر والا : خیر چھاتی واتی تو کیا پھٹے گی، مگر ہے بڑی سخت بات، اور غضب تو یہ ہے کہ بغیر اس کے بھی پیاس بجھتی معلوم نہیں ہوتی۔

صغیر : یار تو پھر کیا کریں۔

اندر والا : کرو گے کیا، ملاپ کرو۔

صغیر : اور ناظمہ کو کیا کریں۔ اس سے چار آنکھیں کیسے کریں گے۔

اندر والا : سب کچھ ہوجائے گا۔ سنو میاں! ہم ہوں، کہ تم ہو، کہ ناظمہ ہوں، سب ٹھہرے حکم کے بندے حِس باطن کے۔ وہاں سے جو ارشاد ہوگا وہ کرنا ہی پڑے گا۔ آپ کون سے ایسے خوب صورت تھے، کون بڑے روپے والے تھے کہ ناظمہ آپ پر ریجھ جائیں۔ حِس باطن نے کہا۔ ناظمہ! منصرم صاحب مرحوم کی صحبت میں تم اپنے ہم سِن کو ترس گئیں۔ لہٰذا تم کو حکم دیا جاتا ہے کہ صغیر کے ساتھ کرلو۔ ناظمہ نے کرلیا۔ اب تم کو حکم دیا جاتا ہے کہ ناظمہ کو بھی نہ چھوڑنا۔ مگر اپنی کم سِن بی بی سے ملاپ کرلو۔ بندگی، بے چارگی۔ تمھارا بس ہی کیا ہے''۔

بعد کے قصّے سے ہمیں مطلب نہیں۔ لیکن آپ نے ملاحظہ فرمایا، فن کار کی اپنے موضوع پر گرفت کیسی کڑی ہے، اور وہ ناظر کی توجہ کو نقطۂ مطلوب پر مرکوز رکھنے میں کیسی عظیم الشان کامیابی حاصل کرتا ہے۔ مضمون پر ایسی ماہرانہ گرفت ہر کسی کے بس کی بات نہیں۔ آپ یہ بھی محسوس فرمائیں گے کہ وہ ادائے مطالب کے لیے کم از کم الفاظ استعمال کرتا ہے، لیکن ہر لفظ معنی کی بارود سے بھرپور ہوتا ہے اور جس طرح اور جس مقام پر اسے صَرف ہونا ہے، وہ اس سے خطا نہیں کرتا۔ الفاظ پر یہ قابو اور معانی سے

یہ مفاہمت کچھ محمد علی ہی کا حصہ ہے۔ الفاظ و معانی کی یہ فن کارانہ آمیزش و آویزش خود ایک مطالعے کی طالب ہے، مگر اس وقت ہمارے سامنے مصنف کی اور بہت سے خصوصیات اپنی قطار توڑ توڑ کر سامنے آرہی ہیں۔ مثلاً یہ کہ وہ نفسیات کا ایک بہت بڑا ماہر ہونے کے علاوہ وہ جنسیات کا ایک نہایت صحت مند شارح ہے۔ تعجب ہے کہ ہمارے بیشتر بزرگوں کے برعکس، محمد علی جنسیات سے کسی قسم کی تنفر آمیز اجنبیت کا اظہار نہیں کرتے، بلکہ وہ نہایت سکون و اطمینان سے اپنے افسانوں اور خاکوں میں اس کی معمولی اور غیر معمولی، نارمل اور ایب نارمل کیفیتوں کا امتحان اور تجزیہ کرتے ہیں۔ اور وہ گھناؤنا تصور دور کرنے میں کاوش کرتے ہیں جو جنس کے متعلق اول دن سے ان کے ناظر کے دل و دماغ میں پرورش پا رہا ہوتا ہے۔ کاوش سے میری مراد یہ نہیں کہ وہ اس مقصد کو سامنے رکھ کر اس پر کوئی افسانوی ڈھانچہ تیار کرتے ہیں۔ نہیں بلکہ میرا مطلب محض اسی قدر ہے کہ ان کے موضوعات کے انتخاب میں جنس عادتاً ایک اہم حصہ لیتی ہے اور جب وہ اپنے کسی ایسے مطالعے پر قلم اٹھاتے ہیں تو اس سے وہ اپنے ناظر کے لیے کسی قسم کی لذّت کوشی کا سامان بہم نہیں پہنچاتے، بلکہ ...... زیرِ نظر مسئلے کا نہایت جچا تُلا اور صحت مند جائزہ لیتے ہیں۔ اور زندگی کے عوامل میں جنسی کارفرمائیوں کو وہی مرتبہ دیتے ہیں جن کی وہ بجاطور پر حق دار ہیں۔ ان کے یہاں ہمیں بعض دیگر لکھنے والوں کے برعکس، لذت فروشی کا سراغ تک نہیں ملتا۔ اس کے باوجود جو جنسی حقائق انھوں نے بے نقاب کیے ہیں۔ وہ اس ادنیٰ درجے کی ''جنسِ خام'' سے بدرجہا قیمتی ہیں، جو ہمارے بعض مقبول مصنفین آئے دن پیش کرتے رہتے ہیں۔ انھوں نے زندگی کا بھرپور مطالعہ کیا ہے اور از بسکہ جنس، زندگی کی ایک بنیادی کیفیت ہے اور اس کے مدّ و جزر میں ایک نہایت اہم پارٹ ادا کرتی ہے۔ اس لیے ان مشاہدات و محسوسات کے انتخاب میں بھی جو کسی فن کار کو احساس سے صورت میں انتقال کے وقت درپیش ہوتا ہے۔ جنس اپنا پورا حصہ لیتی ہے یہاں تک سب لکھنے والے برابر ہیں۔ لیکن اس سے ایک قدم آگے بڑھیں تو ایک تنہا لغزش پا سارا فرق پیدا کردیتی ہے۔ لذّت کوش جنس فروش علاحدہ ہوجاتے ہیں۔ اور وہ فن کار علاحدہ جو جنس کو دیگر عطیات وہبی کی

طرح قدرت کی ایک مقدس اور دل کشا امانت سمجھتے ہیں۔ اور اُسے سفلیات سے ہم صحبت اور آلودہ نہیں ہونے دیتے۔ محمد علی فن کاروں کے اس ثانی الذکر گروہ سے تعلق رکھتے ہیں۔ اور ہماری زبان میں بے عیب جنسی کہانیاں لکھنے میں ان کا کوئی ہمسر نہیں ہے۔

آنکھوں کی زبان، تیسری جنس، دھوکا۔ اور ان کا طویل مطالعۂ ''جنس'' جس میں کنواری مِس ہیلن اور گنجفہ کھیلنے والی رنڈی اور مچھلی والی سے روزانہ مار کھانے والے انسپکٹر صاحب بڑے کینڈے کے کردار ہیں۔ نفسیات ''جنس'' کے نہایت بیش بہا اور نادر نمونے ہیں جو براہِ راست زندگی سے حاصل کیے گئے ہیں۔ اور جن میں کوئی بے کار یا مصنوعی رنگ نہیں بھرا گیا، اور نہ کسی قسم کی لذت آفرینی کی کوشش کی گئی ہے۔ چودھری صاحب نے ان بے مثال اور حیرت انگیز افسانوں کے علاوہ اور کہانیاں بھی لکھی ہیں، جن میں امیری کی بُو اودھ کی مٹتی ہوئی شرافت کے ایک دردناک مرثیہ کی حیثیت رکھتی ہے۔ یہ کہانی اس قابل ہے کہ اُسے اُردو کی پاکیزہ ترین کہانیوں میں ایک امتیازی مقام دیا جائے۔ اودھ کی معاشرت جیسا کہ میں پہلے کہہ چکا ہوں، ان کا خاص مطالعہ ہے۔ اور اس مطالعے کے بعض پہلو خصوصیت سے قابلِ ذکر ہیں۔ اس مطالعے کے افسانوں میں ہمیں بیشتر ایسے کردار ملتے ہیں جو اسی نسل کے ساتھ ختم ہو جائیں گے۔ وضع داری، افلاس دوستی، دوست نوازی، فن پردازی، تفریح پرستی، بے نیازی اور استغنا کے چلتے پھرتے مجسمے، کوئی دن کی بات ہے کہ سایوں میں تبدیل ہو جائیں گے، مرزا منش، میٹھا معشوق، خوش مذاقی کے اندھے۔ اور زندگی کا مقصد انھی نادِر روزگار لوگوں کی مرقع نگاری ہے۔ اور اگرچہ انھیں بقائے دوام دینے والے کا قلم ان کے محاسن کی تفصیل میں ایک پُرخلوص اور دِل کشا روانی دکھاتا ہے لیکن کبھی کبھی ان کی زمانہ ناشناسی اور واماندگی پر انھیں کچوکے بھی لگاتا جاتا ہے۔ اور عمل میں بعض دفعہ وہ طنز کی رفعتوں پر جا پہنچتا ہے۔ میری ناقص رائے میں محمد علی نے یہ خاکے کسی اصلاح کے خیال سے نہیں لکھے، بلکہ اپنی روزمرہ زندگی میں ایک مٹتی ہوئی معاشرت کے جو قابلِ لحاظ نمونے وقتاً فوقتاً اس کے سامنے آئے انھیں اس نے ادب کے عجائب خانے

میں محفوظ کردیا۔ آنے والی نسلیں ان پہ آنسو بہائیں گی یا ان سے عبرت یا تفریح حاصل کریں گی۔ یہ اُس کا دردِ سر نہیں ہے۔

محمد علی کے خیال انگیز افسانوں میں نیلم کا تنگ اور گناہ کا خوف ایک خاص مرتبہ رکھتے ہیں۔ گناہ کا خوف، سماج کی ظواہر پرستی پر ایک لازوال طنز ہے۔ اور نیلم کا تنگ مسیح کے اس قول کی بازگشت، کہ میں انسان سے مایوس نہیں ہوں۔ دونوں کہانیاں حقیقی زندگی کے پس منظر پر اُبھری ہیں اور اپنے اندر مسرت اور تفکر کے انمول خزانے پنہاں رکھتی ہیں۔

کہانیوں کے علاوہ محمد علی نے امامن مہری کی زبان سے روزمرہ کے سماجی مسائل پر پانچ طنزیے ایسے بھی لکھے ہیں جنھیں اردو کی انشائے لطیف میں ایک نہایت ممتاز مقام ملنا چاہیے۔ امامن مہری کے فلسفیانہ خیالات پانچ عنوانات پر مشتمل ہیں، ایمان داری بہترین دور اندیشی ہے۔ رکھ رکھاؤ، تیہا، طنطنہ، جوش، غصہ، جذبہ، کام کاج اور خیرخیرات۔ ان کے لکھنے کا خیال انھیں Barrypane کی ایک کتاب کے مطالعے سے پیدا ہوا تھا، میں نے نقشِ اول تو نہیں دیکھا، لیکن نقشِ ثانی اپنی خیال انگیزی اور خلش آفرینی کے اعتبار سے ہمارے طنزیہ ادب میں ایک لاثانی حیثیت رکھتا ہے۔

محمد علی کی سب سے بڑی جیت یہ ہے کہ وہ زندگی کو بہ یک وقت خارجی اور داخلی دونوں زاویوں سے دیکھتا ہے۔ اور مقابل کی یہ خصوصیات ایک واحد فن کار میں بہت کم جمع ہوتی ہیں۔ وہ اپنے خارجی محسوسات کو اپنے افکار کا لباس ایسی خوبی سے پہنا دیتا ہے کہ بیشتر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ جامۂ تنگ اسی صنمِ عربدہ خُو کے لیے تیار کیا گیا تھا۔ وہ خارجی دنیا کے معمولی سے معمولی واقعات کو اپنے احساسات میں سمو کر انھیں ایک نئی زندگی اور ایک نئے معانی عطا کردیتا ہے اور جب یہ عمل مکمل ہوجاتا ہے تو ہم یہ نہیں معلوم کرسکتے کہ ان میں محرک کون تھا، اور تحریک کس نے پائی۔ مثلاً وہ ایک جگہ گرمیوں کی صبح میں نسیم کی آہستہ روی اور اس کی روانی میں ایک بڑی بی کی مناجات خوانی کا ذکر کرتا ہے۔ جزئیات کا یہ مطالعہ بجائے خود بغایت درجہ حیرت خیز ہے۔ لیکن جب وہ اس تاثر سے کردارِ زیرِنظر کے ایک عمل کی نفسیاتی تعبیر کی طرف لپکتا ہے۔ اور

لپکتے ہی تاثر کو مکمل بھی کر لیتا ہے تو حیرت اپنی انگلی دانتوں تلے دبائے رہ جاتی ہے۔ اور آخر میں میں اپنے ممدوح کی نسبت ان الفاظ کو دہرا دینا ہی کافی سمجھتا ہوں جو حال میں میں نے اُن کے ایک نمائندہ فن پارے سے متاثر ہو کر لکھے تھے۔

''چودھری محمد علی کا سا پیرایۂ بیان ہمارے عہد کے کسی افسانہ نگار کو نصیب نہیں ہوا۔ حقیقت پروری اس پہ نثار اور دلنوازی اس پہ تصدق ہے۔ اور ان کے لیے انھیں کوئی اہتمام یا تکلف نہیں کرنا پڑتا۔ فطرت ایک ورق روشن کی طرح ان کے پیش نظر رہتی ہے اور اس کے جو اسرار ان کی نگاہِ انتخاب میں سما جاتے ہیں، وہ انھیں بے محابا اپنا لیتے ہیں۔ محمد علی کسی موضوع کو سامنے رکھ کر اس کی تعمیر کے لیے اپنے تخیل سے مسالہ نہیں مانگتا، بلکہ زندگی اپنی بوقلموں کیفیتوں کو لیے ہوئے اس کے پیچھے بھاگتی ہے۔ اور فن کار، جب کبھی اس کا جی چاہتا ہے، اور جو کچھ اس کا جی چاہتا ہے، اس کے دامن دولت سے مٹھیاں بھر بھر کر لے لیتا ہے۔ تو یہ ہے محمد علی، زندگی کا ایک زیرک ناظر، اردو کا ایک صاحب طرز ادیب، اور ہماری زبان کا اولین فطرت نگار۔

صلاح الدین احمد، بی اے
ایڈیٹر ''ادبی دنیا''، لاہور

عرضِ حال

یہ کہانیاں اور یادگاریں مختلف پرچوں میں چھپ چکی ہیں۔ کچھ پہلے پہل شائع ہورہی ہیں۔ اکثر پرچے مرحوم ہوگئے۔ جیسے ''نیا ادب'' ''منزل'' ''نئی روشنی'' ''نقیب'' اور ''اضطراب'' وغیرہ۔ خدا ان کو ان کی نیکیوں کا پھل دے۔ کچھ ہیں جو آب و تاب کے ساتھ اب بھی جاری ہیں جیسے ''ادبی دنیا'' (لاہور)۔ خدا ان کو عمر و اقبال عطا فرمائے۔

صلاح الدین احمد صاحب ایڈیٹر ''ادبی دنیا'' کا شکریہ خاص طور سے ادا کرتا ہوں۔ انھوں نے میرے کشکول میں تقریظ کی ایسی بھیک ڈالی کہ مالا مال کردیا۔ موصوف کی تحریر سے ایک نقصان بھی ہوگیا۔ یعنی تقریظ کی بلندی اور گہرائیوں کی وجہ سے میری غریب سطحی کہانیوں کا بھرم کھل گیا۔ بہرحال خدا ''ادبی دنیا'' کے خدمات تادیر جاری رکھے اور اس نادیدہ مشتاق کو ایڈیٹر کے دیدار اور دولتِ ہم کلامی سے مسرور کرے۔

بندہ

مصنّف عفی عنہ

عشقِ بالواسطہ

لارڈ کرزن ہندستان کے سابق وائسرائے اور انگلستان کے مشہور سیاست داں کی بابت مشہور تھا کہ وہ ''میں'' کا استعمال بہت کرتے تھے۔ قیصر ولیم شہنشاہ جرمنی میں بھی لوگ یہی عیب بتاتے تھے۔ نفسیات کے ماہرین کہا کرتے تھے کہ یہ لوگ اپنی انانیت کی وجہ سے وہ ٹھوکریں کھائیں گے کہ ان کے مرنے کے بعد بھی دوسرے یاد رکھیں گے۔ وہ دونوں تو چل بسے۔ اب اس زمانے میں ایک ہم ہی خودی کے قدردان رہ گئے ہیں رہے نام اللہ کا۔ تو ہم بھی کب تک، ناظرین کو اگر میری بات میں شک ہو تو واحد متکلم کا صیغہ اس تحریر میں گنتے جائیں ہاتھ کنگن کو آرسی کیا ہے۔ معلوم ہی ہوجائے گا میرے ان دونوں ہم خیالوں میں صفات یہی تھے جن کو سراہنے میں ان کو لطف آتا تھا۔ ہم میں ذری صفات کی کمی رہ گئی ہے۔ اس لیے ہم اپنے عیوب ہی کا ذکر کرکے سڑا سامنہ سوندھا کرتے ہیں۔ عیوب کا لفظ تو ہم نے مصنف خوار معترضین کا منھ بند کرنے کے لیے استعمال کیا ہے۔ اگر ہم ان کو واقعی عیب سمجھتے تو بیان ہی کرنے کیوں بیٹھتے۔ زیادہ سے زیادہ یہ تھا کہ کمزوریاں کہہ دیتے وہ بھی آپ کی خاطر سے ورنہ ہم تو ان کو صفات ہی سمجھتے۔ اپنے عیوب اور صفات کی طویل فہرست میں ہم جس عیب کا تذکرہ کرنے جاتے ہیں وہ صنف نازک سے تعلق رکھتا ہے۔ دنیا عجیب جگہ ہے۔ یہاں دل میں کچھ ہو مگر زبان پر وہی ہوگا جس کو سننے والے اور کہنے والا سب ہی جھوٹ جانتے ہیں۔ مگر سچ پکارتے رہتے ہیں۔ آپس میں سمجھوتہ اسی پر ٹھہرا ہے۔ جیسے چوروں میں ہوتا ہے۔ عورت کا نام آیا نہیں کہ ان حضرات کا ذہن عیوب کی طرف منتقل ہوا نہیں۔ اب لاحول ولاقوۃ ہے، الحیاء من الایمان ہے، استغفراللہ کا زور بندھا ہے۔ دل کا حال تو خدا ہی جانتا ہے کہ صرف منھ میں شیخ فرید ہے ورنہ بغل میں اینٹیں ہم سے بھی زیادہ لیے ہیں۔ اور ہم ہیں کہ حافظ شیرازی، شیخ سعدی اور عمر خیام رحمہم اللہ تعالیٰ

کے قدموں سے لگے مونچھوں پر تاؤ دیتے چلے جاتے ہیں۔

من ارچہ عاشقم و رند مست و نامہ سیاہ
ہزار شکر کہ یاران شہر بے گنہ اند

گر کند میل بخوباں دل من خوردہ مگیر
کیں گناہے است کہ در شہر شما نیز کنند

باماہ جبیں نشستہ در ویرانے
عیشے است کہ ہست حد ہر سلطانے

تو وجہ کیا کہ ہمارے دشمن لوگ عورت کا صرف ایک ہی مصرف جانتے ہیں اور ہم خدا کی اس ''موہبت عظمیٰ عطیہ کبریٰ'' کی قدر پہچانتے ہیں کہ چاہے ابوالآدم کی پہلی خدائی خلافت ہو چاہے ابوالقاسم محمدؐ کی آخری رسالت ہو۔ حوا اور خدیجہ سلام اللہ علیہا کی ضرورت ہمیشہ تسلیم ہوئی ہے ذرا غور تو فرمایئے۔ حضرت آسیہ نہ ہوتیں تو حضرت موسیٰ علیہ السلام پر کیسی بنتی۔

پولیٹیکل ضرورت سے ایک بار ہم الہ آباد گئے۔ کئی دن کی مصروفیت اور ہم آدمی ٹھہرے کاہل۔ تھک سے گئے، مگر لطف کے جلسے چھوڑنے کو دل نہیں چاہتا تھا۔ ہم سے زیادہ ہماری بی بی پریشان ہوگئیں۔ مہاوٹیں جو برسنے لگیں تو ڈنر ٹیبل اور ڈرائنگ روم، پارٹیوں اور چائے کی دعوتوں کا مزا کرکرا ہوگیا اور بی بی کی طرف سے واپسی کا اصرار شروع ہوا۔ اپنی بی بی کے مزاج سے کون نہیں واقف ہوتا۔ اس لیے میں نے کہا بھی کہ ابھی تو دو ایک ساڑیاں اور جوڑے بن پہنے رہ گئے ہیں۔ جلدی کاہے کی ہے مگر ان کی ضد بڑھتی ہی گئی۔

میں: ''اور وہ سبز پائپنگ والی شفن جارجٹ ساری اور نیا سٹ''

بی بی: ''ہوگی وہ ساری اور نیا سٹ، کوئی ہم سے چھین لے جائے گا! دیکھ رہے ہو، یہ بن برسات کی برسات لگی ہے۔ بوتات والی کوٹھری ساون میں کتنی ٹپکتی تھی اور اناج یوں ہی ٹوکروں میں بھرا چھوڑ آئے ہیں۔''

یہ نسوانی دلیل پائپنگ والی ساڑی اور نئے سٹ پر بھی غالب آگئی اور ناچار ایک عنایت فرما کو معذرت کا خط بھی لکھنا پڑا کہ ہم لوگ سخت مجبوری میں گھر واپس جا رہے ہیں اور کل کے ڈنر میں نہ شریک ہونے کا ہم دونوں آدمیوں کو بڑا قلق ہے۔

میں: ''صرف جج صاحب کے یہاں جانا رہ گیا ہے۔ صبح ان کے یہاں ہوتے ہوئے مکان نکل چلیں گے۔''

بی بی: ''ان کے یہاں جانا بہت ضروری ہے، نہیں تو بڑی شکایت ہوگی۔ مگر زیادہ دیر نہ لگانا تم تو جہاں بیٹھ جاتے ہو اٹھنے کا نام ہی نہیں لیتے ہو۔''

دوسرے دن صبح کو نو بجے ہم لوگ جج صاحب کے یہاں پہنچے۔ خود جج صاحب تو تھے نہیں۔ مگر ان کے چھوٹے بیٹے اور جج صاحب کی بی بی تھیں۔ ایک مہمان بھی ٹھہری تھیں۔ تعارف ہوا باتیں ہونے لگیں یہ صاحبزادی ابھی ابھی آکسفورڈ سے واپس آئی ہیں۔ جج صاحب کے صاحبزادے اور یہ لوگ کیمونسٹک انداز کے لوگ ہیں۔ خیر پولٹیکل خیالات سے اس وقت نہ ہم کو دلچسپی ہے نہ ان جھگڑوں میں پڑنے کو دل چاہتا ہے ہم تو کسی ایسے ستارے کی گردش میں پیدا ہوئے ہوں گے جہاں عورت کا راج ہوگا ؎

دل ابھی تک جوان ہے پیارے
ایک آفت میں جان ہے پیارے

ساٹھ برس کا سن عشرۂ قاتلہ کو پار کرنا کوئی بچوں کا کھیل نہیں اور ہم ہیں کہ اس کی بھی ہمت باندھے ہیں، بقول نظیر اکبرآبادی کے۔ ؎

اب بھی ہمارے آگے یارو جوان کیا ہے

ان صاحب زادی سے تعارف میرا کرایا گیا کہ فلاں شخص کے والد ہیں۔ ایک وقت تھا کہ ہمارا تعارف لوگوں سے اس طرح کروایا جاتا تھا کہ فلاں کے بیٹے ہیں، فلاں کے داماد ہیں۔ اور اب یہ زمانہ لگا ہے کہ فلاں کے باپ ہیں اور فلاں کے سسر ہیں، مگر ہم چکنے گھڑے ہماری سمجھ ہی میں نہیں آتا کہ ہم وہ نہیں رہے۔

وہ صاحب زادی: آپ سے مل کر بڑا جی خوش ہوا (اپنے میزبان کی طرف اشارہ

کر کے) ان سے اور اپنے دوسرے دوستوں سے آکسفورڈ میں اور یہاں بھی آپ کے لڑکے کی بڑی تعریفیں سنی ہیں۔ آج کل کہاں ہیں؟

میں: جی ہاں یقیناً لکھنؤ میں ہوں گے۔

صاحب زادی: ہم لوگ اس وقت دریا کی سیر کو جا رہے ہیں چلیے آپ بھی چلیے۔

میں: میں تو کل ہوا آیا ہوں مگر چلئے ضرور چلوں گا (اپنی بی بی کی طرف مخاطب ہو کر) پھر اس وقت کا جانا ملتوی کر دو۔ شام کو چلیں گے۔

اناطول فرانس، میر تقی میر، ولیسیکنر، فردوسی، رمبراں، سعدی، گوئٹے، رفیل روحیں میری مدد کو پہنچو۔ تمھارے اس ناچیز مرید پر بڑا سخت وقت پڑا ہے تم نے بڑے گاڑھے وقت میں میری مدد کی ہے۔ میری کمزور انگلیوں میں جَس دو، میرے گھسے پسے قلم کو موقلم کا زور بخشو کہ اس گھڑی کی تصویر اتار دے۔

ہماری کمسن بی بی نے کہا تو صرف ''اچھا'' مگر ان کے چہرے پر اس مایوسی کی جھلک دکھائی دی جو ارادہ فسخ ہونے پر پیدا ہوتی ہے۔ فلسفیانہ تاسف کی مسکراہٹ نے زبان حال سے کہا ہم نے تو ان کی صورت دیکھتے ہی سمجھ لیا تھا کہ تم پھسل پڑو گے۔'' ماتھے کی خفیف شکن اور ابرو کی کمان نے کہا ''تمھارے سِن کی زیادتی سے اور نیز اس وجہ سے کہ ہم سے محبت کرتے ہو اطمینان ہے کہ افلاطونی محبت سقراطی محبت تک نہ پہنچے گی۔ پھر بھی ہماری مسکراہٹ پر نہ جاؤ۔'' آنکھوں نے یہ بھی کہا کہ اس وقت غیر جگہ نہ بیٹھے ہوتے تو رنگ دوسرا ہوتا۔ مگر تم پریشان نہ ہو، گھر پہنچ کر بھی ہم لڑیں گے نہیں۔ عادت کے گھٹے پڑ چکے ہیں۔'' ہونٹوں نے کہا ''اور بات خدا لگتی کہنا چاہیے، تمھاری بچوں کی ایسی باتوں پر ہنسی بھی تو آتی ہے کہ جہاں کسی نے چٹکی بجائے۔ تم کیگلے بچے کی طرح ہمک کر اسی کی گود میں پہنچ گئے۔'' گردن کے ڈورے نے ایک طرف پھر کر کہا۔ ''ارے تم شام کو بھی نہ چلو گے، ہم تو جانتے ہیں نا! خیر دریا کی سیر ایک بار پھر ہو جائے گی اور وہ پائپنگ والی ساڑی اور نیا سٹ بھی سوارت ہو جائے گا۔ ہمارا بھی تو ہاتھ نگوڑا پتھر کے نیچے دبا ہے۔ چلو یوں ہی سہی۔''

گالوں نے ٹھوڑی کی مدد لے کر کہا ''ہم بھی تو تمھارے پیار سے بے بس ہیں۔''

بنگال کی شاخ کا چشمہ انگلستان کے پودے پر بندھا۔ منورما اپنے ملک کو واپس آئیں۔ آکسفورڈ کے فرسٹ کلاس کے نیچے کبھی بات نہیں کی۔ ہندستان آئیں جو دیکھتا ہے کہتا ہے ''واہ واہ''!

صورت شکل کوئی دنیا سے نرالی نہیں ہے مگر وہ بات جس کو شیراز کے حافظ جی ''آن'' کہا کرتے تھے۔ ہر چیز سے پیدا ہے۔ کچھ ناگن کی سی چال کچھ برق تمثال۔ کچھ پھول کچھ کلی، آدھی بند آدھی کھلی، چاندی کی سی بے تکلفی، علم کی خوداعتمادی، کمیونسٹ فلسفے کی بنا پر برابری کا دعویٰ خود نسوانیت کے حقوق نہیں مانگتی تھیں مگر مردوں میں کچھ ایسا رومانی اثر پیدا ہوجاتا ہے کہ ہر شخص خراج تحسین لیے حاضر ہے۔ آنکھوں سے باتیں کریں ہنسی سے خوشی پیدا ہو۔ ہونٹوں کی جنبش میں پسندیدگی ناپسندیدگی ...... گال ناک ماتھا مسائل حل کر رہے ہیں۔

نہ گفت دمن بشنیدم ہر آنچہ گفتن داشت
کہ در بیاں نگہش کرد بر زبان تقدیم

دہاں چو نوبت خویش از نگاہ باز گرفت
فتاد سامعہ در موج کوثر و تسنیم

میرے پڑھنے والو معلوم نہیں کہ تم میرا مضحکہ اڑاؤ گے یا خود اپنے آنے والے بڑھاپے کا خیال کر کے عبرت بد پیشگی کرو گے۔ مگر ہم تو کھیت رہے۔ انا للانانث و انا لیھن راجعون۔

کہاں کی واپسی اور کیسا رخت سفر۔ اس وقت چائے ہے تو اس وقت سنیما ہے۔ سیر ہے تفریح ہے۔

رشتہ در گردنم افگندہ دوست
می برد ہر جا کہ خاطر خواہ اوست

ایک کوئی ہمارے ہی ایسے اگلے زمانے میں بھی گزرے ہیں خالی وہ جوان تھے

ہم تجربہ کار ہیں۔ شحنۂ عشق ان پر بھی ہماری ہی طرح سوار تھا۔ وہ بے چارے جنگل جنگل اپنی معشوقہ کا نام لیتے پھرتے تھے اور نعرے لگاتے تھے کہ ''آہ حسینہ میری نیند اڑا لے جانے والی' مجھ کو راتوں کو جگانے والی۔'' ان کا خدمت گار بھی ساتھ ساتھ تھا۔ دبی زبان وہ بھی کہتا جاتا تھا ''میری بھی نیند اڑا لے جانے والی، مجھ کو بھی راتوں کو جگانے والی'' یہی حال ہماری بیگم صاحب کا تھا کہ وہ بھی کچھ ہنسی کچھ غصہ زبان حال سے وہی خدمت گار والی باتیں فرماتی تھیں۔ گو تجربے کی بنا پر ان کو اطمینان تھا پھر بھی۔

''دل نہ اُڑ جائے کہیں دام سے تیرے صیاد
گرچہ پژمردہ ہے یہ صید و لے طیر تو ہے''

عمر بھر کے ساتھ کا وعدہ خدا کے سامنے رسولؐ کے سامنے پنچ برادری کے سامنے کر چکی تھیں۔ بھلا ایسے وقت میں ایک باؤلے کو بغیر رسی کے یوں ہی کیسے چھوڑ دیتیں۔ صبح کی گاڑی تو چھوٹ ہی چکی تھی۔ شام کی گاڑی گئی۔ اب دوسرے دن کا پاتر اب رکھا گیا۔ مگر منورما بولیں ''کمیونسٹ پارٹی کی ماہوار کمیٹی کل ہوگی۔ ہم تم کو بھی ممبر کرنا چاہتے ہیں اس کے بعد چلو تو ہم بھی لکھنؤ جائیں گے۔ تمھارے گھر رائے بریلی تک ریل پر بھی ساتھ رہے گا۔'' میرا تو ذکر ہی کیا مگر منورما کی وجہ سے صحبتیں کچھ ایسی دلچسپ ہوگئی تھیں کہ خلاف امید میری بی بی بھی ایک دن اور ٹھہرنے پر راضی ہوگئیں۔ عموماً ان جلسوں میں ایک ہم ہی مسن ہوتے تھے ورنہ عورت مرد سب وہی تھے جن میں امنگ، جوانی تہیہ، اردہ، ہمت، آئندہ کی امیدیں موجود۔ مختصر گزشتہ قریب قریب مفقود۔ ان صحبتوں میں ہر فرد پڑھا لکھا زیادہ تر دو ہی قسم کی باتیں ہوتی تھیں یا قربانی، خدمت، کارل مارکس کے اصول کی بے دھڑک پابندی، ہتھیلی پر جان لے کر کام کرنے یا کھلے ڈلے جنسی طلسمات دونوں قسموں میں جوش قدر مشترک۔ کیا کہنا جوانی کا اصول اخلاق کی نئی دلآویز تفسیریں، جوانی کے خواب کی نئی تعبیریں، جنس کے دنیا ساز قیود ٹوٹے پڑے تھے۔ البتہ فطرت کی حفاظتیں مجبوراً برقرار تھیں۔ مساوات نے عورت مرد کا فرق کم کردیا تھا۔ اگر کسی نے کسی لڑکی کے کاندھے پر ہاتھ رکھ دیا تو وہ جھجکی نہیں، اگر

کوچ پر کوئی کسی سے بھڑ کر بیٹھا تو تعجب نہیں۔ تھوڑی بے تکلفی اور بڑھ گئی تو کمر میں ہاتھ ڈال کر بیٹھ گئے۔ یہ باتیں دیکھ کر ہماری بی بی کی آنکھیں کھل گئیں۔

بیٹھے بیٹھے کچھ مزا ہم کو بھی اب آنے لگا
اب تو ہم بھی درددل میں مبتلا ہونے لگے

ہم یہ تو کہہ نہیں سکتے کہ وہ بے جھجک اس میدان میں آگئیں مگر شعور باطن ان کا بھی کمیونسٹ ہی ایسا معلوم ہوا۔

بجائے ان کے اب ہم گھر کی واپسی کے منصوبے باندھنے لگے۔ ہماری بیگم بھی کمیٹی میں شریک ہوئیں ناواقف کاری کی وجہ سے زیادہ حصہ تو نہ لے سکیں۔ مگر بہت ذہانت اور دلچسپی سے جلسے کی کارروائی سنا کیں۔ گہرے مسائل تک تو شاید نہ پہنچتی ہوں مگر دبی زبان سے اتنا تو کہا کہ جب مرد ایک سے زیادہ شادی کرتے ہیں تو عورت بھی اپنا یہ حق کیوں نہ لے۔ ناظرین ہم نے واپسی کا ارادہ مصمم کرلیا۔ آج پہلے پہل شام ہم نے اپنی قیام گاہ ہی پر بسر کی اور رات وہی اپنے ستارے کی گردش کے اثر سے بیگم اور منورما کے منصوبوں میں گزاری۔ صبح کو ریل پر منورما کا آخری مرتبہ ساتھ ہوا۔ دریا کی سیر میں منورما نے کچھ تصویریں احباب کی اتاری تھیں وہ دکھائیں، ہم نے اپنے چہرے کی شکنیں دیکھ کر اللہ کا شکر بھیجا کہ آدمی خود اپنی صورت نہیں دیکھ سکتا۔ اسی کے ساتھ ہم نے یہ بھی محسوس کیا کہ باوجود چہرے پر اُلّو کے ہمارے دل کی تصویر سے ایک تشفی سی بھی ہوئی اسٹیچو ہو کہ تصویر ہو اولاد ہو کہ تصنیف ہو جہاں اس فنا کے چیتھڑے کو کسی نہ کسی صورت سے کچھ دن اور بھی دنیا میں رہنے کی آس ہوئی۔ دل خوش ہی ہوجاتا ہے۔

لیجیے صاحب رائے بریلی کا اسٹیشن آگیا۔ ہم ہاتھ ملاکر ریل گاڑی سے اترے، ہم نے اپنے دل میں کہا۔

''خوش درخشید و لے دولت مستعجل بود''

اب یہ موہنی صورت پھر کاہے کو دیکھنے میں آئے گی۔

منورما: آپ اپنے لڑکے کو کچھ پیغام تو نہ دیجیے گا کیونکہ کل کمیونسٹ جلسے میں ان سے ملاقات ضرور ہوگی۔ وہ تو لکھنؤ کی کمیٹی کے سکریٹری ہیں نا؟''

میں: جی اسے تو کچھ کہنا نہیں ہے مگر آپ سے ایک درخواست ہے اگر ہو سکے تو ہمارے لڑکے ہی پر عاشق ہو جایئے گا۔

منورما: میں حتمی وعدہ تو نہیں کرسکتی مگر کوشش کروں گی۔ ختم اس مضمون کی تنقید خود مصنف کے قلم سے۔ ڈاکٹر جانسن نے بادشاہ جارج سے کہا تھا کہ نئی باتیں آدمی صرف تیس سال تک سیکھتا ہے۔ اس کے بعد اسی پرانے علم کی جانچ، رگڑ، تکڑ ہوا کرتی ہے۔ چمک صفائی زیادہ ہوجاتی ہے لیکن چیز وہی رہتی ہے۔ برنارڈ شا نوے سال سے اوپر کے ہیں ان کے عنفوان شباب کے ناول دیکھیے، جوانی کے ڈرامے دیکھیے، جو چمک، جو شفافی، دو آخری ڈراموں میں ہے اس پر عش عش کیجیے لیکن غور سے دیکھیے تو پتا چلتا ہے کہ وہی اگلے برس کی تیلیاں ہیں، خالی اوپر کی جگمگاہٹ، رونق اور ٹھاٹھ دلآویز ہے۔ نئی بات بڑھاپے میں کہاں جو کچھ ہے وہی غنیمت ہے۔

جب برنارڈ شا کا یہ حال ہو تو ہم کس کھیت کی مولی ہیں۔ لہٰذا امید ہے کہ تنقید کرنے میں بوڑھے کا دل رکھ لیجیے گا...... بقول رسکن کے تصویر میں.......... ''یہ نہ ڈھونڈھو کہ کیا نہیں ہے بلکہ جو کچھ ہو اس کی تعریف کرو۔'' اس نظریے سے اگر دیکھا جائے تو مصنف کا نڈر انداز اور ریلزم قابلِ داد ہیں۔

پیری کے ولولے ہیں خزاں کی بہار ہے

O

''مِس ہیلن''

مس ہیلن دولت مند تھیں۔ اپنا وطن چھوڑ کر اس غلامستان کو اپنا دیش بنایا تھا۔ خود کہا کرتی تھیں کہ ہندستان میرا روحانی وطن ہے۔ ہندستانیوں سے برابر کے طور پر ملتی تھیں۔ یہ بات ان کے ہم قوموں کو یقیناً گراں گزرتی رہی ہوگی۔ مگر وہ پروا نہیں کرتی تھیں۔ انگریزوں کی قوم پرستی ضرب المثل ہے۔ مگر تالی دونوں ہاتھوں سے بجتی ہے۔ جب یہ ہندستانیوں پر اس طرح سے فدا تھیں تو ان کی قوم والے بھی ان سے دور کی صاحب سلامت کافی سمجھتے تھے۔ انگریزوں میں سوسائٹی کے قوانین اتنی سختی سے برتے جاتے ہیں کہ اگر کوئی ان کی پروانہیں کرتا تو اس کی نسبت دنیا بھر کی برائیوں کا گمان کیا جاتا ہے۔ دماغ کی خرابی جنسی جرائم کی عادت وغیرہ وغیرہ۔ اگر کسی نے بڑا احسان کیا تو صرف یہی شک کیا کہ شاید دل ٹوٹ چکا ہے۔ مس ہیلن کی نسبت ان کے ہم قوم اپنی نیک دلی سے کام لے کر صرف یہ کہتے تھے کہ دماغ میں کسی جگہ کوئی کیڑا ہے جو ان کو اعتدال کے مرکز سے ہٹائے ہے۔ شروع شروع ہندستانی ان میں کوئی عیب ہی نہیں پاتے تھے۔ ان کا اخلاق، ان کی نیک دلی، چھوٹی چھوٹی فروگذاشتوں پر ان کی درگذر اور ان کا اصلی کام یعنی ہندستانیوں کو خوددار بنانے کی کوشش قصہ مختصر ہر بات ان لوگوں کو اچھی ہی اچھی دکھائی دیتی تھی۔ انگریزوں اور ہندستانیوں کی رائے تو آپ کو معلوم ہوگئی۔ اب رہے داستان گو، ان کے خیال میں مس ہیلن میں بھی اسی طرح کا ایک عیب تھا جیسے چاند میں دھبہ، مگر وہاں ان سے کوئی نقصان نہیں ہوتا اور یہاں یہی ایک عیب سب کام بگاڑے تھا۔ عیب یہ تھا کہ وہ جوان تھیں، دنیا میں کام کرنے کے لیے دولت اکثر ضروری ثابت ہوئی ہے خوبصورتی نے کبھی کبھی بڑے فائدے پہنچائے ہیں اور کبھی بڑے بڑے نقصان، مگر جوانی ہمیشہ چلتی گاڑی میں روڑا اٹکاتی ہے۔ مس ہیلن میں جوانی تھی، دولت کافی سے زیادہ تھی، خوبصورتی کا یہ حال تھا

کہ بعضوں کے نزدیک ان کی یونانی ہم نام نے ان میں جنم لیا تھا۔ بعضوں کے نزدیک ان کا قد بہت کشیدہ تھا۔ ان کی ٹھڈی اور ناک بہت نمایاں تھیں۔ اور ان کی ہنسی میں رونق نہیں تھی۔ لکھنے والے کے نزدیک ان کے قد کی برائی صرف وہ لوگ کرتے تھے جو خود لمبے نہیں تھے ان کی ٹھڈی اور ناک ان لوگوں کو بری لگتی تھی، جنھوں نے روم کی سنگی تصویروں پر غور نہیں کیا تھا۔ ہنسی کو بے رونق وہ لوگ بتاتے تھے جن کا مذاقِ پسند ایک عورت پر ختم ہو کر رہ گیا تھا۔

جہاں تک پتہ چلتا تھا مس ہیلن کبھی دردِ دل کی بیماری میں مبتلا نہیں ہوئی تھیں۔ اول تو انھوں نے زندگی کا ایک مقصد بہت سختی سے اختیار کر رکھا تھا دوسرے کچھ سرد مہر بھی واقع ہوئی تھیں۔ اسی وجہ سے کلب کے ممبران الف ب ج د ہ سبھی سے نہایت بے تکلفی سے باتیں کرتی تھیں اور جنسی معاملات پر اس طرح گفتگو کرتی تھیں جیسے مولوی لوگ مذہبی کتابوں کے جنسی مسائل پڑھاتے ہیں۔ اس طرح گفتگو شروع ہوتی تھی تو نوجوانوں کے دلوں میں امیدوں کا طوفان بندھتا تھا۔ جب ختم ہوتی تو بحث کرنے والوں کو بُور کے لڈو یاد آجاتے تھے۔ جن کی نسبت مشہور ہے ''جو کھائے وہ پچھتائے جو نہ کھائے وہ پچھتائے'' مثال کے طور پر دو ایک مکالمے سن لیجیے:

مس ہیلن: ہندستانی اپنی بیویوں کو نہیں چاہتے۔

الف: یہ آپ کیسے کہہ سکتی ہیں۔

مس ہیلن: اس لیے کہ ہم راستے میں اکثر دیکھتے ہیں کہ عورتیں بڑا سا بوجھ اور لڑکا لیے چلی جاتی ہیں اور مرد کوئی ہلکی سی چیز سنبھالے ہے۔

الف: یہ تو اس وجہ سے ہے کہ آپ نے اس بوجھ کی بڑائی دیکھ لی ہے۔ اگر ان کی گٹھریاں کھول کر دیکھیے تو آپ کو معلوم ہوگا کہ عورت کی گٹھری میں صرف کپڑے اور دوسری ہلکی چیزیں ہیں اور مردوں کی پیٹھ پر پھول کے برتن اور آٹا وغیرہ بندھا ہے اور پھر آپ کو کیا معلوم کہ وہی عورت جو سڑک پر بوجھ لادے چلی جارہی ہے گھر کی چہاردیواری کے اندر اپنے میاں پر چڑھی نہیں لیتی اور انگنائی بھر میں چکر پھیریاں نہیں لگاتی۔

مس ہیلن: ممکن ہے کہ ایسا ہو مگر دوسری باتوں میں ہندستانی مرد عورت کو ذلیل نظر سے دیکھتا ہے۔

الف: عورت کا درجہ ہمارے یہاں مرد سے بہت نیچا رکھا گیا ہے اور جن قوموں میں عورت کی قدردانی کے بڑے دعوے کیے جاتے ہیں وہاں بھی عورت کے حقوق مرد سے بہت کم تھے اور آج بھی ہیں۔

مس ہیلن: جو قومیں دو دو تین تین بیویاں رکھتی ہیں وہ عورت کی قدر کا دعویٰ کیونکر کرسکتی ہیں۔

الف: بقول برنارڈ شا کے اگر عورت عمدہ مرد میں چار آنے کا حصہ کسی خراب مرد میں سولہ آنے کا حصہ رکھنے سے زیادہ پسند کرتی ہے تو کیا ہرج ہے۔ اس کے علاوہ عورت یک خصمی واقع ہوئی ہے اور مرد ہری چگ کہلاتا ہے۔

مس ہیلن: تم یہ کیوں کر کہہ سکتے ہو کہ عورت ایک ہی وقت میں کئی مردوں کی خواہش مند نہیں ہوتی، تم مرد ہو، یہ بات تو عورت ہی بتلا سکتی ہے۔

۲

مس ہیلن: تم فلاں عورت کو جانتے ہو۔

ب: نام سنا ہے۔

مس ہیلن: میں تم کو بتاؤں اس عورت میں جنسی گرمی بہت ہے اگر ایسا نہ ہوتا تو اس کا شوہر اتنا مضمحل نہ رہتا۔

ب: دونوں جوان ہیں۔ تندرست ہیں، یہ کیفیتیں تو زیادہ سن والے کو ہوتی ہیں۔ میرے خیال میں اس کے چپ رہنے کی کوئی اور وجہ ہوگی۔

مس ہیلن: میں اس وجہ سے کہتی ہوں کہ مجھ سے اس مرد سے شادی کے پہلے بھی

ملاقات ہوچکی ہے بلکہ ایک شام کو وہ مجھ کو سنیما بھی لے گیا تھا اور اندھیرے میں میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا تھا۔ مگر میری تربیت دوسری طرح کی ہوئی ہے اس لیے میں نے اس کی جرأتیں بڑھنے نہیں دیں۔

ب: مس ہیلن آپ کی ایسی خوبصورت کے پاس بیٹھ کر اگر کسی غریب کا پاؤں ڈگ جائے تو آپ کو چاہیے کہ اس کو قانونی سزا دے کر مراحم خسروانہ میں معاف کردیجیے۔

مس ہیلن: ہنس کر۔ میرا اس نے کیا بگاڑا جو میں اس سے خفا ہوتی مگر ایسی عورت کے ساتھ شادی کرکے اس نے اپنی زندگی تباہ کردی۔

ب: اگر وہ دونوں راضی ہیں تو تیسرے آدمی کو اعتراض کا کوئی حق معلوم نہیں ہوتا۔

مس ہیلن: میں تم سے بالکل اتفاق کرتی ہوں۔ مگر تم اس عورت کی قطع دیکھتی ہو، کمر کو لے اتنے بھاری، سینہ اتنا بڑا، پاؤں میں مردوں کے ایسے بال اور ساڑھے آٹھ نمبر کا دستانہ پہننے والی بھلا تمھارے خیال میں اس کا کیا سن ہوگا۔

ب: میرے خیال میں چوبیس برس انتہائی پچیس برس۔

مس ہیلن: پچیس برس، غضب کیا تم نے، میرے خیال میں پینتیس برس سے ہرگز کم نہیں ہے بلکہ چالیس برس۔ میں تو کہوں گی کہ اگر وہ پینتالیس کے لگ بھگ ہو تو تعجب نہیں۔ میں اس وجہ سے بھی کہتی ہوں کہ کم سنی میں مرد کا شوق عموماً کم ہوتا ہے جوں جوں سن بڑھتا جاتا ہے بعض عورتوں کی ہوس بڑھتی جاتی ہے۔

۳

مس ہیلن: تم فلاں شخص کو جانتے ہو۔

ج: جانتا ہوں مگر زیادہ واقف نہیں ہوں۔

مس ہیلن: مجھ سے اس شخص سے بڑی دوستی تھی۔ اس نے جس وقت میری ایک جاننے والی سے میری بڑی سخت برائی کی مجھ کو اس سے نفرت ہوگئی ہے۔ یہ شخص میرے ایک دوست کے یہاں مقیم تھا۔ اس نے اس کی لڑکی کو خراب کیا اور یہ حال اس وقت کھلا جب وہ لڑکی بیماری کی وجہ سے ہسپتال پہنچ گئی۔ لوگوں کا خیال تھا کہ اس کو اس شخص نے ایک جنسی بیماری دے دی ہے۔ مگر امتحان کے بعد یہ خدشہ غلط ثابت ہوا۔ پھر بھی اس کو ایسا نہیں کرنا تھا۔

ج : میرے خیال میں ایسے معاملات میں کچھ نہ کچھ ذمہ داری دوسرے فریق کی بھی ہوتی ہے۔

مس ہیلن: تم کو اس بدنصیب لڑکی کا سن معلوم نہیں ہے ورنہ تم ایسا نہ کہتے جس وقت کا یہ واقعہ ہے وہ صرف اٹھارہ یا اُنیس سال کی تھی۔

ج : اٹھارہ، اُنیس سال کا سن اگر زیادہ نہیں تو کم بھی نہیں ہے یعنی میرا مطلب یہ ہے کہ اس سن میں اکثر واقعات اس طرح کے سنے گئے ہیں۔

مس ہیلن: ممکن ہے کہ تم ٹھیک کہتے ہو۔ کیونکہ اس لڑکی کی تربیت بھی اچھی نہیں کہی جاسکتی تھی۔ اس کی ماں کو اس کا باپ بہت دن ہوئے چھوڑ کر چلا گیا تھا۔ مگر میرے پاس اس شخص کے بُرے ہونے کا ایک اور بھی ثبوت ہے۔ مسٹر نیٹسن کے یہاں وہ ڈنر اور ناچ تم کو یاد ہوگا، میں نے اپنی کار وہاں پہنچ کر واپس کردی تھی کیونکہ میرا شوفر اس وقت چھٹی لے چکا تھا۔ واپسی میں اس شخص نے مجھ کو گھر پہنچا دینے کا وعدہ کیا۔ راستہ میں اس نے میرا بوسہ لینے کی کوشش کی۔

ج : مس ہیلن اس رات کے لیے تو میں اس کی وکالت کروں گا۔ آپ کے کپڑے اور سنگار نے آپ کا حسن ایسا چمکا دیا تھا کہ اگر کسی دوسرے کے عزم و استقلال میں فرق آجاتا تو قابل معافی تھا۔

مس ہیلن: (ہنس کر) نہیں میں نے خود غلطی کی تھی۔ میں تین مرتبہ اس کے ساتھ ناچی تھی یہ مجھ کو نہ کرنا تھا پھر بھی اس کو آدمی پہچان لینا تھا۔

۴

د : مس ہیلن آداب عرض کرتا ہوں۔

مس ہیلن: پرسوں میں نے آپ کو مس ''ن'' کے ساتھ دیکھا تھا کیا آپ کی نظر میں وہ خوبصورت ہے۔

د : میری نظر میں تو ہر عورت خوبصورت ہے اور مس ''ن'' کو مستثنیٰ نہ کرنے کی میرے پاس ایک بڑی وجہ موجود ہے۔

مس ہیلن: تم ٹھیک کہتے ہو۔ اگر قد اس کا ذرا سا چھوٹا نہ ہوتا تو واقعی اچھی تھی۔ سوا بالوں کے جو اتنے نیچے سے جمے ہیں کہ ماتھا چھوٹا ہوگیا ہے۔

د : مجھ کو تو چہرے بھر میں جتنا اس کا ماتھا پسند ہے کوئی دوسری چیز مشکل سے پسند ہوگی۔ اسی وجہ سے میں نے پیغام بھی دے دیا اور قبول بھی کرلیا گیا میں اپنے کو مبارک باد کا مستحق سمجھتا ہوں۔

مس ہیلن: ضرور ضرور خدا مبارک کرے میں نے جو رائے ظاہر کی تھی وہ صرف ایک کِری ٹِک (critic) کی نظر سے کی تھی ورنہ بحیثیت تمھاری منگیتر کے وہ سوا اچھی کے اور کیا ہوسکتی ہے۔ ہماری چھوٹی سی سوسائٹی میں مس...... سے خوبصورت کوئی نہیں ہے تم نے اس کے ساتھ شادی کیوں نہ کی۔

د : ہر شخص کا مذاق مختلف ہوتا ہے اور دل کے معاملات سوائے صاحب معاملہ کے دوسرا نہیں سمجھ سکتا۔ اچھا اب خدا حافظ، میں جاؤں گا۔

مس ہیلن: میری مبارک باد دوبارہ قبول کیجیے۔

د : شکریہ

۵

مس ہیلن: آہا مسٹر "ہ" آج آپ سے بہت دنوں کے بعد ملاقات ہوئی، میں سمجھتی تھی کہ آپ کو میری صحبت پسند ہے مگر معلوم ہوتا ہے کہ اب میری جگہ مس "ذ" نے چھین لی ہے۔

ہ : (قہقہہ لگا کر) آپ ایسا ہرگز نہ سمجھیے میں آپ کا اسی طرح خالص نیاز مند ہوں، جیسا ہمیشہ رہا ہوں۔

مس ہیلن: تمھارا انداز مجھ کو سب سے پسند ہے۔ وہ یہ کہ تمھاری باتیں کھلی ڈلی صاف دلی کی ہوتی ہیں جن میں ڈورے ڈالنے کا انداز نہیں ہوتا۔ اگر تم کو ایک نئی خبر سناؤں تو کیا دو گے۔

ہ : پہلے خبر سنا دیجیے تب بتاؤں گا۔

مس ہیلن: "ذ" نے مس "ن" کے ساتھ پیغام دے دیا اور قبول بھی ہو گیا۔

ہ : ارے یہ تو تازہ سے تازہ خبر نہیں کہی جا سکتی۔ میں نے تو یہ کئی دن ہوئے سنا تھا۔

مس ہیلن: میں نے تو آج ہی سنا، میری سمجھ میں نہیں آتا کہ مسٹر "ذ" اس میں کون بات دیکھتے ہیں۔ اس تین سال کے اندر پانچ چھ آدمیوں کو تو میں جانتی ہوں جو خلا ملا کر کے علیحدہ ہو گئے پہاڑ پر جو محبت کرنے والے رہے ہوں ان کی گنتی نہیں۔

ہ : یوں تو وہ ہر شخص سے ہنس کر ملتی ہے مگر اتنے زیادہ مراسم پہلے شاید کسی سے نہ ہوئے ہوں۔

مس ہیلن: میں دیکھتی ہوں کہ مسٹر "ہ" آپ دنیا سے اتنے باخبر نہیں جتنا کہ میں سمجھتی تھی۔ میں تم سے بصیغہ راز دعوے سے کہہ سکتی ہوں کہ اس عورت کا کنوار پن

برسوں ہوئے جا چکا ہے اور گزشتہ سال یہ ایران وغیرہ جو گئی تھی ممکن ہے کہ اس کے لیے اشد ضرورت رہی ہو۔

الف، ب، ج، د، ہ

الف : بھئی مس ہیلن کا ذکر نہ کرو اور جو جی چاہے کہو۔ اس عورت کے سامنے تو میرے اعصاب میں کھنچاؤ سا ہونے لگتا ہے اور دل چاہتا ہے کہ کمرہ چھوڑ کر بھاگ جاؤں۔

ب : ہر شخص کا یہی حال ہے مگر اس کی ہندستان دوستی میں شک نہیں اور اس لحاظ سے ہمیں اس کا احسان ماننا چاہیے۔

ج : لیکن اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ اگر کسی میں ایک صفت ہے لوگ اس کے دوسرے عیوب سے پریشان نہ ہوں۔

الف : ارے بھئی اس کی تو یہ حالت ہے کہ پہلے دوسرے جنس کو للچاتی ہے اس کے بعد سردمہری کر کے اس کو خفیف کرتی ہے اور لوگوں سے واقعات بیان کرتی ہے کہ میں ایسی پاک باز ہوں۔

ب : اگر الف صاحب خود اپنے تجربے کی بنا پر کہتے ہیں تو ہم کو تسلیم ہے۔

الف : (ہنس کر) خیر میں اگر اپنی بیتی کہتا ہوتا تو شاید اس صفائی سے باتیں نہ کر سکتا۔ مرد کو جانے دیجیے خود اپنی جنس کی جانی دشمن ہے۔ یہ تو میرا تجربہ نہیں ہو سکتا۔

د : نہیں نہیں میں نے مس ہیلن کو ایک عورت کی بھی تعریف کرتے سنا ہے۔ خالی ساٹھ برس سے کم سن والی میں کوئی بھلائی نہیں دیکھتی۔

ج : میں عرض کروں، یہ سب خرابی اس وجہ سے ہے کہ اس نے شادی نہیں کی۔ اچھی خاصی عورت ہے مگر فطرت سے لڑ کر کون جیتا ہے جو یہ غریب کامیاب ہوتی۔

ہ : جنسی تقاضے کو آدمی خیرات، خدمت خلق، فنون لطیفہ کی ترقی کی طرف پھیر سکتا ہے اور اس میں کامیاب بھی ہو سکتا ہے۔

د : بالکل ٹھیک ہے اس مسئلہ کے ہم بھی قائل ہیں۔ مگر جنسی قوت سے پورم پور دوسرا کام لینا اور اس کو بالکل محروم رکھنا شاید اس فلسفے کے موجد کا بھی یہ دعویٰ نہ ہو۔ یہ مسئلہ صرف نفسیات ہی سے تعلق نہیں رکھتا بلکہ جسم سے بھی متعلق ہے۔ ایسی حالت میں صرف یہ ہوسکتا ہے کہ تھوڑا سا اس سے فطرتی کام لیا جائے اور باقی دنیا کے فائدے کے لیے دوسروں کے کام آوے اگر سر سے پاؤں تک اس سے یہی کام لیا جاوے گا تو یہی نتیجہ ہوگا جو پیش نظر ہے یعنی عورت مرد سے واسطہ نہ رکھے گی۔ مگر لوگوں کو للچالِلچا کر خود بھی پریشان ہوگی اور دوسرے کو بھی پریشان کیا کرے گی۔

ب : تو یہ بھی ایک قسم کی ہسٹریا ہے جس میں غلط بات پر ارادہ مضبوط ہوجاتا ہے۔

و : اور نہیں تو کیا، آپ نے دیکھا نہیں کہ ایسی عورتیں جہاں دو آدمیوں کو محبت کرتے دیکھتی ہیں صرف پریشان ہی نہیں ہوجاتیں بلکہ اس غریب عورت کے عیبوں کو ڈھونڈنے لگتی ہیں۔ اور یہ نہیں سمجھتیں کہ خود اپنی محرومی دوسرے کے عیبوں کو روشن کیے ہوئے ہے۔ بات سمجھ میں تو آتی ہے مگر یہ بھی یاد رہے کہ مس ہیلن فنون لطیفہ کی ماہر اور بڑی خوش مذاق ہے اس کی تنقید کچھ پایہ رکھتی ہے۔

اس کے روشن خیال ہونے میں کچھ شک نہیں مگر آپ نے سنا نہیں کہ ''تنہا منشیں کہ خوف دیوانگی است'' انھوں نے فطرت سے جو اعلان جنگ کر رکھا ہے وہی سب کھیل بگاڑے ہے چاہے وہ نقادی کی نظر ڈالیں چاہے وہ بہ حیثیت ایک ماہر اخلاق کے کسی چال چلن کی پرکھ کریں ہر چیز میں خود ان کی خالی خولی زندگی کھیل بگاڑ دیتی ہے جس سے دوسروں کے عیوب چمک اٹھتے ہیں اور ہنر چھپ جاتے ہیں۔

(اتنے میں مس ہیلن آجاتی ہیں)

ہ : آیئے مس ہیلن ابھی آپ ہی کا خیال دل میں تھا کہ آپ آگئیں۔ ہندستانی عقیدے کے موافق آپ بہت جئیں گی۔

الف : مس ہیلن آپ کا ایسا کپڑوں اور زیور کے انتخاب کا سلیقہ سب عورتوں ر

ہو جائے تو ہم غریب مردوں کی نگاہ اور دماغ دونوں کا سکون بڑھ جائے۔

مس ہیلن : آپ دونوں آدمی ایک سے ایک بڑھ کر بادشاہ کی مصاحبت کی قابلیت رکھتے ہیں۔ اور میں کیا کہہ سکتی ہوں، اب اچھا آپ لوگوں کو ایک نئی اطلاع دیتی ہوں وہ یہ کہ عنقریب انگلستان واپس جانے والی ہوں۔

الف : یہ خبر تو آپ نے ایسی سنائی کہ ہم لوگوں کے ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے۔

د : بھئی کلب کی طرف سے آپ کا رخصتی ڈنر بڑی دھوم دھام سے ہونا چاہیے۔

یہ تو ''د'' کی زبان نے کہا مگر ان کی آنکھیں، ہونٹ، چہرہ بشرہ کہنے لگے کہ ایسی خوش قسمتی کے مواقع زندگی میں بار بار نہیں آیا کرتے۔

○

''میرے کرم فرما محمد طفیل صاحب (اڈیٹر نقوش) کی فرمائش ہے کہ چودھری محمد علی صاحب پر مضمون لکھوں۔ انکار کیسے کروں، اس لیے کہ بقول طفیل صاحب کے مجھ سے زیادہ اُن کو یہاں کوئی اور جانتا نہیں ہے۔ اگر لکھوں تو وہ باپ، میں بیٹی۔ پہلے تو ڈر یہ لگتا ہے محبت کہیں صحت سے ہٹا نہ دے، دوسرے ان کی وہ خصوصیات جن سے ان کی زندگی ایک اپنا خاص انداز لیے ہوئے رنگین رہی کیسے لکھوں۔ دنیا کہے گی اور خود چودھری صاحب بھی سوچیں گے کہ حفظِ مراتب کو قائم رکھنا بھول گئی — بہرحال طفیل صاحب کا کہنا ٹالا نہیں جاسکتا۔ کوشش کرتی ہوں کہ چودھری صاحب کو تھوڑا بہت ان ہی کے رنگ میں دکھا سکوں ......''

(بیگم ہما اخلاق حسین، نقوش۔ جنوری ۱۹۵۵، شخصیات نمبر۔ صفحہ ۳۵۴)

اِندر سبھا کی امانت

ہم اودھ والوں کو اندر سبھا سے ایک دلی تعلق ہے۔ جس کو ہم خود سمجھ نہیں سکتے۔ کوئی ناچ گانے کو ہی گناہ سمجھتا ہے کسی کو اندر سبھا کا پلاٹ نہیں پسند ہے کوئی امانت مرحوم کے دیوان سے مقابلہ کر کے کہتا ہے کہ اندر سبھا کی زبان بازاری ہے کوئی اشعار سیٹھے پھیکے بتاتا ہے۔ مگر اندر سبھا کی جگہ ہم سب کے دل میں ہے اگر کسی کی سمجھ میں آسکے تو وہ اس واقعہ سے سمجھ لے کہ گلفام کا پارٹ ہمارے اودھ کے آخری بادشاہ سلطان عالم واجد علی شاہ کیا کرتے تھے۔ عورتیں ان کو جان عالم کہا کرتی تھیں، اور مرد جہاں پناہ کہتے تھے اندر سبھا دیکھنے والے کہتے تھے کہ واہ! گلفام ہو تو ایسا تو ہو۔ لیجیے بات میں بات نکلتی ہے کہانی کے درمیان ایک اور کہانی سن لیجیے۔

پہاڑوں کی راہ کٹھن ہوگئی تھی۔ سرد ہوا تیر کی طرح پار ہوتی تھی اور گزشتہ سورماؤں کی بکھان کرنے والا بہت بوڑھا تھا۔ اس کی سفید کاکلیں اور نازک زرد چہرہ پتا دیتے تھے کہ اس نے سکھ کے دن بھی دیکھے ہیں۔ اس کی بچی کھچی کائنات اس کا تانپورہ ایک لڑکا کاندھے پر رکھے پیچھے پیچھے چلا آتا تھا۔ یہ بدنصیب ان لوگوں کا آخری شخص تھا جو سرحد کے جانبازوں کی بہادری کے گیت گاتے تھے۔ زمانہ بدل گیا پرانی باتیں خواب ہوگئیں۔ اب ایک اور شخص قدیم بادشاہوں کے تخت پر بیٹھا تھا۔ موجودہ زمانے کے کٹر لوگوں نے اس غریب کے بے ضرر لطیف فن کو گناہ ٹھہرایا تھا۔ انھیں تلوار کے دھنی لوگوں کی ایک نام لیوا ایک سن رسیدہ امیرزادی تھی جو اس کی قدردان تھی۔ نہ معلوم کون امیدیں لے کر یہ اسی کے دربار میں پہنچا۔ اسلحہ سے سجا ہوا دربار کا کمرہ دیکھا گذرا ہوا زمانہ آنکھوں کے سامنے پھر گیا۔ مگر برسوں کی چھوٹی ہوئی مشق سے انگلیاں مفلوج تھیں اور آواز غم اور مصیبت سے بھرائی تھی۔ عزت کی جگہ بٹھایا گیا مگر گاتے نہ بنتا تھا۔ امیرزادی نے دلاسا دیا اور دل بڑھایا کہ اتنے میں نہ معلوم کب

کی دبی ہوئی آگ بھڑک اٹھی۔ جیسے جوانی واپس آگئی۔ اس نے پھر اسی قدیم آن سے اس امیرزادی کے بزرگوں کے گیت گانے شروع کیے جس میں سرحد کے بہادر تیر تلوار اور نیزوں سے کھیلتے تھے اور جان کی بازی لگاتے تھے۔

خیر یہ تو جملہ معترضہ تھا جس کا مطلب بعد کو نکلے گا۔ اب اصلی کہانی سنیے۔ تھوڑے دن اُدھر نوٹنکی کی بدتمیزی اور سنیما کے راج کے پہلے اندرسبھا کی کمپنیاں جگہ جگہ قائم تھیں اور صوبے بھر میں دورہ کرتی پھرتی تھیں۔ ان کو دیکھ کر اودھ والے اسی طرح متاثر ہوتے تھے جیسے والٹر اسکاٹ کی بوڑھی امیرزادی اپنے ملک کے پرانے گیت سُن کر ہوتی ہوگی۔ جن لوگوں نے سلطان عالم کا زمانہ دیکھا ہوگا ان کا ذکر نہیں۔ جو لوگ بعد کو آئے وہ کیوں متاثر ہوتے تھے جو کچھ اچھا رہا ہوگا وہ انھوں نے دیکھا نہیں جو سنا ہوگا وہ دل خوش کن نہ تھا۔ پھر یہ دل پر چوٹ کیوں لگتی تھی۔ اس ڈیماکریسی (democracy) بلکہ سوشلزم(socialism) اور کمیونزم(communism) کے زمانہ میں دل کی بات کہہ کر کون اپنے کو ہنسائے، جوان فکر لوگوں میں بوڑھا کہلائے مگر تاب نہیں ہوتی۔ کہے دیتا ہوں کہیں ان کے نمک کا اثر نہ رہا ہو۔

داستان گو صاحب آپ واقعی سٹھیا گئے ہیں۔ نمک کی آپ نے خوب کہی نمک ملک میں پیدا ہوتا تھا کوئی ان کے باپ کا تھا۔

اے ہے میرا مطلب آپ نہیں سمجھے خیر ہوگا جانے دیجیے۔ کہانی سنیے اس کہانی کے ہیرو بھی اندرسبھا کے سیکڑوں گلفاموں میں سے ایک تھے۔ اس زمانے میں ٹکٹ وغیرہ کا رواج کم تھا۔ اس کے بجائے یہ ہوتا تھا کہ جوار یا شہر میں جس رئیس نے چاہا تماشہ کروا لیا۔ اور دیکھنے والے بے روک ٹوک کے جمع ہوگئے۔ جب کہیں سے مانگ نہ آئی تو مشق کے لیے یا دل کے تقاضے سے یہ لوگ خود ہی تماشہ کرتے رہتے اور اردگرد کے عورت مرد مفت تماشہ دیکھا کرتے۔ روپ بھرنے کے آج والے طریقے کہاں تھے کہ ایکٹر دانت توڑوا ڈالیں اور مختلف ساخت کے چوکے بنوالیں جس سے صورت بدل جایا کرے۔ اس زمانے میں روپ تو ضرور بھرتے تھے مگر قدرتی صورت کی محتاجی آج سے زیادہ تھی۔ اس وجہ سے گلفام ایسا آدمی تجویز کیا جاتا تھا جو اسٹیج کے

باہر بھی گلفام ہی نظر پڑے۔ ہماری کہانی کے ہیرو مدّے خاں چھوٹی حیثیت کے صرف اتنا پڑھے تھے کہ اندرسبھا پڑھ کر یاد کرلیں۔ جاہل ہوں، کم حیثیت ہوں مگر حکومت کرنے کا کمال خدا کے یہاں سے لائے تھے۔ گاؤں میں اگر کہیں چوری ہوجاتی ہے اور پولیس تحقیقات کرنے آتی ہے یا کوئی حاکم دورے پر آتا ہے تو بعد کو لڑکے ان واقعات کی نقل کیا کرتے ہیں۔ ایک لڑکا ہوتا ہے جو بلا اختلاف رائے تھانہ دار تجویز کیا جاتا ہے اور اسی طرح ایک ہوتا ہے جو چور یا حاکم کا رول لیتا ہے۔ مدّے خاں بھی اسی طرح کے تھے کہ اپنے ہم چشموں میں صرف ممتاز ہی نہیں تھے بلکہ ہر کام میں سب کی نظر انھی پر پڑتی تھی اور لوگ بے ارادہ ان کا حکم مان لیتے تھے۔ اندرسبھا کا خیال بھی سب سے پہلے انھی کو آیا تھا اور انھی نے دوسرے ایکٹروں کو بھی بھرتی کیا تھا۔ ہفتے میں ایک رات کو تماشہ ضروری ہوتا تھا اور جب سہالگ یعنی بیاہ شادی کا زمانہ ہوتا تھا یا جب کوئی نیا ایکٹر بھرتی کیا جاتا تھا تو ہفتے میں دو تین راتیں تماشہ کے لیے الگ کردی جاتی تھیں۔

گاؤں بھر کی عورتیں، بچے اور نوجوان لوگ جمع ہوجاتے تھے۔ جوان عورتوں میں تو دن کو بھی اسی کا چرچا اکثر رہتا تھا۔ اسی کے گانے گائے جاتے تھے اور باتیں کرنے میں بھی اندرسبھا کا تلازمہ آجاتا تھا۔

ایک روز اندرسبھا والے جمع تھے۔ شاید کہیں باہر سے بلاوا آیا تھا یا مشق کرنے کا ارادہ تھا کہ گاؤں میں ایک طرف آگ لگی، دھواں اٹھا ہی تھا کہ گاؤں بھر جمع ہوگیا۔ رسّی، ڈول، گھڑے، سیڑھیاں، لمبی لمبی لاٹھیاں جیسے یکبارگی زمین سے نکل پڑیں۔ شور کرنے والوں نے آسمان سر پر اٹھا لیا۔ لوگ ایک طرف بجھاتے تھے کہ آگ دوسری طرف زبان درازیاں کرنے لگتی تھی۔ اتنے میں ایک کھلی ہوئی چھت پر ایک عورت کی چیخ کی آواز آئی۔ گھر کے اندر تو آگ لگی ہی ہوئی تھی وہ غریب اترتی کدھر سے۔ کونے میں دوسری طرف چھپر تھا۔ وہاں آگ اس وقت تک نہیں پہنچی تھی۔ مگر وہ چھپر گرایا بھی نہیں جاسکتا تھا۔ لوگ چھپر کو تو صبر کرسکتے ہیں لیکن آدمی کی جان بڑی چیز ہے۔ اے لیجیے ادھر بھی آگ نے لے لیا۔ سیڑھی لگائی گئی اور ایک آدمی چھت پر چڑھ

ہی گیا۔ مگر اترے کدھر سے، جدھر سے وہ چڑھا تھا، دیواروں پر چاروں طرف پر چھتیاں تھیں۔ ادھر بھی آگ پہنچ گئی تھی مگر وہ شخص جان پر کھیل گیا اور اس عورت کو گود میں لے کر مکان کے پچھواڑے کود گیا۔ کسی کا گھٹنا ٹوٹا کسی کی ٹھڈی خون بہہ نکلا۔ مگر جانیں دونوں کی بچ گئیں۔ دیکھا گیا تو میاں گلفام تھے اور وہ جو ان کی اصلی زندگی میں آئندہ چل کر سبزی پری ہوئیں۔

جہاں جان کی جوکھم آن پڑتی ہے وہاں تصنع بنوٹ کا لفافہ دور جا پڑتا ہے اور آدمی کی اچھائی برائی سامنے آجاتی ہے پھر سکھانے پڑھانے کی ضرورت نہیں رہتی کہ کون بھروسے والا آدمی ہے کون نہیں، عورت کی روح ایسا ہی آدمی پسند کرتی ہے یا کسی دوسری طرح کا۔ یہ کسی پڑھے لکھے آدمی سے پوچھیے یا اس قصے کی ہیروئن دَھنّا سے پوچھیے کہانی کہنے والے کو علم النفس نہیں آتا۔ کھلتی ہوئی سانولی رنگت، چھریرا بدن، آنکھوں میں وہ موہنی کہ آدمی کا کون ذکر پری کا دل موہ لیا۔ تماشہ دیکھنے والوں میں کون عورت ہوگی جو ایک خیالی پہلو سے اپنے آپ کو سبز پری کی جگہ نہ سمجھتی ہوگی۔ آخر آپ نے بھی ناول پڑھے ہیں۔ نہ معلوم کتنے بار اپنے آپ میں ہیرو، ہیروئن کی جھلک پائی ہوگی۔ اس سے بھی زیادہ اثر گانے کا پڑا۔ ایک تو گلفام اور پھر تلوار باندھے۔ بسنت رت جب آتی ہے تو چڑا چوں چوں کرکے چڑیا کو اپنے بس میں کرلیتا ہے۔ غریب دَھنّا تو پھر آدمی کا بچہ تھی۔ جو بات سمجھتی تھی گو شودر تھی، محبت نے خیال میں جو نفاست پیدا کردی ہو وہ درکنار رہا آگ میں پھاند پڑنے والا معاملہ اس کو عورت کی نفسیات سمجھنے والے جانیں۔ ہماری سمجھ سے باہر ہے۔ آگ کے واقعہ کے پہلے نہ معلوم دل میں کیا رہا ہو، لیکن اس کے بعد ''جو بن پیار سے تج دیں'' میں نہ شک رہ گیا تھا نہ کلام، عورت کی ذات بودی کہلاتی ہے۔ مگر جہاں دل کا معاملہ آن پڑتا ہے وہاں اس کی بہادری کی قسم کھائی جاتی ہے۔ یہی حال دَھنّا کا تھا کہ نہ پنچ برادری کا ڈر رہ گیا تھا نہ مار دھاڑ کا۔ دَھنّا خیال کرتی تھی کہ زندگی کا مزا میٹھا۔ سلونا، سیٹھا، کڑوا سب سے مل کر بنتا ہے اور وہی چوکھا ہوتا ہے۔ دنیا اس کو بے حیا سمجھے مگر عورت کی روح پکار پکار کر کہتی ہے ۔

دل و دیں را بہ رہ دوست نثارے کردم
حاصل عشق ہمی بود کہ کارے کردم

دَھنّا کی شادی ہوچکی تھی۔ رخصتی نہیں ہوئی تھی۔ دھنا کے ماں باپ بھی یہی چاہتے تھے کہ جلد رخصت کردیں مگر پنڈتوں کا حساب اور سن کا پھیر ایسا تھا کہ ساعت نہیں بن رہی تھی۔ اسی انتظار میں سال بھر گزر گیا۔ ماں باپ نے کوئی جتن اٹھا نہیں رکھا، نہ معلوم کتنا مارا پیٹا، مگر سوپ بجائے چاہے اونٹ بھاگ جائے لیکن سختی سے دل کی لگی، لگی ہی رہتی ہے ۔

اینہم اندر عاشقی بالائے غم ہائے دگر

خدا خدا کرکے رخصتی کا وقت آیا۔ دَھنّا رو دھوکر سسرال چلیں۔ دَھنّا کی سسرال دور تھی، درمیان میں بڑا گھنا جنگل پڑتا تھا۔ جس وقت وہاں یہ لوگ پہنچے میاں مدّے خاں نے دھاوا بول دیا اور دَھنّا کو چھین لائے۔ نوابی جاچکی تھی مگر عادتیں بگڑی ہوئی تھیں۔ اس طرح کے واقعات اکثر ہوجاتے تھے۔ واردات کی کچھ پوچھ گچھ ہوئی۔ ڈاکے کا مقدمہ تو چلا نہیں لیکن بیاہی عورت کو بھگالے جانے میں میاں مدّے خاں چھ مہینے کے لیے جیل بھیج دیے گئے۔ اس دوران میں دَھنّا کا پوچھنے والا کوئی نہیں رہ گیا تھا۔ غریب نہ میکے کی رہی نہ سسرے کی۔ سسرال والوں کا کیا ذکر خود ماں باپ تک غریب کی طرف پھر کے نہ دیکھ سکے۔ مدّے خاں کی ماں نے البتہ چھاتی پیٹ سے لگایا۔ اور بہو بنا کر رکھا۔ ان کا نام دَھنّا سے بدل کر فوجدارن ہوگیا۔ چھ مہینے کے بعد پھر وہی گلفام اور وہی سبز پری۔ پہلے یہ مشغلہ شروع ہوا تھا دل بہلاؤ کو اور اب روٹیوں کا سہارا ٹھہرا۔ مدّے خاں جب تک جیے ان کی اندرسبھا دوسروں کے مقابلے میں ایسی رہی جیسے دیوتاؤں کی محفل میں اندر۔ گلفام کا پارٹ تو کچھ دنوں کے بعد چھوٹ گیا مگر کالا دیو بہت دنوں تک بنتے رہے۔ پھر یہ بھی گیا اور خالی تجربے کی بنا پر کمپنی کے مالک منیجر کی طرح کام کرتے رہے اور استاد کہلانے لگے۔ بی فوجدارن کی عزت مدّے خاں کے ساتھ بڑھتی گئی اور جتنے ایکٹر تھے ان کو استانی کہتے تھے۔ اتنے میں مدّے خاں کا انتقال ہوگیا۔ فوجدارن نے مدّے خاں کے شاگردوں کے ذریعہ

سے اندرسبھا جاری رکھنی چاہی مگر نہ کرسکیں۔ ناچار ماما گیری کرنے لگیں، رنڈاپے سے زیادہ بڑی بدقسمتی یہ تھی کہ کوئی اولاد نہ تھی۔ اندرسبھا کا وقت گیا تھیٹروں کا زمانہ آیا، تھیٹروں کا زور کم ہوا سینما کا دور دورہ ہوا۔ بی فوجدارن بہت بوڑھی ہوگئیں، مگر دو باتیں نہ چھوڑیں۔ ایک تو جمعرات کے دن مدّے خاں کی قبر پر جانا دوسرے اندرسبھا کا ذکراس طرح کرنا جیسے ابھی کی بات ہے۔ غریب آدمی نہ کوئی آگے نہ کوئی پیچھے مجبوراً نوکری کرلی۔ اس لیے جو کچھ کماتی تھیں اس میں سے کچھ جزو تکلیف اٹھاکے اپنے گور گڑھے کے لیے ضرور رکھتی جاتی تھیں کہ محتاجی میں نہ اٹھائی جائیں۔ ساتھ والیاں ان کی جُوری پر آوازے توازے کستی تھیں کہ نہ معلوم کس کے لیے جمع کر رہی ہیں۔ مگر یہ سنی ان سنی کرجاتی تھیں اور جواب نہیں دیتی تھیں۔ ان کے اثاثے میں ایک بانس کی پٹاری بھی تھی جس پر چمڑا منڈھا ہوا تھا۔ اس کو فوجدارن جان سے زیادہ عزیز رکھتی تھیں۔ ان کے جیتے جی کسی کو نہ معلوم ہوا کہ اس کے اندر کیا ہے گو لوگ اندازہ کرتے تھے کہ عمر بھر کی کمائی اسی کے اندر ہوگی۔ جب ان کا آخر وقت ہوا اور زبان بدل گئی۔ آنکھوں پر پردے پڑ گئے۔ تب یہ کچھ کہنا چاہتی تھیں۔ مگر کسی کی سمجھ میں نہ آتا تھا۔ سکرات میں فوجدارن کو گھنٹوں لگ گئے اور یہ اسی طرح پائی پائی کہتی تھیں۔ پہلے لوگ سمجھے پانی مانگتی ہیں، کسی نے کہا ارے پٹاری تو نہیں کہتی ہیں۔ لوگوں نے پٹاری کھول کر دیکھا تو ایک پوٹلی میں بندھی ہوئی چھ اشرفیاں نکلیں اور ٹوٹا پھوٹا کلابتو سیاہ ستارے مانند۔ گلفام کا تاج ایک عورت نے لاکر اِن چیزوں کو ان کے سینے پر رکھ دیا۔ ادھر رکھنا تھا کہ ادھر معلوم ہوا کہ کلی چٹکی اور بو نکل گئی۔

○

روزہ خور کی سزا

لوگ کہتے ہیں کہ ہر بڑی چیز کی یہ خاصیت ہوتی ہے کہ اصلیت کو ظاہر کردیتی ہے۔ دولت کے لیے شاعر کہتا ہے ؎

بادہ نوشیدن و ہشیار نشستن سہل است
گر بہ دولت برسی مست نہ گردی مردی

شراب کے لیے یہی کہا جاتا ہے کہ آدمی کی شرافت اور کمینہ پن کو آئینہ کردیتی ہے۔ حج اور دوسری بڑی عبادتوں کے لیے کچھ ایسی ہی باتیں مشہور ہیں۔ اکثر جاہلوں کو کہتے سنا ہے کہ ایمان حجر اسود میں چمٹ کر وہیں رہ گیا۔ اسی قبیل کی ایک کہانی مجھ کو بھی یاد آگئی سن لیجیے مگر اس کے پہلے عرض یہ ہے کہ دو تین معترضہ جملے بھی ہیں۔ کنایہ میں جو لطف ہے وہ تصریح میں کہاں۔ مگر ڈر لگتا ہے کہ اگر بیان کرتے نہ بنا تو قصہ گُپ چُپ کا لڈو ہوکر رہ جائے گا۔ برنارڈ شا اسی وجہ سے پچاس صفحے کے ڈرامے کے پہلے دو سو صفحے کا دیباچہ لکھتے ہیں، چھوٹے سارے بالے میاں بڑی ساری پونچھ۔ حضرات ہم کوئی دعویٰ اس قسم کا نہیں کرسکتے۔ ایک چھوٹی سی تمہید لکھنے کے بعد اطمینان سا ہوجاتا ہے کہ اب باوجود ہماری کج بیانی کے لوگ بات کی تہہ تک پہنچ ہی جائیں گے۔

شیخ جی سے نہ مجھ سے ہم مذاقی تھی نہ ہم سنی مگر میرے ان کے مراسم تھے اس کی وجہ یہ ہوئی تھی کہ میں ایک دوست کے یہاں بیٹھا ہوا کچھ قلمی کتابوں کا ذکر کر رہا تھا کہ شیخ جی آگئے اور ہم لوگوں کی باتیں سن کر کہنے لگے۔ میرے پاس کچھ قلمی تصویریں ہیں مجھ کو تعجب ہوا کہ شیخ جی ہڈیوں کا روزگار کرتے ہیں۔ ایسے پڑھے لکھے بھی نہیں ہیں ان کے یہاں قلمی کتابیں کہاں سے آئیں مگر انھوں نے کہا کہ اگر ابھی چلیے تو دکھا دوں۔ میں اٹھا چلا گیا انھوں نے پانچ چھ کتابیں دکھلائیں۔ ایک عملیات کی

کتاب، ایک زہرِ عشق، ایک رقعات عالم گیری جو پچیس تیس برس ادھر کے لکھے ہوئے معلوم ہوتے تھے۔ چند پرانے اوراق قصے کے، خط معمولی تھا اور کاغذ بھی ایسا ہی ویسا تھا۔ معلوم ہوتا تھا کہ کسی نے اپنے لیے زہرِ عشق تو اس وجہ سے نقل کی ہوگی کہ اس کا چھپنا ممنوع تھا اور رقعات عالم گیری وغیرہ پیسے بچانے کو یا مشق کرنے کو نقل کی ہوگی البتہ دو اور کتابیں تھیں۔ ایک منطق الطیر اور ایک کلیات سعدی یہ دونوں ولایت کے خط کی تھیں اور بعد کو کوئی سو برس کی مستند ثابت ہوئیں۔ یہ دونوں نسخے دیکھ کر میری آنکھیں کھل گئیں۔ میں نے کہا شیخ جی یہ آپ نے کہاں سے پائے۔ معلوم ہوا کہ کوئی عزیز ان کے کہیں مولوی گیری پر نوکر تھے۔ اور آخر عمر میں شیخ جی کے یہاں آکر رہے تھے اور یہیں انتقال بھی ہوا۔ ان کے مختصر اثاثے میں یہ کتابیں بھی نکلی تھیں۔ میں نے چاہا کہ شیخ جی مجھ سے ان دونوں کتابوں کے دام لے لیں مگر وہ کسی طرح راضی نہ ہوئے۔ میں نے یہ بھی بتایا کہ یہ کمیاب اور قیمتی کتابیں ہیں اور بھلے چنگے دام ملیں گے۔ مگر شیخ جی نے باوجود کاروباری آدمی ہونے کے اس کو کسی طرح منظور نہیں کیا اس کی دو وجہیں تھیں ایک تو یہ کہ شیخ جی دوسرے مذاق کے آدمی تھے جس میں کتابوں کا نہ ذکر تھا نہ قدر۔ دوسرے ان کی ایک غرض مجھ سے اٹکی تھی اور اسی وجہ سے میں چاہتا تھا کہ وہ دام لے لیں مگر انھوں نے نہ مانا اور کہنے لگے کہ اگر میں نے ان کتابوں کو نہ لیا تو ان کو شکایت ہوگی۔ گو میں ان کا احسان نہیں لینا چاہتا تھا مگر ان نسخوں کو دیکھ کر منھ میں پانی بھر آیا اور میری خودغرضی نے غریب دوراندیشی کو چپ ہی کردیا۔ اس کے بعد شیخ صاحب ہمارے یہاں زیادہ آنے لگے۔ رفتہ رفتہ مراسم گہرے ہوگئے۔ ہمارے بے تکلف ہم مذاق احباب میں ایک صاحب کچھ خدائی فوجدار قسم کے تھے جن کو یہ بے جوڑ دوستی ایک آنکھ نہ بھاتی تھی اور شیخ جی اور ان کا سامنا اگر ہوجاتا تھا تو منٹ دو منٹ کے بعد کوئی نہ کوئی بہانا کرکے وہ اٹھ جاتے تھے۔ اکثر مجھ سے کہا بھی کہ شیخ جی اور تمھاری دوستی کے دو ہی معنی ہوسکتے ہیں۔ یا تو تم ہڈی کا روزگار کرنا چاہتے ہو یا شیخ جی عنقریب شعر کہنا شروع کردیں گے۔ شیخ جی سے مراسم کی بنا پر ان کے ایک قرض دار میرے پاس آئے اور کہنے لگے کہ ایک جزو جائداد میری شیخ جی کے پاس رہن باقبضہ ہے جس کو شرائط دستاویز کی بنا پر میں آٹھ نو برس نہیں چھڑا سکتا۔ اگر

آپ اپنے دوست سے سفارش کردیں تو میرا کام بن جائے۔

میں: حضرت، معاملات میں مجھ کو نہ ڈالیے میرے اور شیخ جی کے نازک مراسم اس بار کو شاید نہ برداشت کرسکیں اور شاید روپیہ بھی آپ سے فراہم نہ ہوسکے۔

وہ صاحب: روپیہ میں کہاں پاتا، مگر اِس وقت ایک شخص اس جائداد کو بیع لینے پر تیار ہو گیا ہے اگر یہ معاملہ ہوجائے تو شیخ جی کا قرضہ نکالنے کے بعد مجھ کو سو دو سو روپیہ بچ جائیں گے۔

ان صاحب کی مفلوک الحالی اور شریف تباہی پر مجھ کو تاسف آیا اور میں نے کہنے کا وعدہ کرلیا مگر اس سے زیادہ امید نہیں دلائی۔

دوسرے دن شیخ جی سے ملاقات ہوئی۔

میں: شیخ جی آپ کے فلاں عزیز اور راہن کہتے تھے کہ اگر آپ ان کو مرہونہ جائداد بیع کرنے کی اجازت دے دیں تو آپ کا قرضہ ادا کرنے کے بعد ان کو سو دو سو روپیہ بچ جائیں گے۔

شیخ جی: اس جائداد میں اتنی گنجائش کہاں ہے۔ میں نے جو روپیہ ان کو دیا ہے وہی اس کے دام سے زیادہ ہے اور اس کو کون مول لے گا۔

میں: میں نے صرف اس وجہ سے عرض کردیا کہ میں نے راہن صاحب سے وعدہ کیا تھا ورنہ میں نہ آپ کے نقصان کا ساتھی ہوں نہ راہن صاحب سے مجھ سے اس قدر مراسم ہیں کہ آپ ایسے عنایت فرماؤں پر زور ڈالنے کی جرأت کروں۔

شیخ صاحب: جی نہیں۔ آپ کا فرمانا ایسا نہیں ہے کہ میں خیال نہ کروں آپ ان سے کہہ دیجیے کہ اگر میرا روپیہ وصول ہوجائے تو مجھ کو کوئی عذر نہیں۔

میں: دیکھیے شیخ صاحب میں پھر عرض کرتا ہوں کہ اگر مجھ کو کسی سے واسطہ ہے تو آپ سے۔ ان صاحب سے تو صرف شناسائی ہے۔ آپ میرے خیال سے ایسا ہرگز نہ کیجیے گا۔ میں آپ کے نقصان کا ساتھی کیسے ہوسکتا ہوں۔ اس معاملہ میں میری حیثیت ایک پیغام پہنچانے والے سے زیادہ نہیں ہے۔

شیخ جی: جی نہیں انھوں نے کچھ تو سمجھ کر آپ سے کہلایا ہے۔ آپ ان سے کہہ دیجیے کہ میں جائداد چھوڑنے کے لیے ہر وقت تیار ہوں۔ یہ خوشخبری میں نے راہن صاحب کو دے دی۔

رمضان شریف کا مہینہ نچوڑ کا وقت تھا کہ راہن صاحب نازل ہوگئے۔ شیخ صاحب کو آدمی گیا کہ ذرا تکلیف کیجیے وہ بھی تشریف لائے میرے پڑھنے والے۔ اس میٹھی پھیکی کہانی پر مجھ سے خفا نہ ہوجئے آپ کی خدمت میں حاضر ہونے کو دل بے تاب تھا ؎

تقریب کچھ تو بہر ملاقات چاہیے
اگر کوئی رنگین کہانی دماغ میں نہ تھی تو کیا کرتا
"گندم اگر بہم نہ رسد بھس غنیمت است"

شیخ جی یعنی مرتہن صاحب اور خریدار صاحب دونوں روزے سے تھے اور ایک دوسرے کو یوں دیکھتے تھے جیسے اپنے مقابل ہی سے روزہ افطار کرنے کا ارادہ ہے۔ خالی موقع اور وقت کا انتظار ہے۔

شیخ جی کے انداز پر میرا ماتھا پہلے ہی ٹھنکا تھا کہ یہ اتنے سہل میں راضی ہوگئے ہیں۔ اس کے معنی کیا ہیں۔ بے چارے نے پیسہ پیسہ جوڑ کر اپنی حیثیت بنائی ہے اگر یہ اسی طرح کی دریادلی سے کام لیا کرتے تو آج یہ اطمینان کہاں سے نصیب ہوتا ہو نہ ہو یہ مجھ کو زیربار احسان کیا چاہتے ہیں۔ اور پھر خیال آتا تھا کہ تم کون اتنے بڑے آدمی ہو کہ جس کے ذریعہ سے ان کا ہزار پانچ سو کا فائدہ ہونے والا ہے۔ دو بدو گفتگو میں سچائی کی ایک کھنک ہوتی ہے جیسے کھرے روپیہ میں۔ ان کی گفتگو دل کی کسوٹی پر پرکھتا تھا، اور رہ جاتا تھا۔ راہن صاحب کی پریشان حالی بھی ایک طرف دل میں جگہ کرچکی تھی۔ اس وجہ سے قوت متصرفہ بھی کچھ کمزور سی پڑ گئی تھی۔ اسی پس و پیش میں تھا کہ مرتہن صاحب بھی آگئے اور ان کو یہ خوش خبری دینا ہی پڑی۔

مرتہن صاحب: آپ ہی خریدیں گے۔

راہن صاحب : جی ہاں۔

مرتہن صاحب : آپ کیا کھا کے خریدیں گے۔

خریدار صاحب : ارے ہم تو یہ خرید لیں اور آپ کو بھی خرید لیں۔

مرتہن صاحب : آپ ضرور خریدیں گے ایسے جھپ جھالیے بہت دیکھے ہیں۔

خریدار صاحب : جھپ جھالیے ہوگے تم اور تمھارے باپ، ہڈیاں بیچ بیچ کر چار پیسے جمع کر لیے ہیں اس پر آئے ہیں ہم سے باتیں کرنے۔

مرتہن صاحب : اور تم نے سوائے تھانہ داروں کی دلالی کرنے کے عمر بھر کیا کیا ہے۔ کچھ پونجی ہوگئی بس اپنے آپے سے باہر ہوگئے۔

میں: ہاں ہاں صاحب آپ لوگ لڑتے کیوں ہیں شریفوں کی طرح باتیں کیجیے۔ آپ معاملہ طے کرنے آئے ہیں یا گالی گلوج کرنے۔

خریدار صاحب : میں نے تو کچھ کہا بھی نہیں تھا۔ یہ تو انھوں نے آتے ہی آتے اس قسم کی باتیں شروع کیں۔

راہن صاحب : اچھا اب آپ ہی طرح دے جائیے ہوگا۔

خریدار صاحب : طرح کیا دی جائے کہیں دو چار سو روپیہ پانچ چھ روپیہ سیکڑہ پر لگائے ہوں گے اس پر آئے ہیں مقابلہ کرنے۔

شیخ جی : (گرج کر) بارہ روپیہ سیکڑہ سے کم پر تو ہم بات نہیں کرتے ہیں۔

خریدار صاحب : چلو ہمارے ساتھ ہم چوبیس روپیہ سیکڑہ تک کی دستاویزیں دکھلا دیں اور کمیشن اوپر سے۔ تم کو نصیب نہ ہوا ہوگا یہ نرخ لینا۔

میں: ان فضول باتوں سے کون مطلب، اگر آپ کو لڑنا ہی ہے تو باہر جا کر لڑیئے۔

ناظرین ان حضرات کی طرف سے میری معذرت قبول کیجیے۔ خدا کے یہ نیک روزہ دار بندے نہ خاندانی مہاجن تھے نہ باپ دادا کے وقت سے سودخواری کے مشاق تھے۔ اسی وجہ سے معاملہ فہمی میں کچھ کسر باقی رہ گئی تھی مگر قرینے سے معلوم ہوتا تھا کہ

ایک پشت کے بعد باوجود رمضان شریف کے بردباری اور سودخواری دونوں میں مضبوط ہوجائیں گے۔ ان حضرات کے منہ سے جھاگ اڑ رہی تھی۔ لہریں نہیں بلکہ جوار بھاٹے آرہے تھے۔ ہونٹوں کے کناروں پر سمندر پھین جمتا جاتا تھا اور ان دو نیک لوگوں میں ہم روزہ خور گناہگار پھنس گئے تھے ان کے منہ سے خوشبوؤں کے بقعے بھق بھق اڑ رہے تھے اور ہم محسوس کر رہے تھے کہ روزہ نہ رکھنے کے عذاب میں گرفتار ہیں۔ اسی تو تو میں میں کے درمیان میں ہمارے خدائی فوجدار قسم والے دوست بھی آگئے۔ تھوڑی دیر چپ رہے۔ اس کے بعد میری پریشانی دیکھ کر کہنے لگے ''شیخ جی سی دوستی بھی کرو گے اور روزہ بھی نہ رکھو گے اور روزہ دار کے منہ کی بو سے بھی گھبراؤ گے۔ آخر تمھارا حشر کیا ہونے والا ہے۔''

○

''.......... اگر بیٹی مجھ سے پوچھو تو سچا ہندو اور اس کی راج نیت کو تمھاری ڈیماکریسی سے بھی بہتر سمجھتا ہوں۔ آج بھی اگر ہندو پر سے انگریزی شراب کا نشہ اتر جائے تو ہندو کا کیا کہنا۔ اپنے مولوی اور ہندو فقیر کا مقابلہ کرلو۔ تمھارا مولوی اپنے کو بے دلیل نائب رسول کہتا ہے۔ اُس کا فقیر اپنے کو خدا کا جزو سمجھتا ہے۔ یہ رسالت کا انداز چھوڑ کر فرعونیت کی شان سے کفر کا فتویٰ دیتا ہے وہ اپنے دل کی وسعت میں سب کی جگہ پاتا ہے..........''

(ہما بیگم کے نام خط)

دھوکا

ناجو غریب کا بچہ تھی مگر پیدائش اچھی ہونے کی وجہ سے اپنی ساتھ والیوں سے بڑی معلوم ہوتی تھی کیا کھایا کیا پیا مگر ہاتھ پاؤں ایسے تھے کہ دیکھنے والا جانے کہ دودھ ملیدے ہی پر پلی ہے۔ صورت پر بھی وہ شان تھی کہ شاہزادیاں شرما جائیں معلوم ہوتا تھا کہ جوانی پر آ کر اگر تاج پہن لے گی تو بے جوڑ نہ لگے گا۔

کھیت میں ککڑی اور گھر میں لڑکی کی باڑھ مشہور ہے۔ دیکھتے دیکھتے بڑی سی ہوگئی۔ سات ہی اٹھ برس کے سن میں یہ حال تھا کہ ماں کے پہلو میں بیٹھتی تھی تو آدھی بی بی معلوم ہوتی تھی۔ باپ ناظمہ کہتے تھے۔ ماں جب تک جئیں ناجو ہی پکارا کیں۔ گیارھواں برس رہا ہوگا کہ باڑھ پر آگئی۔ بارھویں برس بھرنا شروع ہوئی تیرھویں برس ایسی ہوگئی کہ ماں باپ سے نگاہ بھر کے دیکھا نہیں جاتا تھا ماں کو بیاہ کی فکر پڑگئی۔ اِس زمانے میں بَر بڑی بڑی امیر زادیوں کو نہیں جڑتا، غریب کس کھیت کی مولی ہے۔ یہ جوانی، یہ خوبصورتی دیکھ کر ماں باپ کی چھاتی پہاڑ ہوجاتی مگر یہاں نگاہ بھر کے دیکھنا مشکل تھا۔ باپ صرف اچٹتی نظر ڈالتے تھے ماں کہتی تھی دیکھتے ہو، اب کیا کسر ہے کچھ نسبت کی بھی فکر کروگے کہ کالا پہاڑیوں چھاتی پر رکھا رہے گا۔

دیوانی عدالت کے منصرم صاحب کی دوسری بیوی کا بھی انتقال ہوگیا تھا ہمدردوں نے جوڑ توڑ ملا کر شادی کروا ہی دی۔

منصرم صاحب کا سن چالیس کے لگ بھگ رہا ہوگا۔ چالیس بیالیس برس کا مرد بڑھا نہیں کہا جاتا ان کی کاٹھی بھی اچھی تھی مگر پندرہ اور بیالیس میں اچھا خاصہ فرق ہوتا ہے۔ شاید یہی وجہ تھی کہ ناجو نے ہجولیوں میں بھی بیٹھ کر کبھی اپنے سن کی ایسی باتیں نہیں کیں۔ ہمیشہ بھاری بھرکم اپنے کو لیے دیے رہیں۔ سولہ برس کے سن میں بھی مزاج اور حوصلہ اِکسٹھ برس والی کا ایسا رہا۔

ایک بڑے بدصورت ادھیڑ میاں اور ایک خوبصورت کمسن بی بی راستے میں چلے جاتے تھے۔ بی بی نے ایک کتے کی جوڑی دیکھی، جو دونوں ایک ہی طرح کے تھے۔ میاں سے کہنے لگیں ایسا جوڑ ملتے بھی کم دیکھا ہوگا۔ انھوں نے جواب دیا ساتھ رہتے رہتے پہلے خیالات اور پھر صورت ملنے جلنے لگتی ہے۔ بی بی کا جی دھک سے ہوگیا کہنے لگیں میری جان کیا ہمیشہ یہی ہوتا ہے؟

منصرم صاحب شریف خصلت نیک نام آدمی مشہور تھے۔ گھر کے بھی خوش حال کہے جاتے تھے۔ شاید تیسری شادی نہ کرتے مگر اولاد کی تمنا اور بیماری حیرانی میں ہمدرد کی ضرورت نے مجبور کردیا۔ لڑکی والوں کی فرض سے سبکدوشی حاصل کرنے کی مصلحت نے اس سِن کے فرق کا زیادہ خیال کرنے بھی نہ دیا۔ حالانکہ ناجو کی ماں ہی نے نسبت پسند کی تھی مگر اسی کے ساتھ تنہائی میں میاں سے دبی زبان سِن کے فرق کا بھی ذکر کیا تو انھوں نے یہ کہہ کر بات ٹال دی کہ سب کچھ تو کسی کو نہیں ملتا۔ ناجو پھندنا سی دلہن بنیں، دیکھ کر ماں باپ کا کلیجہ ٹھنڈا ہوا۔ دو سوتوں کا گہنا پہن کر سونے میں گندھ گئیں۔ چاہنے والا میاں پایا، ہر طرح کا چین آرام ہاتھ آیا۔ منصرم صاحب بھی خوشی میں خضاب جلدی جلدی لگانے لگے۔ ناجو نے جانا دنیا میں ایسا ہی ہوتا ہے۔ میاں بی بی کے راز، پردے کی بات کسی کو کیا معلوم۔ مگر خدا کو دیکھا نہیں عقل سے پہچانا ہے۔ سن کے تقاضے سے شوخی چلبلاہٹ کا جواب شائستگی سے ملتا رہا ہوگا تو یقیناً ناجو اس کو بھی زندگی کے کھیل کے ضروری قاعدوں میں سمجھتی رہی ہوں گی۔ پیٹ کا مِلا کر ناجو کی شادی پندرھویں سال ہوئی تھی زن جوان و مرد پیر سبد بیارد بچہ گیر۔ ڈیڑھ برس میں ماں بھی بن گئیں مگر کیا بچہ ہوا جیسے چوہیا کا بچہ۔ پیدا ہونے کے بعد بڑی دیر تک تو رویا نہیں لیڈی ڈاکٹر نے بڑی بڑی ترکیبیں کیں چیں چیں آواز نکلی اور پھر ہمیشہ کے لیے بند ہوگئی۔ ناجو البتہ بہت دن بیمار رہیں۔ اس کے بعد ہمیشہ کے لیے قابلہ کی روزی کا سامان ہوگیا مگر ناجو کے پھر بچہ نہ ہونا تھا نہ ہوا۔ ناجو تیس اکتیس سال کی تھیں کہ رانڈ ہوگئیں۔ منصرم صاحب پنشن لے کر اپنے وطن چلے گئے تھے۔ تقریباً دو ہی برس آرام کیا تھا کہ دوامی آرام گاہ میں پہنچ گئے۔ ناظمہ بیگم کے ماں باپ پہلے ہی

مر چکے تھے۔ اب منصرم صاحب بھی ختم ہو گئے۔ ناظمہ بیگم تن تنہا رہ گئیں۔ جائداد رکھ کر یکسوئی سے زندگی بسر کرنا کسی کے امکان میں نہیں۔ چہ جائے کہ پردہ دار رانڈ۔ منصرم صاحب ناظمہ بیگم کے لیے ہر طرح کی مضبوطی کر گئے تھے مگر پھر بھی بغیر ایک ہمدرد کے کیسے کام چلتا۔ منصرم صاحب کے اعزاء کو مرحوم کی جائداد سے کچھ ملا نہیں تو انھوں نے کوئی واسطہ بھی نہیں رکھا۔ محلہ میں ایک لڑکا رہتا تھا بیس اکیس برس کا سن رہا ہوگا مگر نہایت شریف لائق اور سلیقہ مند محلہ کے رشتے سے منصرم صاحب مرحوم کو چچا کہتا تھا اور جب وہ پنشن لے کر آئے تھے یہ پیش پیش رہتا تھا۔ میں اصلی نام تو اس کا بتا نہیں سکتا قصے کی ضرورت سے صغیر احمد کہہ لیجیے۔

یہاں میاں صغیر آڑے وقت میں کام آئے اور خداترسی سے سب کام کردیا کرتے تھے۔ دن بھر میں اگر چار مرتبہ ضرورت ہو تو یہ اپنے کام کا ہرج کر کے حاضر رہتے۔ جھوٹوں بُلا بھیجو تو غریب ڈیوڑھی میں پردے کے پاس موجود۔ ان کو اپنا ذاتی کام زیادہ تھا بھی نہیں۔ اکیلے تھے، ماں باپ نے بودگی اچھی خاصی چھوڑی تھی دو چار مکانات بھی تھے۔ اس میں سفید پوشی سے کاٹتے تھے۔ شادی تو ہوچکی تھی مگر بی بی سے بنی نہیں چوتھی چالے کے بعد سے پھر ایک نے دوسرے کی صورت نہیں دیکھی تھی۔ تین برس ہونے کو آتے تھے مگر ملاپ کی کوئی صورت نہ تھی بگاڑ مزمن عارضے کی طرح جڑ پکڑ گیا تھا۔

جب صغیر ناظمہ بیگم کے اتنے کام آتے تھے تو یہ کہاں کی کئی گزری تھیں کہ ان کا حال پوچھ کر ہمدردی نہ کرتیں۔

مقدمات معاملات کی باتیں پردے کے پاس آہستہ آہستہ ہوتی تھیں، اس لیے بعد کو ہمدردی یگانگی کی باتیں بھی اسی مدھم آواز میں ہوا کرتی تھیں باتیں کون تھیں صرف یہی کہ ''کیا کیا کرتے رہتے ہو'' اپنی بی بی سے ملاپ کیوں نہیں کر لیتے۔ گھر آباد ہوجائے پڑوس میں ایک ہمدرد بڑھ جائے۔ صغیر اس کے جواب میں صرف یہی کہتے تھے اب ملاپ قیامت میں ہوگا، اور پان لے کر چلے جاتے تھے۔

صغیر کے چلے جانے کے بعد ناظمہ بیگم کے دل کے اندر کوئی ان سے باتیں کرنے لگتا تھا۔

سنیے صاحب میں کہانی لکھتا نہیں ہوں کہانی کہتا ہوں، اگر آپ کو اس میں دوبدو باتیں کرنے کا مزا نہیں آتا تو اس بکواس کو دور دفان کیجیے۔ اگر اچھی معلوم ہوتی ہو تو سنتے جائیے کہ ناظمہ بیگم صاحبہ کی سلیم عقل نے کیا کہا۔ ان کی دبی ہوئی خواہش نے کیا کہا اور ان کے حس باطن نے عقل و خواہش سے کیا کچھ کہلایا۔

اندر والا : سنو بی ناجو تم اور صغیر پردے سے لگے گھڑیوں باتیں کیا کرتے ہو اور جو کوئی کچھ کہہ دے۔

ناجو: مجال ہے جو کوئی کچھ کہہ دے۔ کر نہیں تو ڈر کسی کا، بھلا مجھ سے آٹھ برس چھوٹا اور پھر وہ تو مجھ کو چچی کہتا ہے۔

اندر والا: یہ تو ٹھیک ہے مگر تم جب دیکھو اس کی بی بی کا ذکر کیوں کیا کرتی ہو۔

ناجو: تو اس میں کیا ہرج ہے اگر میرے خیالات دوسرے ہوتے تو اس کی بی بی نگوڑی کا ذکر کیوں آتا۔

اندر والا : تم ہنسنے زیادہ لگی ہو۔

ناجو: ہنسی آتی ہے تو کوئی کیا کرے۔

اندر والا: پہلے کیوں نہیں ہنستی تھیں۔ ہنسی تو پھنسی پرانی مثل ہے۔

ناجو: ہوا کرے مثل، میرے بڑھے پر سے ہزاروں جوان صدقے اتارے ہیں۔ خیر اب اس کا ذکر ہی کیا۔ جب جوانی میں اس طرح کے خیالات نہیں آئے تو اب بڑھاپے میں اس کا کیا ذکر۔

اندر والا : بوڑھی تو تم بالکل نہیں ہو اس کو تم بھی سمجھتی ہو۔

ناجو: میرے تو ایک لڑکا بھی ہوا ہے اس کی بیوی تو ویسی ہی پٹھیا بنی ہے۔

اندر والا: مگر وہ صورت میں تمھارے تلوؤں کے برابر نہیں ہے۔

ناجو: یہ ٹھیک ہے مگر اس سے ملاپ تھوڑی ہونے کو ہے۔

اندر والا : اور جو ہوجائے۔

ناجو: ہوجائے تو ہماری جوتی سے لتڑے سے پاپوش سے مگر نہ ہوتا تو اچھا تھا۔

اندر والا: یہ دیکھو کھلا نا، یہی تو میں کہتا تھا۔

ناجو: ہوگا بھئی پھر ہم کیا کریں۔ نیند نہیں آتی تو یہی سوچنے لگتے ہیں کوئی نہ کوئی خیال آئے گا تو ضرور۔

اندر والا: اور اسی کو سوچتے سوچتے سو بھی جاتی ہو۔

ناجو: ہاں سو جاتے ہیں سوجاتے ہیں تب نہیں تو اب سوجاتے ہیں۔ منصرم صاحب تو ہیں نہیں ہمیں ڈر کس کا پڑا ہے۔ کر ہی لیں تو ہمارا کوئی کیا کرے گا۔

اندر والا: ہاں اب ٹھیک راستے پر آگئیں۔ یہی تو میں کہتا تھا کہ جو کچھ کرو ہم سے صلاح مشورہ لے کر کرو۔ ہم تمھارے ساتھ ہیں۔ واقعی اگر صغیر کے ساتھ ہوجائے تو بے جا نہیں۔ گو اور سب باتوں کا آرام رہا مگر ہم سن کو جی ترس گیا۔

دنیا اور باتوں میں نکمی ہو یا ہوشیار ریاضی خوب جانتی ہے یعنی ایک اور ایک جوڑ کر دو کا نتیجہ نکالنے میں کبھی غلطی نہیں کرتی۔ دو ہی چار دنوں میں بندھنوں باندھنے والی دنیا نے ہوئی اور اَن ہوئی باتوں کو اکٹھا کرکے اچھا خاصہ پلاٹ تیار کرلیا۔ جس کی ہیروئن ناظمہ بیگم اور ہیرو میاں صغیر ٹھہرے۔ شدہ شدہ یہ بات ناظمہ کے بھی کان تک پہنچی۔ بے چاری بہت پریشان ہوئی کر تو کر نہیں تو خدا کے غضب سے ڈر۔ تمام زندگی ایک سرے سے دوسرے سرے تک نگاہ کے آگے پھر گئی۔ وہ موتی کی آب جو آج تک ویسی کی ویسی ہی تھی، مدھم پڑتی دکھائی دی۔

آپ لوگ ناظمہ کے دلی راز سے ہزار واقف ہوں پھر بھی عورت کے دل کی بات سمجھنے کا کون دعویٰ کرسکتا ہے۔

منصرم صاحب کو یاد کرکے آج ناظمہ ایسا روئی کہ شاید کبھی نہ روئی ہوگی۔ آج

ضروری کام کا بھی ہرج ہوگیا مگر صغیر کو نہیں بلایا۔ دوسرے دن وہ خود آئے رفتہ رفتہ اندر والے نے صلاح بتائی۔ آبرو پر سے جان قربان ہے تم ہزار پاک صاف رہو مگر دنیا بے دوکھ لگائے نہ چھوڑے گی۔ اگر اس کو ہرانے کی کوئی ترکیب ہے تو یہی کہ نکاح پڑھوالو۔

ناظمہ اپنے منہ سے کیا کہتیں مگر اس کا انتظام کچھ مشکل نہیں تھا کہ چھیڑ اُدھر ہی سے شروع ہو۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا اور دشمنوں کا منہ ہمیشہ کے لیے بند ہوگیا۔ اچھا ناظرین! اب ٹہلیے یہاں سے کھسکیے، غریب ہندستانی عورت شرم کے مارے کٹی جارہی ہے۔ دوسرا نکاح بے چاری نے نہ معلوم کن اسباب کن مجبوریوں سے کیا اور آپ ہیں کہ پردے کی باتوں کی ٹوہ لگانے کو اڑے ہیں۔ میں ہرگز نہ بتاؤں گا میرا گلا بھی کٹ جائے تب بھی کوئی ایسی بات منہ سے نہ نکالوں گا کہ صبح کو آپ خیر صلاح کے بہانے آیئے اور مسکرامسکراکر اس کو دیکھیے اور ہماری ناجو گردن جھکائے شرم کے مارے اس کا چہرہ سرخ ہوجائے۔ خیر اتنا بتائے دیتے ہیں کہ ناظمہ کی زندگی دوسری طرح کی ہوگئی۔ (آیا صغیر کے بھی خیالات بدلے اس کا حال آئندہ معلوم ہوگا) فی الحال اتنا سمجھ لیجیے کہ منصرم صاحب اور صغیر احمد کے ساتھ دو بالکل مختلف طرح کے ساتھ تھے جو ایک دوسرے سے ویسے ہی الگ تھے جیسے ناظمہ کے بچپن کا زمانہ مختصر رنڈاپے کے زمانے سے تب اگر سولہ برس کے سن میں اکسٹھ کی تھیں تو اب بتیس برس کے سن میں تئیس برس کی ہوگئی تھیں جو ہنسی جو گدگدی شروع میں نہ آئی تھی وہ بے فصل کے آم کی طرح سواد کھوکر اب آئی۔ یہ حس باطن کا کھیل کون سمجھے۔

صغیر احمد نے ناظمہ کی جھلک یوں ہی کبھی دیکھ لی ہوگی اب بامراد دیکھا وہ صورت شکل وہ رعب حسن وہ تناسب اعضا، وہ مزاج کی شگفتگی اور یہ ٹھہرے بھوکے بنگالی آنکھوں میں چربی چھائی ہوئی، ساون کے اندھے کو ہرا ہی ہرا سوجھتا ہے۔ ایسے میں سن کا فرق کس کو دکھائی دیتا۔

البتہ دو چار برس کے بعد کچھ فرق معلوم ہونے لگا۔

صغیر: بڑی پیاری چیز تقدیر سے ہاتھ آ گئی ہے۔ ہاتھ پاؤں کے گوشت میں وہ سختی نہیں ہے تو اس سے کیا ہوتا ہے اور کسی بات میں بڑھاپا تو نہیں ہے۔

اندر والا: بڑھاپا تو نہیں ہے مگر وہ پنڈے کا کساؤ کہاں ہے۔

صغیر: اجی محبت اصل چیز ہے پنڈا اونڈا کہاں رہتا ہے۔

اندر والا: محبت الگ چیز ہے جوانی الگ ہے ان دونوں کو ملاتے کیوں ہو؟

صغیر: جوانی گے دن کی ہے، محبت تو ہمیشہ کی ہے۔

اندر والا: ہے تو ہمیشہ کی مگر جوانی میں بھی مقناطیس کا اثر ہے۔

صغیر: محبت کا لوہا مقناطیس کو نہیں مانتا۔

اندر والا: اس سے کس کو انکار ہوسکتا ہے محبت جیسے پلاؤ اور جوانی جیسے بیسنی روٹی ہم مانتے ہیں کہ پلاؤ پلاؤ ہی ہے بیسنی بیسنی ہی ہے مگر روز روز پلاؤ کھا کر بھی کبھی کبھی بیسنی کو جی نہیں چاہتا۔ وہ بیسنی والی سنداہٹ تو تمھاری بی بی ہی میں ہے۔

صغیر: میں نے کہہ دیا کہ اور جو باتیں جی چاہے کیا کرو مگر ہماری بی بی کا نام ہمارے سامنے نہ آوے۔

اندر والا: ارے میاں تمھاری بی بی سے ہم سے مطلب۔ ہم تو جوان عورت کا خواب دیکھتے ہیں وہ تمھاری بیوی ہو یا کوئی اور ہو۔ تمھاری بی بی کا نام تو اس وجہ سے آیا کہ وہاں تک پہنچ آسان ہے اور کوئی بات نہیں۔

صغیر: یار یہ تو ہے مگر ناظمہ غریب کی چھاتی پھٹ جائے گی اور مجھ کو بھی چین نہ نصیب ہوگا۔

اندر والا: خیر چھاتی واتی تو کیا پھٹے گی مگر ہے بڑی سخت بات اور غضب تو یہ ہے کہ بغیر اس کے بھی پیاس بجھتی معلوم نہیں ہوتی۔

صغیر: یار تو پھر کیا کریں۔

اندر والا: کرو گے کیا ملاپ کرلو۔

صغیر: اور ناظمہ کو کیا کریں۔

اندر والا: کروگے کیا، یہ یہی رہیں گی وہ وہی۔ اُن کا مقابلہ کوئی تھوڑی کرسکتا ہے۔ اور وہ آئے گی تو تمھارے گھر میں رہے گی۔ یہ اس گھر میں رہیں گی اِن کا اُن کا سامنا بھی تو نہ ہوگا۔

صغیر: بھئی ناظمہ سے چار آنکھیں کیسے کریں گے۔

اندر والا: سب کچھ ہوجائے گا۔ سنو میاں ہم ہوں کہ تم ہو کہ ناظمہ ہوں سب ٹھہرے حکم کے بندے۔ ''حِس باطن'' کے وہاں سے جو اشارہ ہوگا وہ کرنا ہی پڑے گا۔

آپ کون ایسے خوبصورت تھے ۔ کون بڑے روپے والے تھے کہ ناظمہ آپ پر ریجھ جائیں، حس باطن نے کہا ناظمہ منصرم صاحب مرحوم کی صحبت میں تم اپنے ہم سِن کو ترس گئیں لہٰذا تم کو حکم دیا جاتا ہے کہ صغیر کے ساتھ کرلو۔ ناظمہ نے کرلیا، اب تم کو حکم دیا جاتا ہے کہ ناظمہ کو بھی کبھی نہ چھوڑنا مگر اپنی کم سِن بی بی سے ملاپ کرلو، بندگی بے چارگی، تمھارا بس ہی کیا ہے۔

صغیر: تو غریب ناظمہ دونوں طرف سے گئی۔ منصرم صاحب کے وقت میں پلّہ ایک طرف جھکا تھا اس بار دوسری طرف جھک گیا۔ دونوں کا نتیجہ اس غریب کے لیے تو برا ہی ہوا۔

اندر والا: یہ تو ہے ہی، ناظمہ کے ماں باپ نے شروع میں جو غلطی کی تھی اس کا بھارجہ غریب ناظمہ کو بھرنا ہے۔ تم نے سنا نہیں، خدا تین خطائیں معاف کرتا ہے، بندہ بھی کبھی کبھی ایک آدھ خطا معاف کردیتا ہے مگر بھول چوک کی سزا فطرت کے یہاں ہمیشہ بھرپور ہے۔

○

زندگی کا مقصد

۷۵-۱۸۷۰ کا قصہ ہے ظاہرا کوئی سبق بھی نہیں حاصل ہوتا مگر واقعہ سچا ہے، جس کا ہونا نوجوانوں کی سمجھ میں مشکل سے آئے گا۔ البتہ مرزا صاحب مرحوم جنھوں نے وہ زمانہ دیکھا ان کو روزمرہ کی بات معلوم ہوتی تھی۔ اس قصہ کے ہیرو آغا صاحب کہلاتے تھے۔ ان کے یہاں پشمینے کا کارخانہ تھا اور نمکین چائے خوب بنتی تھی۔ ان سے ایک دیہاتی رئیس صاحب سے ملاقات ہوگئی۔ آغا صاحب نے ان کی چائے کی دعوت کی۔ دیہاتی رئیس نے خواب میں بھی ایسی چائے کبھی کاہے کو پی ہوگی۔ جب کبھی لکھنؤ جانے کا اتفاق ہوتا تھا تو آغا صاحب کے لیے دیہات کے تحفے لے جاتے تھے اور چائے کی فرمائش ہوتی تھی، رفتہ رفتہ پینگیں بڑھ گئیں۔ اب یہ اصرار شروع ہوا کہ آغا صاحب ہمارے یہاں چلیے تاکہ وہاں کے لوگ بھی یہ چائے پی لیں۔ مہینوں کا زمانہ وعدہ وعید میں ٹلا۔ پھر مہینوں تہیہ کرنے میں صرف ہوئے۔ اس کے بعد ایک دن آغا صاحب امام ضامن بندھوا کر چل کھڑے ہوئے، بڑی آؤ بھگت، بڑی خاطریں ہوئیں۔ جن صاحب کے یہاں آغا صاحب مہمان گئے تھے ان کے یہاں دن عید رات شبرات مکان کا پھاٹک کبھی بند ہی نہ ہوتا تھا۔ ناچ رنگ اور اسی قبیل کے مشاغل زندگی کا مزا دوبالا کیے ہوئے تھے۔ گئے تو تھے ایک ہی دن کے لیے مگر کچھ ایسا لطف آیا کہ ایک دن اور بھی رہ گئے۔ تیسرے دن چلنے کا ارادہ کیا لوگوں نے توجہ دلائی کہ تیسرا دن مہمان کے جانے کا نہیں ہوتا، چوتھا دن اسی رعایت سے گزرا۔ پانچویں دن ارادہ مصمم ہوگیا کہ آج ضرور جائیں گے۔ اتفاق سے اسی دن سنیما کی زبان میں ایک نئی آرٹسٹ کا مجرا تھا۔ کہا گیا کہ غضب کیجیے گا بغیر ان کو سنے چلے جایئے گا۔ اس کے بعد آغا صاحب نے کپڑے نہ ہونے کا عذر کیا۔ خیر یہ کوئی ایسا مشکل مسئلہ نہ تھا۔ اسی وقت درزی بیٹھ گئے۔ مردانے جوڑوں کی تیاری میں کتنی دیر لگتی ہے۔ ایک چھوڑ کئی

جوڑے تیار ہوگئے۔ اس عذر میں ایک کے بجائے دو دن گزر گئے۔ اب پھر روانگی کا پاتراب ہوا مگر دن کی نحوست کے خیال سے ارادہ فسخ ہوگیا۔ اسی طرح کبھی تاریخ نحس ہوئی کبھی پچھم کا چالانہ ہوا، آج قمر در عقرب ہے تو کل تحت الشعاع کبھی ریل چھوٹ گئی۔ کبھی کوئی خاص دوست سے عین وقت پر رخصت نہ ہوسکے۔ غرض کہ روانگی کی گھڑی یونہی ٹلتی رہی۔ حضرات ناظرین اگر روز روز کا حساب بنایا جائے تو اس مشکل زمانہ میں کاغذ کہاں سے آئے گا۔ قصہ مختصر گیارہ برس اسی میں گزر گئے۔ اور آغا صاحب وہیں کے ہوگئے۔ ظاہر ہے کہ اتنا زمانہ صرف دور کی دلچسپیوں میں کیسے صرف ہوتا۔ ہوتے ہوتے ایک نقلی بیڑی بھی پاؤں میں پڑ گئی اس کے بعد دو ایک ہتھکڑیوں کا بھی اضافہ ہوگیا۔ اب جانے میں کچھ شرم مانع ہوئی۔ کچھ دل نے بھی نہ چاہا۔ بات ہمیشہ آئندہ پر اٹھتی رہی۔ دس گیارہ برس کے دوران میں والد ماجد کی علالت اور بعد کو انتقال کا بھی خط آیا مگر یہاں کی خاک کچھ ایسی دامن گیر تھی کہ نہ جاسکے۔ انتقال کی خبر سن کر بالکل تیار ہوگئے تھے مگر لوگوں نے سمجھایا کہ تمھارے لیے جنازہ رکھا ہوگا اب اگر جانا ہی ہے تو کل جانا کہ سیوم میں شرکت ہوجائے۔ مگر کچھ اتفاقات پیش آئے کہ سیوم میں بھی نہ پہنچے۔ اسی طرح ماں بھی مریں۔ کارخانہ بھی تباہ ہوا اور مکان بھی گر گیا۔ زمین دوسرے شرکاء نے لے لی۔ اب کیا تھا جس کے لیے جاتے۔ دو برتن پاس ہوتے ہیں تو کس نہ کسی طرح ٹھیس لگ ہی جاتی ہے۔ اسی طرح گیارہ برس کے بعد رئیس صاحب سے کسی بات پر شکر رنجی ہوگئی اور ہمارے آغا صاحب روٹھ گئے۔ لکھنؤ جا کر کس کو منھ دکھاتے اس لیے کلکتہ کی سیدھ باندھی۔ جانے کو تو چلے گئے مگر دل نہیں لگتا۔ وہاں پر ہر شخص کاروباری اپنے دھندے میں لگا ہے۔ آپ کی زندگی ٹھہری بھونرا تتلی کے انداز کی کہ پھول پر بیٹھے رس چوسا اور اڑ گئے۔ زندگی کا مقصد جوانی اور جوانی کا مقصد اپنے رنگین پروں کا مقابلہ۔ پھولوں کی رنگینی سے رس جمع کرنے والے اور ہوں گے یہ تو اس برج دیس کے کنہیا تھے جہاں پھول کا مقصد پھل نہیں بلکہ صرف خوشبو تھا۔ جہاں بہار کا مقصد نامیہ نہیں بلکہ رنگوں کی نمائش تھا۔ حکیم ابیقوس کے نام لیوا، آئندہ اور گزشتہ سے بے پروا جان پر جان قربان کرنے والے اس زمانہ میں آغا صاحب ہی تو تھے۔ اس وجہ سے وہی صحبتیں وہی احباب ہر وقت نگاہ کے سامنے پھرا

کرتے تھے۔ کام کرنے کی عادت کبھی رہی ہو تو کوئی مشغلہ اختیار کرلیں۔ ہمت ہر کام کی باندھتے ہیں مگر ہوتا کچھ نہیں۔ بیڑی تو گیارہ برس میں پڑی اور کٹ بھی گئی۔ مگر دو ہتھکڑیاں تین سو کوس پر بھی چین نہیں لینے دیتیں۔ ادھر رئیس صاحب بھی پریشان ہیں۔ مجبوراً ایک بے تکلف مصاحب روٹھے کو منانے کلکتے بھیجے گئے۔ آغا صاحب پھر چلے آتے ہیں وہی دن ہیں وہی راتیں زمانہ ایک طرح پر کبھی نہیں رہتا۔ ''اسی کو اہل جہاں انقلاب سمجھے ہیں'' لیجیے صاحب رئیس صاحب کا انتقال ہوگیا۔ صحبت درہم برہم یار احباب تتر بتر، شیرازہ ہی نہ رہا تو اوراق کہاں کے۔ مگر اس سرزمین میں بلا کی کشش ہے کہ پاؤں اب بھی نہیں اٹھتے۔ اس دائرہ احباب میں ایک صاحب کھانے کا تمباکو بناتے تھے۔ مگر نسخہ بتانا کیا کسی کو ہوا نہ لگنے دیتے تھے جو بیچتے تھے دوائے دل وہ دکان اپنی بڑھا گئے۔ اور یہاں یہ حالت کہ بغیر اِس تمباکو کے پان کا ذائقہ اور مزہ نہیں۔ اور بغیر پان کے زندگی کا مزہ نہیں، ادھر منہ میں گلوریاں رکھیں ادھر رئیس صاحب اور وہی صحبتیں یاد آگئیں۔ خود تو اچھے چلے گئے۔ ہماری زندگی ملیامیٹ کر گئے۔ ہم کو ساتھ نہ لے گئے لعنت ہے ایسی زندگی پر، تف ہے ایسے جینے پر۔ خیر خدا رزاق ہے کھانے کا انتظام تو ایک دوسرے رئیس صاحب کی شریف پروری سے ہوگیا۔ رہا حقہ کبھی خود بھرنے کی عادت تو تھی نہیں۔ شروع شروع نہ معلوم کتنی چلمیں اٹھا کر پٹخ دیں نہ معلوم کتنی بار انگلیاں جلیں۔ مگر رفتہ رفتہ سب ٹھیک ہوگیا۔ البتہ تمباکو کی مشکل نہ حل ہونا تھی نہ حل ہوئی۔ اب کیا کیا جائے اتنے میں پتہ چلا کہ کوئی اور صاحب فیض آباد میں رہتے ہیں۔ ان کے پاس بھی کوئی نسخہ تمباکو کا عمدہ ہے۔ تمباکو کی طلب بہتوں کو تھی مگر ہمارے آغا صاحب کو بری طرح لت پڑ چکی تھی۔ بے چارے سب کام چھوڑ فیض آباد دوڑے گئے۔ وہ تمباکو بھی کھایا، واہ واہ یہ تو وہی چیز ہے بلکہ اس سے بھی بہتر ہے۔ کیا لعاب بندھتا ہے، اور جب تک ذرا سا بھی پان منہ میں ہے وہی ذائقہ قائم بلکہ ایمان کی تو یہ ہے کہ پتی کی تمباکو میں گول دانہ ایسا دیکھا نہ سنا، مگر یہاں بھی نسخہ اسی احتیاط سے بندھتا ہے اور مال اسی طرح تیار ہوتا ہے کہ پرندہ پر نہیں مار سکتا۔ آغا صاحب نے دوستی پیدا کی ہر وقت ساتھ رہنے لگے جہاں وہ صاحب بازار کو چلے یہ سایہ کی طرح ساتھ ہیں۔ انھوں نے پنساری سے کوئی چیز خریدی نہیں کہ آغا صاحب نے بیاض

پر ٹانک نہیں لی۔ انھوں نے بھی ایک چیز آج لی ایک کل۔ ایک اس دکان سے ایک اس دکان سے، مگر آغا صاحب ہیں کہ ٹوہ لیتے جاتے ہیں ''تم ڈال ڈال تو ہم پات پات'' انھوں نے ایک دوا تمباکو کی اگر خریدی تو اس کے ساتھ دو ایک دوائیں باؤ بھرنگ نرکچور اور لے لیں۔ اب جو آغا صاحب نسخہ تیار کرتے ہیں تو نہ معلوم کیسا سیٹھا پھیکا ہوکر رہ جاتا ہے۔ رفتہ رفتہ پتہ چلا کہ تمباکو کے کیمیا گر کے ایک مطلقہ لڑکی ہے کم سن تو ہے نہیں کوئی چالیس کے لگ بھگ ہوگی۔ مگر ہے تو عورت اور سوائے اس کے بڈھی بڈھے کے اور کوئی آگے پیچھے نہیں ہے۔ وہ مارا ترکیب سمجھ میں آگئی اس لڑکی کا پیغام بھجواؤ، طلاق نہ معلوم کیوں ہوئی تھی، آج تک بیٹھی کیوں رہ گئی۔ ان سب باتوں کو کون سوچے۔

''درکارِ خیر حاجت ہیچ استخارہ نیست''

یہی نا کہ بدمزاج ہوگی۔ اجی ہم ایسی خاطر کریں گے کہ وہ ہم سے مزاج کی لیں گی ہی نہیں۔ جب ہم کلیجہ کاٹ کر رکھ دیں گے تو کب تک دل نہ پسیجے گا۔ جب ہم ان کی راہ میں آنکھیں ہی بچھا دیں گے تو بھنوؤں کی کمان کیسے نہ اترے گی۔

''ہرچہ کنی رضائے تو''

ہم کو تو تمباکو کا نسخہ چاہیے۔ اس میں جو کچھ برداشت کرنا پڑے اور ممکن ہے کہ کچھ ایسی پرگت مل جائے کہ اس کی نوبت ہی نہ آئے، کچھ ایسا جوڑ توڑ مل جائے کہ کھٹ پٹ ہو ہی نہ۔ چنانچہ رقعہ پہنچا ہی دیا۔ اے سبحان اللہ سات پشتوں میں کہیں بال برابر کا بل نہیں۔ لڑکی والے کیا عیب نکال سکتے تھے۔ رہی دولت دنیا تو وہ نہ ادھر ہی تھی نہ ادھر مگر اس کی فکر نہ لڑکی والوں کو ہے نہ لڑکے والوں کو۔ خدائے رب العزت نے کہا ہے یفھم اللہ من فضلہ۔

پھر تشویش کس بات کی۔ لیجیے صاحب مبارک ہو عقد ہوگیا۔

آغا صاحب کے نہ صرف بی بی ہی ہاتھ آئی بلکہ تمباکو کا نسخہ بھی مل گیا۔

نکاح کے وقت ایک ذری سی گڑبڑ ہوگئی تھی، کیونکہ لڑکی والے خاندان کے مراسم

کے موافق ایک لاکھ من زر سرخ سے مہر کم نہیں کرتے تھے، اور ان کے طرف دار اسّی ہزار من سے آگے نہیں بڑھتے تھے مگر آغا صاحب کے اشارے سے یہ بھی برداشت کرلیا گیا اور دلھن رخصت ہوکر ایک کرایہ کے مکان میں اتار دی گئی۔ رفتہ رفتہ یہی تمباکو کا نسخہ دونوں کا ذریعہ معاش ہوگیا اور آغا صاحب اور ان کی اہلیہ کے ساتھ قبر میں دفن ہوگیا۔

○

"......... لوگوں کو خیال ہوا کہ شاید اس نے مذہب تبدیل کیا ہے۔ ایک دوست نے پوچھ بھی لیا کہ تم سنّی ہوگئے ہو۔ میں نے جواب دیا کہ اگر مجھے سنّی ہی ہونا ہوتا تو شیعہ ہی کیوں نہ رہتا۔" اکثر حضرات نے میرا مذہب دریافت کیا اور جب میں نے کہا کہ اپنے کو مسلمان کہتا ہوں..... تو سننے والوں کو تسکین نہ ہوئی۔ عبرت کا مقام ہے خدا کا بھیجا ہوا نام، رسول کا لایا ہوا نام، 'مسلمان' مجہول المعنی ہوگیا۔ جب تک شیعہ سنّی، وہابی کی ٹھیک نہ لگاؤ لوگوں کی سمجھ ہی میں نہیں آتا کہ کہنے والا مذہباً کیا ہے۔

اے خاصۂ خاصانِ رُسُل وقت دعا ہے
امت پہ تری آ کے عجب وقت پڑا ہے"

(میرا مذہب)

قیافہ

قیافہ شناس کہتے ہیں کہ جو کچھ آدمی کے دل و دماغ بلکہ سارے جسم میں ہے وہ سب چہرے میں ہے۔ لیکن اگر کسی چہرے پر غور کرو تو اس طرح سے کرو کہ اس کو خبر نہ ہو۔ عموماً جب آدمی دوسروں سے ملتا جلتا ہے تو فطرتاً اپنے چہرے کو اچھا بنائے رہتا ہے یا اس کے اعصاب اس طرح کام کرتے ہیں کہ اس کا اصلی مزاج کھلا کھلا چہرے پر ظاہر نہیں ہوتا۔ کبھی آنکھ ناک منھ کو لوگوں کے روبرو، بلاکوشش نیک، رحم سے بھرا یا خوش آئند بنائے رہتا ہے۔ کبھی خوش کبھی رنجیدہ یا کسی جذبے سے متاثر ہوتا رہتا ہے۔ البتہ جب اس کو خبر نہ ہو کوئی اس کو دیکھ رہا ہے تب اصلیت کا پتہ چلنا ممکن ہے سونے میں بھی اعصاب اس قدر ڈھیلے ہوکر رہ جاتے ہیں کہ گوشت کے لٹک جانے سے جاگنے والی کیفیت نہیں رہ جاتی۔

ایک مرتبہ خوش قسمتی یا بدقسمتی سے مجھ کو ایک چہرہ دیکھنے کا اتفاق ہوا جو میں ہمیشہ دیکھا کرتا تھا، لیکن جو کچھ اس دن دیکھا وہ خدا کسی دوست کو نہ دکھائے اور دشمن دیکھ لے تو عبرت کرکے اچھا آدمی ہوجائے۔ یہ صاحب پڑھے لکھے، روشن خیال بالکل اس طرح کے آدمی تھے جیسے متوسط طبقے کے اوپری حصہ میں ہوتے ہیں۔ اصول اخلاق کے پابند، شائستہ عموماً توازن سے رائے قائم کرنے والے۔ اگر کسی طرف پلّا بھاری بھی ہوا تو ہمیشہ رواداری اور درگذر کی طرف، دوستی کو ہر حال میں نباہنے والے، دوسروں پر احسان کرنے والے، کم وبیش مذہب کے پابند، تعصب سے متنفر کلب کی صحبتوں میں نہ کبھی گراں پڑتے تھے اور نہ بور ہوتے تھے۔ گوری رنگت، بڑی بڑی آنکھیں، چھوٹی سی خوبصورت سی ناک، مناسب دہانہ، سو دو سو میں دیدہ رو تھے۔ اگر عیب تھے تو دو۔ ایک عورت کے مقابلہ میں ایسے سبک دل واقع ہوئے تھے کہ دوستی، شرافت سب کی بھینٹ چڑھا دیتے تھے۔ دوسری خامی اس سے بھی سخت تھی یعنی دولت حاصل کرنے کا خواب

ہمیشہ دیکھا کرتے تھے۔ روپیہ کس کو اچھا نہیں لگتا، لیکن یہ صاحب جلد اور بے محنت کیے فوراً امیر ہوجانا چاہتے تھے۔ مذہب میں اکثر دیکھا گیا ہے کہ رضائے الٰہی کی شاہراہ چھوڑ کر لوگ پگڈنڈی کے راستے سے خدا تک پہنچنا چاہتے ہیں۔ کوئی رو کر پہنچتا ہے، کوئی گا کر کوئی ناچ کر، عنایت فرما بھی تھے کہ گھوڑ دوڑ کے راستے سے ایک منٹ دس سیکنڈ میں لاکھ کے جھونپڑے پر بیٹھنے کی کوشش کیا کیے۔ ظاہر ہے کہ اس تیز روی کے میدان میں سفر خرچ کا کوئی بجٹ نہیں تیار ہوسکتا۔ اس وجہ سے جس کو خود نباہتے دوسروں کو بھی چرکہ دیتے تھے۔ رفتہ رفتہ یہ چرکہ بازی گھوڑ دوڑ کے میدان سے نکل کر باہر بھی کارفرما ہونے لگی۔ میں ان چند لوگوں میں تھا جو احباب سے ان کی طرف سے وکالت کیا کرتے تھے۔ اگر کسی نے ان کا ایک عیب بیان کیا تو میں دو صفات مقابلہ میں لاکر بیان کردیتا تھا۔ لوگ قائل ہوں یا نہ ہوں میں اپنی سنگ دلی کا ثبوت ہر جگہ دینے کو تیار رہتا تھا۔ اکثر تو یہ ہوتا تھا کہ جلسے بھر میں سب کی ایک رائے اور میں تنہا وہ چنا تھا جو بھاڑ پھوڑنے کا بیڑا اٹھائے تھا۔ لیکن ایک دن ایسا آگیا کہ پھر میرے منھ پر بھی قفل چڑھ گیا۔ اتفاق یہ ہوا کہ میں چند احباب کے ساتھ کلکتہ کی گھوڑ دوڑ میں پہنچا۔ اس میدان حشر میں جہاں ہر شخص نفسی نفسی زبان حال سے پکارتا ہے۔ میری نظر اپنے عنایت فرما پر پڑ گئی۔ انھوں نے مجھ کو نہیں دیکھا۔ میں نے اس طرح کا چہرہ دیکھا کہ متحیر ہوکر رہ گیا۔ موقع یہ تھا کہ آئندہ دوڑ شروع ہونے میں کچھ دیر تھی۔ مختلف گھوڑوں کے بھاؤ تاؤ کچھ گھٹ بڑھ رہے تھے۔ روپیہ لگانے والے گھوڑوں سے واقف، جاکیوں سے واقف، میدان کے موڑ نگاہ پر چڑھے ہوئے جوا کھلانے والوں کے مزاج داں اس فکر میں غلطاں پیچاں تھے کہ ہمارے گھوڑے کا بھاؤ کہاں اچھا ملے گا۔ ہمارے دوست ایک بکی کے بھاؤ کو بھانپ رہے تھے۔ جو گھوڑا انھوں نے تجویز کیا تھا اس کا بھاؤ کم ہوگیا تھا۔ یک بارگی بہت سے کھیلنے والوں نے اسی پر بد دیا تھا۔ اب پبلک کا دوسرے گھوڑے کی طرف رخ پلٹا اور گمان یہ تھا کہ پہلے گھوڑے کا بھاؤ عنقریب بڑھ جائے گا۔ ہمارے دوست نرخ پہچانے ہوئے تھے اور یہ بھی جانتے تھے کہ اگر ان کے گھوڑے کا بھاؤ حسب خواہش ہوگیا تو دو ہی چار منٹ کے لیے ہوگا۔ کیونکہ لوگ پھر ٹوٹ پڑیں گے۔ اس گھڑی ان کا قیافہ دیکھ کر خوف آتا تھا۔ بھیڑیے کی خونخواری، بلی

کی چال، بندر کی جست کی تیاری، شکار پر قابو پانے کا انہماک، اپنے فائدے پر دنیا بھر کو قربان کردینے کا تہیہ قسائی کے پیشہ والی بے پروائی میں نہیں عرض کرسکتا، وہ ہمیشہ کا رونق بھرا چہرہ اس وقت کیسا قابل نفرت، مہیب اور بدصورت ہوگیا تھا۔ جوئے کی خواری اور جواری کی خونخواری جیسی میرے اوپر اس وقت ظاہر ہوئی نہ کبھی اس کے پہلے ہوئی تھی نہ اس کے بعد، مگر وہ ایک سماں ہے جو اس وقت تک میری نظر میں ہے۔

○

''....... .... اچھا اب سنو، میں نے مہاتما گاندھی کی تاریخ کہی ہے۔
بہ نظر اصلاح پیش ہے

گاندھی مرحوم حق آگاہ مرد
خود بخفت و ہند را بیدار کرد

ہاؤ دال و طا الف سی جنوری
بدکہ خلق از مرگِ او آمد بدرو

ہادیہ آمد سرائے مدعیٰ
تجربہ ز پیر رو می ز آہ سرد

تادل صاحب ولے آمد بد رو
ہیچ قومے را خدا رسوا نہ کرد

آخر شعر مولانا کا ہے اس کے اعداد ہوئے ۲۴۱۶، منفی ۴۶۸=۱۹۴۸
اس میں ''ہادیہ آمد سرائے مدعیٰ'' کے اعداد نکال ڈالو ۱۹۴۸ بنتا ہے............''

(ہما بیگم کے نام خط)

نیلم کانگ

اللہ میاں کے ناموں میں سے ایک نام ہے جس کو اس کا بھید معلوم ہوجائے وہ سب کچھ کر دکھائے۔ وید میں بھی اسی طرح کی بات موجود ہے۔ چھوٹا منھ بڑی بات، ہم کیسے کہیں مگر دل میں خیال گزرتا ہے کہ کہیں وہ اسم حسنہ ہم کو معلوم تو نہیں ہوگیا ہے۔ تو وجہ کیا ہے دنیا میں اچھائی برائی، نیکی بدی، خوشی غم، ایک ہی جگہ سمویا ہوا دیکھتے ہیں کہ جیسے کوئی دل لگی کرتا ہو، خیر ہوگا ہم اندھی کھوپڑی ان باتوں کو کیا جانیں، ہم کہانی کہتے ہیں۔ لیجیے سنیے۔

ایک تھے میاں حسو قوم کے فقیر کہلاتے تھے مگر ہم کو تو قلمی ہی سے معلوم ہوتے تھے وجہ یہ تھی کہ نہ تکیہ نہ قبرستان نہ کسی بزرگ سے نسبت، مجاوری پیالے کی آیت تک یاد نہ تھی۔ بھیک بھی وضع داری سے مانگ لیتے تھے ورنہ جھولی، کشکول، تونبی، دسپنا، فقیری کے تمغوں میں سے کچھ بھی تو نہ تھا۔ کنٹھے کوڑیاں بھی گلے میں کبھی نہیں دیکھیں۔ البتہ اذان دے لیتے تھے۔ مسجد بھی قریب نہ تھی اور کسی قبرستان میں کوئی تکیہ دار ان کو کاہے کو اذان دینے دیتا۔ یوں کہیں تازہ قبر دیکھتے تھے تو غلط سلط اذان دے پڑتے تھے۔ جس گاؤں میں یہ رہتے تھے وہاں تو مسلمان دوائی کو بھی نہ تھے مگر پاس ہی کے گاؤں میں دو تین گھر تھے ان لوگوں کا تکیہ دار ایک تیسرے گاؤں میں رہتا تھا۔ اس لیے اگر کبھی کبھار وہ نہ پہنچ سکا تو قبر کی چادر یہ لے بھاگتے تھے۔ اس کو تکیہ داری مشکل سے کہہ سکتے ہیں۔ کفن کھسوٹی کہہ لیجیے۔ آپ کہیں گے پھر کام کہاں سے چلتا تھا۔ اجی اس کو نہ پوچھیے۔ اللہ رزاق ہے چار سے اچھا کھاتے تھے۔ حسو شاہ چپتے آدمی تھے جیسے بعض کتے ہوتے ہیں کہ بھونکتے نہیں اور کاٹ کھاتے ہیں۔ ان کو چوری میں جیل خانہ جانے کا بھی چسکا پڑ گیا تھا۔ ان کی بیوی کی زبان ہاتھ بھر کی تھی جس سے گاؤں بھر نالاں تھا۔ حسو کی بی بی زیادہ تر تو لڑا کرتی تھیں جب لڑتی نہ تھیں تو

گھگھیا گھگھیا کر ادھار کے نام سے بھیک مانگا کرتی تھیں۔ علاوہ اس کے اور بھی چھوٹے چھوٹے مشاغل تھے۔ مثلاً لگائی بجھائی کرنا، عورتوں کو آپس میں لڑوانا، مردوں کو گھر میں چھپا رکھنا اور پھر لڑکیوں کو پھسلا کر گھر میں بلا لینا اور کے بعد باہر سے کنڈی چڑھا کر گھڑی دو گھڑی کے لیے کھسک جانا، مگر اس کام میں وہ پہلے سوار پیدل پہچان لیتی تھیں، تب کرتی تھیں۔ پہلے اپنی لڑکی سے دوستی پیدا کرواتی تھیں۔ اس کے بعد یہ چالیں چلتی تھیں۔ اس وجہ سے آج تک نہ کسی لونڈیا نے شور مچایا تھا نہ اُن کا چونڈا مونڈا گیا۔ کبھی کبھی کسی پنجاب جانے والی لڑکیوں کو گھر میں دو ایک دن چھپا بھی رکھتی تھیں۔ اس میں اچھا خاصہ کمیشن ملتا تھا مگر ایسے موقعے کم ہاتھ آتے تھے۔ بیکاری میں کبھی کبھی ڈھیلے پھینک کر جی بہلاتی تھیں۔ ایک مرتبہ گاؤں میں رات کو ہر گھر میں دس پانچ ڈھیلے گرنے لگے۔ بڑی بڑی اینٹیں آتی تھیں، چونکہ گاؤں میں نٹ بیر بابا کا ٹوٹا مَٹھ ہی پکی اینٹوں کا تھا۔ اس لیے لوگوں کا خیال ہوا کہ وہی کچھ خفا ہوگئے ہیں اور یہ حرکتیں کرتے ہیں۔ سب سے بڑی دلیل اس کی یہ بیان کی جاتی تھی کہ اینٹ کبھی کسی کے لگی نہیں۔ گاؤں والوں نے نٹ بیر بابا کو خوش کرنے کے لیے کچھ مان دان بھی کی مگر ڈھیلے بند نہ ہوئے۔ ایک دن یہ اتفاق گزرا کہ کسی شخص نے ڈھیلے گرتے وقت ایک نئی بات دریافت کی یعنی ڈھیلے کی ''بھد'' کے پہلے کچھ کھن سے بھی ہوتا ہے جیسے چوڑیاں بولتی ہیں، سننے والے نے میاں حسنو کی بی بی کی ٹوہ لگائی، آخر پکڑی گئیں۔ گاؤں والوں نے اچھی خاصی مرمت کی۔ میاں حسنو اس وقت جیل خانے میں تھے اس لیے بہتوں نے یہ کہہ کر چھوڑ دیا کہ حسنو آلیں تو ان کو گاؤں سے نکال دیا جائے۔ حسنو کی بی بی کے لیے پٹنا کوئی نئی بات نہ تھی ان کے میاں اکثر دس بیس جوتے جھاڑ دیا کرتے تھے۔ یہ بھی ان کی مختصر داڑھی پر حملہ بول دیتی تھیں، تب وہ مجبور ہوکر ان کے جھونٹے سنوارتے تھے۔ دو چار لاتوں ہزار دو ہزار گالیوں کے بعد میاں بی بی کے رنجوے ختم ہوجاتے تھے۔ مگر یہ دوسری بات تھی میاں بی بی میں تو سب ہی کچھ ہوتا ہے غیر مرد کے ہاتھ کی مار کھانا بڑی ناموس کی بات تھی، اس لیے دوسرے ہی دن کہیں چلی گئیں۔ لڑکے گھر ہی پر رہے۔ جب میاں کے چھٹنے کا وقت آیا تو ایک رات پہلے گھر آ رہیں۔ مگر کسی کو منہ نہیں دکھایا۔ حسنو کے آنے کے بعد باسی کڑھی میں صرف

ایک خفیف سا ابال آ کر رہ گیا۔ اور پھر نہ ڈھیلے بازی ہوئی نہ اس کا ذکر آیا اور ہمیشہ کی طرح رہنے لگیں۔ اگر ڈاکٹر سگمنڈ فرائڈ اسی گاؤں میں بستے ہوتے تو وہ یقیناً بتا دیتے کہ چونکہ اس کا مرد گھر میں نہیں تھا اس لیے جنسی تقاضے کی وجہ سے ''بیٹھے سے بیگار بھلی'' کے مسئلہ کے تحت میں ڈھیلے ہی پھینکا کرتی تھی۔ مگر ڈاکٹر صاحب کے نہ ہونے سے معاملہ صاف نہ ہوا کہ ڈھیلے مار سے رکے یا میاں حسنو کی وجہ سے۔

لڑکے دو تھے۔ چھوٹے لڑکے کا تو حال ابھی کھلا نہیں تھا بڑا لڑکا اچھے ہاتھ پاؤں کا لیکن پیٹ بھر کے بے وقوف تھا اگر پوچھو تو گھر میں بس ایک شکورا لڑکی کا دم تھا۔ سلیقہ مند، محنتی اور ہنس مکھ، کچھ کھیت بھی لیے ہوئے تھے، مگر ہم نے تو ان میں کچھ ہوتے بہت کم دیکھا تھا اور زمیندار سے وصولی کے وقت جھنجٹ کی رسم بندھ گئی تھی۔ نیک نیت کسانوں کی بقایا میں زمیندار سختی بھی نہیں کرتا۔ دوسرے کاشتکار ہر وقت نقد اور ضمانت سے مدد کو بھی تیار رہتے ہیں۔ نادہند جس کی ساکھ بگڑ گئی اس کے ساتھ نہ زمیندار رعایت کرتا ہے نہ کسان ہی اس کا ہاتھ بٹاتا ہے۔ یہی حال حسنو بے چارے کا تھا ان کو جیل خانے جانے کی ایسی چاٹ پڑ گئی تھی کہ بعض فصلوں میں زیادہ حصہ کھیتوں کا بغیر جوتے بوئے اکھڑ ہی جاتا تھا۔ گھر کے قریب جو دو ایک ٹکڑے تھے وہ ان کی بیوی کسی نہ کسی طرح تردد کر لیتی تھیں۔ اس کو کھیتی نہیں کہتے بڑے لڑکے اور لڑکی کی شادیاں ہوگئی تھیں، مگر بس ایک بار کے سوا نہ بہو گھر آئی تھی نہ لڑکی سسرال گئی۔ اب یہ کھٹ راگ میری زبانی کہاں تک سنیے گا۔ تصنیف را مصنف نیکو کند بیاں۔ خود میاں حسنو اور ان کی بی بی مجھ سے بہتر بیان کریں گی۔

حسنو کی بی بی: بڑی جلدی آ گئے۔

حسنو:　ہاں، ایک بجے تو چوکیدار ہی پکار گیا تھا، اس کے پہلے کیسے جاتے۔

حسنو کی بی بی:　کچھ ملا۔

حسنو:　ہاں اسٹیشن ہی سے تو لوٹ پڑے۔

حسنو کی بی بی: کے بجے ہوں گے۔

حسو: تین کا عمل ہے۔

حسو کی بی بی: گھر میں رکھنا ٹھیک نہیں۔ ابھی تین مہینے پر تو لوٹ کے آئے ہو، کل ہی پولیس پھر پکڑ لے گی۔ لاؤ گٹھری ہم کو دو۔

حسو: کہاں رکھوگی؟

حسو کی بی بی: رکھوں گی کہاں، گھر ہی میں دبادوں گی۔ وہ گیا ہے نیوتے۔ پندرہ دن میں کہیں آوے گا۔

حسو: لڑکے تو نہیں جاگتے۔

حسو کی بی بی: لڑکے کون؟ لونڈیا شام ہی سے غائب ہے۔ نگوڑی اس وقت تک لوٹ کے نہیں آئی ہے۔ وہ موا ٹانگ پسارے سورہا ہے۔ اس پر لاٹھیاں ٹوٹیں تب بھی خبر نہ ہوگی۔ حسو سنو یہ لونڈیا سسری ہماری آبرو لے گی۔ ناک بانسے سے پُچھ جائے گی۔

حسو: آنے دو آج مار ہی ڈالوں گا سسری کو۔

حسو کی بی بی: آج کچھ اس نے نئی کی ہے۔ اس کا تو روز کا یہی حال ہے۔ سسرال بھیجوگے نہیں اور ناک چوٹی کاٹنے کو ہر گھڑی تیار۔ جوان لڑکی پھر کیا کرے۔ دوسرے کی بیٹی کو سب ہی بگاڑنے کو تیار رہتے ہیں۔

حسو: اس سالے کے یہاں تو نہ بھیجیں گے، چاہے جو کچھ ہو، اب اس کے یہاں ہم اپنی بیٹی بھیجیں گے؟ اسی کی گواہی پر تو ہم کو جیل ہوا ہے۔ چاہے سڑ جائے مگر اس کے یہاں تو نہیں جائے گی اور اس حرام زادی کا بھی سر کاٹ لیں گے۔

حسو کی بی بی: اچھا سر پیچھے کاٹنا پہلے مجھ کو گٹھری لے جانے دو۔ نہیں تو صبح ہوجائے گی، آدھا خرچ گھر کا وہ چلاتی ہے اور یہ اس کا سر کاٹ ڈالیں گے۔ بڑے آئے کاٹنے والے، لے اب منہ نہ کھلواؤ، یہی گٹھری لائے ہو۔ ننھے ٹہلو جو مال بیچ دیتے ہیں وہ تمھاری مروت سے اپنے اوپر جوکھم

اٹھاتے ہیں کہ شکوراُ کے کہنے سے؟

دوسرا باب

صبح ہوئی لڑکا لڑکی ابھی سو رہے تھے۔ عورت رات کے برتن مانجھ رہی ہے۔ مرد بیٹھا حقہ پی رہا ہے۔

حسنو کی بی بی: جاؤ بہو ہی کو رخصت کروا لاؤ، گھر کا دھندا مجھ سے اکیلے نہیں چلتا ہے۔

حسنو: لڑکا کام ہی کا نہیں ہے۔ بہو کس کے برتے پر آوے گی۔

حسنو کی بی بی: تو اس سے کیا ہوتا ہے نکاح تو ہوا ہے۔

حسنو: نکاح ہوا ہے نکاح ہوا ہے اڑاتی ہو یہاں کیا کرے گی آ کر۔

حسنو کی بی بی: ارے آنے تو دو۔ ہر کام میں ہاتھ بٹائے گی۔ تم کو تو چار دن بھی اطمینان سے گھر بیٹھنا نصیب نہیں۔ پولیس والوں کو اللہ سمجھے۔ گھر میں دو کی جگہ تین ہو جائیں گے۔ اچھی طرح خاطر سے رکھیں گے تو رہے گی نہ کیونکر۔ آخر بٹیا نہیں رہتی وہ بھی رہے گی۔

حسنو: تو یہ کہو لڑکی والا رنگ اس کو بھی سکھا دوگی۔

حسنو کی بی بی: ارے ہماری لڑکی کا کون برا رنگ ہے جو تم طعنہ دینے بیٹھے ہو، ہماری لڑکی کسی لڑکی سے ہیٹھی ہے تم تو وہاں تھے اگر یہ نہ ہوتی تو ہم لوگ بھوکوں مر جاتے۔

''پڑھنے والو! آپ کو معلوم ہوگیا کہ میاں حسنو کے یہاں کام کی تقسیم کیسے تھی۔ ان کی بی بی تو حرارت تھیں جو آدمی کو زندہ رکھتی ہے۔ خود میاں حسنو ہاتھ پاؤں تھے۔ لڑکی ان کی قلب تھی جو صاف خون جسم میں پہنچاتا ہے اور لڑکی کے احباب پھیپھڑے تھے جو گندہ خون یعنی چوری کا مال صاف کر کے قلب کو واپس بھیج دیتے تھے۔ بڑا لڑکا ان اعضا میں تھا جن کو بعض ڈاکٹر صرف اگلے زمانے کی نشانیاں بتاتے ہیں۔ غمزۂ خاص مگر یہ ہر گبرو مسلمان داری جن کا نظامِ جسم میں اب کوئی حصہ نہیں ہے۔''

میاں حسو کے یہاں بڑی کایاپلٹ ہوئی۔ بڑا لڑکا چیچک میں گزر گیا۔ چھوٹا لڑکا فقیروں کے گروہ کے ساتھ چلا گیا۔ خود میاں حسو چوری میں پھر پکڑ گئے۔ چوری معمولی تھی، مگر غضب یہ ہوا کہ عادی چور کی دفعہ 75 لگ گئی اور اب کی پانچ برس کے لیے گئے، گھر پر صرف شکوراً اور حسو کی بی بی رہ گئیں۔ مرد تو باہر کی چیز ہے ہی۔ نوکری پر نہ گیا جیل خانے میں رہا۔ اس کی تو حسو کی بی بی عادی تھیں۔ مگر دو لڑکوں کا اس طرح بچھڑ جانا اس نے ان پر پہاڑ توڑ دیا نہ لڑائی نہ بھڑائی نہ گالم گلوج، حسو کی بی بی ہکا بکا سی رہ گئیں۔ شکوراً یوں تو ہنس مکھ تھیں ہی، دانت نکلے ہی رہتے تھے مگر ننھے اور ٹھلو سے مراسم ذری زیادہ تھے۔ اس کی کھٹک دونوں مردوں کے دلوں میں رہتی تھی مگر کوئی اپنا حق اتنا مرجح نہ سمجھتا تھا کہ دوسرے کو روک دے۔ شکوراً اس کا موقع بھی نہ آنے دیتی تھیں۔ ایسی عورتوں کو اس کی عقل خوب آجاتی ہے۔

ہر یکے فارغ ز غیر و ہر یکے نازاں بخویش

لولی را ورد و عشرت گہہ دو مہماں دیدہ ام

ابھی تھوڑے دن ہوئے ایک انگریزی ناول نکلا تھا جس میں ایک تباہ شدہ جہاز کے پانچ مسافر ایک غیر آباد جزیرے پر آن پڑے تھے۔ چار مرد اور ایک عورت ''ملتے ہیں یہ بدقماش لڑنے کے لیے'' کچھ ایسا بجوگ پڑا کہ چاروں کٹ مرنے پر تل گئے۔ ان چاروں میں سے یہ عورت ایک کو چاہتی تھی مگر اس جزیرے میں زندہ رہنے کے لیے چاروں کی ضرورت تھی لہٰذا وہ عورت موقع موقع سے چاروں کو حلقہ غلامی میں لاتی رہی۔ یہاں تک کہ ایک جہاز نے ان کو امریکہ پہنچا دیا تب اس عورت نے اپنے چاہنے والے پر یہ راز کھولا۔ وہ بھی کچھ ننھے ٹھلو کی طرح الو کا پٹھا تو تھا نہیں اس لیے سمجھ گیا اور ایسی بی بی ہاتھ لگنے پر اللہ کا شکر بھیجا۔ اگر آدمی امریکہ کے لوگوں کی طرح پڑھ کر فاضل نہ ہوگیا تو رقابت کی آگ کبھی دہک اٹھتی ہے۔ کبھی راکھ میں دبی سلگا کرتی ہے مگر بجھتی نہیں۔ یہاں بھی یہی ہوا کہ ایک خاص بے موقع وقت پر دونوں کی مڈبھیڑ ہوگئی اور خوب کشتی ہوئی۔ جانوروں میں ایسے موقعہ پر عورت محفوظ رہتی ہے۔ مگر آدمیوں میں کبھی محبت کے اظہار کے لیے کبھی مرجع حق سمجھنے کی وجہ سے کبھی محبت کا

بھرپور ثبوت دینے کے لیے عورت بھی جھپٹ میں آجاتی ہے۔ بقول اسکر وائلڈ کے کوئی چاہنے والا بوسہ لے کر مار رکھتا ہے کوئی تلوار سے۔

چنانچہ جب ٹہلو نتھے کی خوب مرمت کر چکے تو شکوراً کی طرف متوجہ ہوئے اور دو چار لاتیں ایسی دھریں کہ جریدۂ محبت پر دوام کی مہر لگ گئی اور ٹہلو کی سچی محبت کا شکوراً کو یقین ہوگیا۔ عورت کو اور کیا چاہیے۔ شکوراً نے اللہ کا شکر بھیجا اور نسوانیت کے تمام صفات مثل قربانی، وفاداری، استقلال، یک رنگی کے ابھر آئے۔ عورت کی روح نے تن من دھن کی بازی لگائی تھی۔ پانسا الٹا پڑا۔

آؤ سکھی مل چوسر کھیلیں پی اپنے کے ساتھ
جیتیں تو پی ملے ہاریں تو پی کے ساتھ

اسی طرح شکوراً کی بھی ہار میں جیت نکلی اور دوسرے دن گاؤں میں نہ شکوراً کا پتہ تھا نہ ٹہلو کا۔

شکوراً کے جانے کے بعد حسو کی بی بی بلبلا اٹھیں۔ گھر باریوں ہی چھوڑ چھاڑ شکوراً ڈھونڈھنے نہ معلوم کہاں نکل گئیں۔ ٹوٹی مینڈیا برسات میں برابر ہوگئی۔ کھیت دوسروں کے قبضے میں چلے گئے، گاؤں میں لوگ ان لوگوں کا نام بھی بھول گئے۔

ظاہراً قصہ ختم ہوگیا مگر جو کچھ میں پیش کرنا چاہتا تھا وہ باقی ہے اگر بے کاری یا کسی اور وجہ سے اب بھی پڑھنے کا خیال باقی ہو تو بسم اللہ۔

ان واقعات کے تقریباً بارہ تیرہ برس بعد حسو کے قدیم مکان سے تین سو میل پر ایک بارات میں جانے کا اتفاق ہوا۔ ایک صاف صوف چھوٹا سا کچا گھر دیکھا۔ ایں! دروازے کے سامنے یہ چرخہ کون کات رہا ہے؟

میں :　ارے حسو کی بی بی تم یہاں کیسے؟

حسو کی بی بی: میں تو اب یہیں رہتی ہوں۔

میں :　بھئی گھر تو تمھارا خوب صاف صوف ہے۔

حسو کی بیوی : جی اللہ کا شکر ہے۔

میں : کہو تو یہاں کیسے پہنچیں؟

حسو کی بی بی : ارے بڑی لمبی کہانی ہے، گھڑی بھر میں سب کچھ کیسے کہہ جاؤں۔

میں : اے لو تمھارا تو شین قاف بھی درست ہے تم تو بالکل ہی بدل گئیں۔ کچھ کاغذ پنسل وغیرہ طاق پر دیکھ کر، ارے اس بڑھاپے میں پڑھنا بھی سیکھ لیا۔

حسو کی بیوی : جی نہیں یہ چیزیں تو بھیا کی ہیں (مگر کچھ شرما کر) دو تین کتابیں بھیا نے قسمیں دے کر مجھ کو بھی پڑھائی ہیں۔

میں : بھئی واہ واہ اس سن میں تم نے پڑھنا سیکھا اور بھیا کون تمھارا چھوٹا لڑکا تو فقیروں کے ساتھ چلا گیا تھا۔

حسو کی بی بی : (چہرے پر کرب کے آثار ظاہر ہوتے ہیں، ذرا رک کر) جی نہیں یہ میری اولاد نہیں ہیں۔ میں نے تو پالا ہے۔ میرا بے اختیار جی چاہتا ہے کہ اگر موقع ملے تو آپ سے اپنا اور بھیا کا پورا حال کہہ سناؤں۔ آپ بارات میں آئے ہوں گے کل صبح کو جایئے گا۔ آپ امیر آدمی ہیں، میں کیسے کہوں ،اگر شام کے وقت آپ کو چھٹی ہوتی تو ذرا چلے آتے اور میری کہانی بھی سن لیتے اور بھیا کو بھی دیکھ لیتے۔

میں: حسو کی بی بی جس طرح ہوگا میں ضرور آؤں گا۔ تم تو بالکل ہی بدل گئیں۔ دوسری ہوگئیں۔

حسو کی بی بی: اب ہمارے بھیا کو دیکھ لیجیے گا تب کچھ کہیے گا۔

اس طرح کی قلب ماہیئت ہوتے میں نے نہ کبھی دیکھی نہ سنی۔ یہ وہی عورت ہے یا کوئی دوسری روح اس میں حلول کر گئی ہے۔ اس کو اگر میں نے کبھی نیا کپڑا پہنے بھی دیکھا تھا تو سوا پھوہڑپن کے اس میں اور کچھ نہیں۔ آج بھی کپڑوں میں پیوند دکھائی دیتا تھا مگر یہ صفائی کا سلیقہ کہاں سے پیدا ہوگیا۔ ہمیشہ لڑائی میں بھیڑیے کا

انداز، صلح میں اس کتے کی سی حالت جس نے سوا دُوت کے اور کچھ نہ جانا ہو اور آج یہ رنگ ہے کہ چہرے پر خوداعتمادی کا سکون، غریبی میں دولت کی ایسی قناعت یا اللہ یہ کیا ہوا۔

چار بجے میں نے اپنے میزبان سے کہا کہ گھڑی بھر کے لیے میں ایک آدمی سے ملنے جانا چاہتا ہوں۔

میزبان: اس قصبے میں کون آدمی آپ کا جاننے والا نکل آیا۔

میں: میرے گھر کے پاس ہی ایک موضع ہے جس میں ایک عورت رہتی تھی آج میں نے یہاں آتے وقت اس کو دیکھا اور اس سے وعدہ کیا تھا کہ تیسرے پہر کو میں آؤں گا۔

میزبان: ارے وہ پردیسی بی بی تو نہیں جن کا گھر گاؤں کے نکڑ ہی پر ہے یہاں آتے وہ گھر پہلے ہی ملتا ہے۔

میں: جی ہاں، وہی۔

میزبان: وہ بڑی اچھی عورت ہے اس کا لڑکا بھی ہونہار ہے تو یہ آپ ہی کے یہاں کی رہنے والی ہیں۔

میں: جی ہاں۔

میزبان: آٹھ نو برس ہوئے، یہ عورت یہاں آکر بسی ہے معلوم ہوتا ہے کہ شریف ہے کیونکہ طریقہ باوجود غریبی کے بڑا عمدہ ہے۔ سلائی اور چرخے کے علاوہ کوئی آمدنی نہیں۔ یہ گھر کھنڈر تھا اب کیسا ٹھیک ٹھاک کیا ہے۔ بستی بھر میں سب سے پہلے مٹی اس کے گھر میں لگ جاتی ہے۔ پرچھتیاں پڑ جاتی ہیں، دیکھیے تو ایسا صاف صوف جیسے بانجھن کا آنگن، غریب ہے، مگر ہمارے گھر میں وہ نفاست نہیں جو ان کے یہاں نکلتی ہے۔ پار سال وہ لڑکا بیمار ہوگیا تھا میعادی بخار تھا۔ حکیم صاحب کے ساتھ میں بھی چلا گیا تھا۔ ہر چیز دیکھ کر دل پر یہ اثر ہوا کہ اگر عورت

سوگھڑ ہو تو کم سے کم آمدنی میں بھی آرام کا سامان اکٹھا کر لیتی ہے۔ علاج کے سلسلہ میں صاف صوف بوتلیں دوا کے لیے شیشے کا گلاس ہر چیز موجود۔ اس سے چوگنی بلکہ دس گنی آمدنی والے ہیں کہ جن کے یہاں وقت پر چیز نہیں نکلتی اور ان کے یہاں جیسے ہی ہم گئے نئی دری نکال کر ہم لوگوں کے لیے دوسرے پلنگ پر بچھا دی۔ پان تو تھے نہیں تشتری میں الائچیاں نکال کر رکھ دیں۔ صاف پتیلیاں، صاف چولھا دیکھ کر جی خوش ہوگیا، لڑکا بھی ہونہار ہے۔ مدرسے میں ہمیشہ اول انعام پاتا ہے دوسرے تیسرے دن پھر گیا تو دیکھا کہ بیمار کے لیے ہر چیز موجود ہے۔ اُوٹایا ہوا پانی ایک نئے جھجھر میں اوپر سے ایک نیا سکورا بند، گھڑونچی نہیں ہے مگر یہ نہیں کہ گھڑے یوں ہی زمین پر لوٹ رہے ہوں۔ اینٹوں کے اوپر تمیزداری سے رکھے ہیں۔ بیمار کے پاس ہی جھجھر بھی اینٹوں پر رکھا ہے۔ دوا پلانے کا پیالہ گلاس بھی اسی طرح جما دیے گئے ہیں۔ یہ کون لوگ ہیں؟

میں: شاہوں کا خاندان ہے۔

میزبان: یہی تو میں کہتا تھا جب تک کسی آستانے سے توسل نہ ہو جب تک کوئی بڑی نسبت نہ ہو یہ باتیں کہاں نصیب ہوسکتی ہیں۔

میں: (ہنسی ضبط کرنے کی سخت اور کامیاب کوشش کے بعد) جی ہاں اور نہیں تو کیا۔

میزبان: میرے دل میں یہ بات ہمیشہ سے تھی، آج تصدیق ہوگئی نا۔ ضرور یہ بی بی رسیدہ ہیں۔ ظاہر دنیاداری کا بنا رکھا ہے۔ اب تو میں ان سے فیض حاصل کرنے کی کوشش کروں گا۔ ہنسی ضبط کرنے میں میرے پیٹ میں پھر گدگدی شروع ہوئی، مگر بھلے کو بات بن گئی اور میں سنجیدگی برقرار رکھنے میں کامیاب ہوا۔ دوسری خیر یہ گزری کہ میزبان صاحب نے

مہمانوں کی خاطر مدارات کے خیال سے فیض کی تحصیل اسی وقت شروع نہیں کردی نہیں تو اگر اسی وقت میرے ساتھ ہی روحانیت بڑھانے کو اٹھ کھڑے ہوتے تو ہمارا کھیل ہی بگڑ گیا تھا۔

پردیسی بی بی میرا انتظار کر رہی تھیں۔ گھر میں دو پلنگ بچھے تھے تیسرا دیوار سے لگا کھڑا تھا۔ گھر میں سہ دری، اس کے پیچھے کوٹھری۔ انگنائی میں بائیں طرف ایک چھوٹا سا یک درے کا باورچی خانہ، ہر چیز صاف صوف، طاق پر لڑکے کی کتابیں، کونے میں لالٹین، ایک پلنگ پر بچھونا لپٹا ہوا سرہانے رکھا تھا، دوسری پر دری اور چادر تھی، مجھ کو پلنگ پر بٹھایا اور خود زمین پر بیٹھ گئیں۔ میں نے بہت کہا کہ دوسری چارپائی پر بیٹھ جاوے، مگر اس نے نہ مانا، لڑکے سے ملایا، کوئی گیارہ برس کا رہا ہوگا۔ صورت شکل سے پردیسی بی بی کو اس سے کوئی نسبت نہیں معلوم ہوتی تھی۔ میں نے کچھ دیر لڑکے سے باتیں کیں۔ چھٹے درجے میں پڑھتا تھا۔ حسنو کی بی بی اور یہ لڑکا یہ گھر، مجھ کو ایک شعر یاد پڑا ۔

نہ دل میں بدی ہو نہ کینہ نہ بیر
یہ گھر صاف ہو ہو کے دکھلائے سیر

مرزا محمد ہادی مرحوم رسوا نے ایک اسی طرح کا حال لکھا ہے۔ مگر وہاں خاندانی روایات ماں اور لڑکے کے ایک تھے، یہاں بالکل مختلف کیونکہ عورت اور لڑکے کے خاندانی روایات میں کوئی نسبت ہی نہ تھی۔ اگر میں نے خود نہ دیکھا ہوتا تو لکھنے کی جرأت نہ ہوتی۔

پردیسی بی بی نے ایک پیالی چائے اور برفی کی ڈلیاں میرے سامنے رکھیں۔ مروت سے زیادہ جس چیز نے کھانے پر آمادہ کیا وہ یہ خیال تھا کہ اس عورت کے ہاتھ کا کوئی بیر نہ کھاتا اور آج صفائی، سلیقہ، غریبی تینوں چیزیں موجود تھیں۔ لڑکا تو تھوڑی دیر کے بعد چلا گیا۔ پردیسی بی بی نے اپنی داستان شروع کی۔

''میرے اوپر جب آفت آئی اور شکوراً بھی چلی گئی تو میں کس کے سہارے گاؤں

میں رہتی۔ جہاں جہاں خیال ہوا کہ وہ ہوگی وہاں گئی، جب بالکل بے آس ہوگئی تب بھی گھر جانے کا ہواؤ نہ بندھا، ٹکڑے مانگ مانگ کر دن کاٹا کی، جب ایک جگہ سے تھک جاتی تھی تو دوسری جگہ چلی جاتی، پھر ریل پر چلنے لگی، کئی مرتبہ ریل والوں نے اتار بھی دیا۔ اس سے زیادہ کر ہی کیا سکتے تھے میں اپنے گھر سے پیدل کے راستے پہلے گونڈے گئی تھی بہت دنوں تک ادھر ادھر گاؤں گاؤں کی خاک چھانا کی۔ مگر شکوراؔ کا پتہ نہ ملنا تھا نہ ملا۔ اس کے بعد ریل پر چڑھ کر بارہ بنکی پہنچی وہاں معلوم ہوا کہ شکوراؔ کے باپ بھی چل بسے۔ میں لکھنؤ چلی گئی۔ اسی طرح ایک مرتبہ لکھیم پور کے پاس ایک اسٹیشن پر اتار دی گئی۔ بھیک مانگتی تھی اور پیٹ بھرنے کے لیے ہمیشہ مل جاتا تھا مگر جی نہ معلوم کیا ڈھونڈتا تھا، ایک دن ایک دروازے بھیک کے لیے گئی گھر کی بی بی نے اندر بلا لیا۔ اچھے خاصے زمیندار کا گھر تھا، گھر کی بی بی کا کوئی بیس برس کا سن، میاں کا سن 40 سے اوپر رہا ہوگا، باہر تو نوکر چاکر سب دکھائی دیتے تھے مگر اندر سوا ایک لڑکے کے کوئی نہیں تھا۔ میں فقیراؔ ہر دروازے کا ٹکڑا کھانے والی انھوں نے تو اتنا ہی کہا تھا کہ یہاں چلی آؤ مگر مجھ کو جیسے زمین نے کھینچ کر کھڑے سے بٹھا دیا۔ بی بی آدمی کی صورت کو ترستی تھیں، مجھ سے باتیں کرنے لگیں۔ بھیا میرا کل مجھ کو ایک کتاب سنا رہا تھا جس میں لکھا تھا کہ بندر کتے کسی پر گھونکتے بھونکتے ہیں کسی کے پاس چپ چاپ چلے آتے ہیں یہی حال میرا ہوا۔

میں ہر جگہ سے دُتکاری جاتی تھی۔ راہ گلی کے کتے اور میری حالت ایک تھی، مگر نہ معلوم کیوں ان بیگم صاحب کے پاس پہنچ کر میری بھی وہی حالت ہوئی جو بھیا نے جانوروں کی بتائی تھی کل جیسے ہی اس نے یہ بات پڑھی مجھ کو اپنی بیگم صاحب اور لکھیم پور کا گاؤں یاد آگئے۔ اب کہاں تک کہوں میرا اس گھر سے جانے کو جی نہ چاہا۔ بیگم صاحب جو جو باتیں کرتی تھیں میرے اندر کوئی مجھ سے کہتا تھا اب تم انھیں بیگم صاحب کی ہوگئیں۔ ان کے پیٹ میں دنوں کا لڑکا تھا، امیر آدمی اور ایسے آڑے وقت اکیلا ہونا اس کو کچھ عورت ہی سمجھ سکتی ہے۔ میں وہیں رہ گئی، رہتے رہتے سب حال معلوم ہوگیا۔ ان کے میاں دو بھائی تھے، بڑے یہ، چھوٹے پاس ہی دوسرے گھر میں رہتے

تھے۔ جتنی جائداد اِن کے تھی اتنی ہی دوسرے کے پاس۔ اِن کے کئی بال بچے تھے اور بڑے بھائی تن تنہا تھے۔ اُن کی بی بی کئی برس ہوئے مرچکی تھیں۔ سن زیادہ ہونے کی وجہ سے دوسری شادی کا خیال نہ تھا۔ اس کے علاوہ بڑے میاں اپنے بھائی کے بچوں کو بہت چاہتے تھے۔ وہ بھی ہر طرح کی تابع داری اور محبت کیا کرتے تھے اور دونوں گھروں میں انھیں کا کہنا چلتا تھا۔ ان کا زیادہ روپیہ بھی سوا ان کے اور کس پر خرچ ہوتا۔ روپے پیسے پر کچھ ملال ہوگیا۔ یہ باتیں بیگم صاحب بتایا کرتی تھیں۔ ایک دن ایسا اتفاق ہوا کہ بھائی کے یہاں سے حلوہ آیا، میاں نے کھایا، تھوڑی دیر کے بعد طبیعت خراب ہوئی، پیٹ میں درد، قے پر قے، پیاس کی شدت، کچھ پوچھو نہیں، خدا کا کرنا ایسا کہ سب حلوہ دو ہی تین قے میں گر گیا۔ میاں بچ گئے۔ یہ بات میاں نے چھپا ڈالی مگر مہینوں چارپائی لگے رہے۔ جب اچھے ہوئے تو کہیں جونپور کی طرف سے نکاح کر لائے۔ اتنی دور کی بات کسی نے کچھ کہا کسی نے کچھ جتنے منھ اتنی زبانیں، جتنی زبانیں اتنی باتیں، مگر بیگم صاحب کے بارے میں اچھی بات کسی نے نہ کہی، بھائی کے گھر سے پہلے ہی تکلف ہو چکا تھا۔ اب تو کھلم کھلا بگاڑ ہوگیا آمدورفت تک بند ہوگئی۔ اب تو ان کے گھر والے ایک ایک کا ہاتھ پکڑ کر بیگم میاں بی بی کی برائی کرنے لگے۔ لڑکا ہوا تو معلوم ہوا کہ ان لوگوں پر آسمان ہی پھٹ پڑا۔ روپیہ نگوڑا ایسی چیز ہے کہ بھائی بھائی کو دشمن بنا دیتا ہے۔ یہی بھتیجے تھے جو سنتی ہوں تکلف ہوجانے کے بعد بھی کہا کرتے تھے کہ بزرگوں کی باتوں پر ہم کون بولنے والے، ہمارے جیسے یہ بزرگ ویسے وہ۔ مگر جلن ڈاہ تو آدمی کے ساتھ ہے۔ جب میاں نے دیکھا کہ کھاؤ بھی اور غرے پتے بھی دکھاؤ۔ حسد اوپر سے تو انھوں نے بالکل ہی ہاتھ سمیٹ لیا۔ پھر کیا تھا وہ پرانی سعادت مندی احسان مندی، یگانگی، سب تہہ کرکے رکھ دی اور جان و مال اور آبرو کے دشمن ہوگئے۔

ہاں ایک بات نہیں بتائی، جب لڑکا دو تین مہینوں کا ہوا بیگم صاحب نے کہا بھیّا کو اور چاہے جہاں لے جانا، لیکن خبردار چھوٹے میاں کے یہاں نہ لے جانا، یہ بات میری بھی سمجھ میں آئی، کیونکہ یہ لوگ راستے گلی میں بھیا کو میری گود میں دیکھتے تو خدا

واسطے کو ایک آدھا آوازہ کس دیتے۔ اب دشمنی اور کھل گئی۔ میاں کے بھتیجی بھتیجوں میں چھوٹے بڑے بوڑھے جوان سب ایک خیال کے ہوگئے۔ جب سے بچہ ہوا تھا ماں باپ بھی جیسے دنیا میں پھر سے آگئے، گھر میں رونق بڑھ گئی تھی۔ آدمی کی صورت جو پہلے دکھائی نہ دیتی تھی اب دکھائی دینے لگی، نوکروں میں دو ہی آدمی تھے یا وہ لڑکا جو اوپر کا کام کرتا تھا یا میں۔ کھانا بھی اس وقت تک باہر ہی پکتا تھا اب ایک پکانے والی بھی مل گئی، کھانا بھی اندر پکنے لگا، اور میں بچے کی دیکھ بھال کرنے لگی، تین برس بڑی اچھی طرح کٹے۔ اس کے بعد طاعون پڑا۔ گاؤں کا گاؤں صاف ہوگیا۔ یہاں تک کہ جو لوگ گھر چھوڑ کر باہر نکل گئے تھے ان میں بھی ایک آدھ مرے۔ اس کے بعد ایک ہی دن میں ہمارے میاں بی بی پڑے اور چار دن میں پہلے بی بی اور پھر میاں چل بسے۔ باہر کے بھی کئی نوکر مر گئے۔ چھوٹے میاں کا عملہ دخلہ بیماری ہی سے ہو چلا تھا۔ بھی اندر عورتیں تو کوئی نہیں آئی تھیں مگر باہر نوکر چاکر اور خود میاں کے چھوٹے بھائی آگئے تھے۔ تین راتیں اس گھر میں بھیا کو لے کر جو میں نے کاٹی ہیں وہ مجھ کو نہ بھولیں گی۔ میری آنکھوں میں دنیا اندھیری تھی، حواس اور عقل سب رخصت ہو چکے تھے میری سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ میں زندہ ہوں کہ مر گئی ہوں کہ کوئی خواب دیکھ رہی ہوں۔ کھانا کھاتی تھی تو سواد نہیں ملتا تھا، سوتی تھی تو معلوم ہوتا تھا کہ جاگ رہی ہوں، جاگتی تھی تو معلوم ہوتا تھا کہ سو رہی ہوں۔ چوتھی رات تھی، میں بھیا کو لیے لیٹی تھی کہ خواب دیکھا کہ میرے بھیا کی طرف بہت سے شیر بھیڑیے اور جانے کیسے کیسے جانور دوڑے چلے آتے ہیں اور میں چیل ہوکر منڈلا رہی ہوں۔ بس ایک بارگی میں ٹوٹی اور بھیا کو پنجوں میں لے کر اڑ گئی۔ اب جو جاگی تو سارا جسم پسینہ میں ڈوبا ہوا تھا۔ ہاتھ پاؤں بے طاقت جی دھڑ دھڑ کر رہا ہے۔ ذرا حواس جمع ہوئے تب بھی یہی معلوم ہوتا تھا کہ جیسے وہ جانور ابھی تک ہیں۔ بس میاں میری سمجھ میں یہی آیا کہ بھاگو، اندھیری رات تھی میں نے بھیا کو گود میں لیا اور اٹھ کھڑی ہوئی جو لڑکا نوکر تھا وہ بے خبر سو رہا تھا اگر میں کچھ مال ساتھ لانا بھی چاہتی تو گھر بھر میں قفل پڑ چکے تھے کیسے لاتی مگر اس کا خیال کس کو جب دروازے کے پاس پہنچی تو خیال ہوا کہ بھیا کے کپڑے لے لوں۔

بھیا کے کپڑے میرے ہی پاس رہتے تھے۔ بیگم صاحب نے ایک صندوق مجھ کو دیا تھا اس میں ان کے اور اپنے دونوں کے کپڑے رکھتی تھی۔ لوٹ کر صندوق سے کپڑے نکالے، ایک گٹھری باندھی بیگم صاحب نے چاندی کا کچھ گہنا مجھ کو بھی بنوا دیا تھا وہ بھی میں نے لے لیا اور اپنا ایک جوڑا بس لے کر نکل کھڑی ہوئی۔ بھیا کے مونڈن اور ختنے میں مجھ کو بڑے اچھے اچھے جوڑے ملے تھے مگر میں نے وہ وہیں چھوڑے جو کچھ انعام اکرام میں مجھ کو ملتا تھا بیگم صاحب وہ اپنے ہی پاس رکھتی تھیں، اور مجھ کو زیور بنوا دیا کرتی تھیں۔ اب بھی بے چاری کے پاس کچھ روپیہ جمع تھا یاد نہیں کتنا۔ گہنا اور سات روپے جو صندوق میں تھے بس یہی لے کر میں چل کھڑی ہوئی۔

اندھیری رات مگر میں اندھیرے سے کیا گھبراتی، گاؤں سنسان تو تھا ہی الو بول رہا تھا مجھ کو کون ٹوکتا۔ صبح ہوتے ہوتے ایک ندی پار کرکے شاہ جہاں پور کی طرف چل دی۔ تین برس کا بچہ ماں باپ سے جب سے چھوٹا تھا کچھ سہم ایسا گیا تھا، گم سم، نہ روتا تھا نہ منہ سے کچھ کہتا تھا بس ہر وقت مجھ کو چمٹا رہتا تھا نہ معلوم کس چیز سے ڈرا ہوا معلوم ہوتا تھا اب کہاں تک مصیبت بیان کروں۔ دو مہینے گھومنے پھرنے کے بعد اس قصبے میں پہنچی۔ یہ مکان گرا پڑا یک رہا تھا خیر کسی طرح ٹھکانا ہوگیا۔

دو مہینے در بدر ماری ماری پھرا کی۔ ایسے وقت میں جو فقیرن نہ ہوتی وہ بھی مانگنے لگتی، مگر بھیا گود میں تھا۔ مجھ سے ہوا ہی نہیں کہ اس کو خیرات پر پالوں۔ جب اس گھر میں آئی تو یہیں ایک ٹوٹا چرخا پڑا ملا۔ اس کی مرمت کروالی اور سوت کاتنے لگی، ہماری بیگم اللہ جنت نصیب کرے سینے پرونے میں بڑی ہوشیار تھیں۔ تین برس اگر ہاتھ سے نہیں کیا تو آنکھوں سے تو ہر طرح کا کام دیکھا تھا۔ وہ کام تو میرے فرشتے بھی نہیں کرسکتے تھے، مگر سیدھا سادھا مجھ کو بھی آگیا اب اڑوس پڑوس سے اتنا کام مل جاتا ہے کہ صبح سے شام تک اپنا اور بھیا کا پیٹ پال لیتی ہوں اور جب سے قسط کے اوپر مشین ہوگئی ہے تب سے کچھ نہ کچھ بچا بھی لیتی ہوں۔ کیونکہ سال بھر کے بعد بھیا کے یہاں پڑھنے لکھنے کا سامان نہیں ہے اور اگر مر نہ گئی تو اس کے پڑھانے کا بندوبست تو ضرور کروں گی۔ اگر کسی طرح نہ ہوا تو بھیا کو مدرسے بھیج دوں گی اور میں پھر بھیک مانگ

مانگ کر اس کا خرچ چلاؤں گی۔

میں: خدا پر بھروسہ رکھو تمھاری ہمت ایسی ہے کہ اپنے لڑکے کو پڑھا لوگی۔

پردیسی بی بی: منشی جی میں جنم جنم کی فقیرن، بچپن سے یہی دیکھا، یہی کیا۔ مجھ کو بھیک مانگنے سے سہل کون چیز پڑتی۔ میرا اور بھیا کا پیٹ پل جاتا۔ مگر نہ معلوم کیا ہوگیا ہے کہ لوں تو اللہ بھلا کرے، ہر وقت منھ پر رکھا رہتا ہے مگر جب بھیا پاس ہوتا ہے تو نہ تو یہ ہاتھ ہی پھیلتا ہے اور نہ منھ سے سوال ہی نکلتا ہے۔

بیگم تم کروٹ کروٹ جنت میں رہو۔ تم نے اور تمھارے بیٹے نے میری دنیا سنوار دی۔ بیگم کچھ نیلم کے نگ کی بات کیا کرتی تھی کہ جس کو راس آجاتا ہے وہ بہت سکھ پاتا ہے۔ منشی جی میرا بھیا وہی نیلم کا نگ ہے۔ میری خود سمجھ میں نہیں آتا کہ میں کم بخت وہی ٹکڑگدی ہوں۔

○

نفاست

مرزا صاحب نے بڑی عمر پائی۔ 109 برس کے سن میں ابھی تھوڑے دن ہوئے کہ انتقال کیا ہے۔ مرنے کے دو چار دن پہلے تک وہی انداز رہا جو ہم لوگ ہمیشہ سے دیکھتے چلے آئے تھے۔ کچھ انگریزی سے بھی واقف تھے نہیں معلوم نوابی میں کس سے پڑھی تھی۔ نئی باتوں میں تو حافظہ ضرور کمزور ہوگیا تھا مگر پرانی باتیں اسی طرح یاد تھیں اور اس وضاحت سے بیان کرتے تھے کہ تصویر کھنچ جاتی تھی۔ الفاظ منہ سے نکلتے تھے اور معلوم ہوتا تھا کہ تختے پر موقلم کام کر رہا ہے۔ خوش بیانی کی تعریف نہیں ہوسکتی۔ منہ سے پھول جھڑتے تھے جی یہی چاہتا تھے کہ ''وہ کہیں اور سنا کرے کوئی۔''

بچہ ہو جوان ہو، بوڑھا ہو، عورت مرد سب یہی چاہتے تھے کہ مرزا صاحب باتیں کیے جائیں۔ مِلبا انگلستان کی کاہیکو یورپ کی مشہور گانے والی کے نام سے کسی نے اپنی تصنیف کو یوں عنوان دیا تھا ''اس بلبل غریب کے نام جو مِلبا کو سن کر چپ ہوگئی۔'' بس مرزا صاحب جب باتیں کرتے تھے تو اسی بلبل کی طرح سب چپ ہوجاتے تھے۔ احباب میں سے کسی نے شعر پڑھا ۔

اتنی نہ بڑھا پاکیِ داماں کی حکایت

دامن کو ذرا دیکھ ذرا بند قبا دیکھ

اس شعر کے متعلق باتیں ہورہی تھیں کہ مرزا صاحب آگئے۔ حسب عادت ہم لوگ اپنے خیالات چھوڑ کر مرزا صاحب کی باتیں سننے کے مشتاق ہوئے اور شعر پھر سے پڑھا گیا۔ مرزا صاحب '' شعر کے اچھے ہونے میں کلام کیا ہے۔ مگر مجھ کو ایک واقعہ یاد آگیا۔ ساٹھ برس سے اوپر کی بات ہوگی۔ نوابی جاچکی تھی، مگر نوابی کی بو ویسی ہی باقی تھی۔ ناچ گانے کے جاننے والے اور پہچاننے والے جب گھروں کے اندر بیٹھتے

تھے تو بھول جاتے تھے کہ دنیا بدل گئی ہے"۔

"کتھکوں کا ایک خاندان شجاع الدولہ بہادر کے وقت سے لکھنؤ میں آکر بسا تھا۔ ہر صاحبِ کمال، قدر دان کی تلاش میں رہتا تھا۔ اسی وجہ سے یہ لوگ بھی اس شہر پر جان فدا کیے ہوئے تھے اور یہیں کے نام سے بکتے تھے۔ اس خاندان نے ناچ میں لکھنؤ کا نام اونچا کردیا تھا۔ لکھنؤ نے بھی ان کے ساتھ یہ کیا تھا کہ پرانی مثل "یعنی کتھکوں کی بسا ہند نہیں جاتی" ان کے لیے غلط ٹھہرا دی تھی۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ جہاں تک تربھنگ کا تعلق تھا یہ عیب ان میں نام کو رہ گیا تھا۔ دوسرے خالص ناچوں کا حال جو جانتے ہوں وہ جانیں۔ ناچ علم سینہ بھی ہے اور علم سفینہ بھی جس کو جس قدر پہنچا ہے سامنے رکھ دے اور دامن جھاڑ کر ہٹ آوے۔ اس امانت میں خیانت کی گنجائش نہیں۔ دوسرے چیز بھاؤ بتانا ہے، اس میں ہر شخص کی ذہانت اور جودت اس کے ساتھ ہے۔ استاد کا کام صرف راہیں دکھا دینا ہے، آگے تم جانو تمھارا کام، ذہن رسا جہاں تک لے جائے بڑھتے جاؤ۔ مگر یہ کھیل اتنا نازک ہے کہ جس میں اچھائی برائی کے مدارج نہیں قائم کیے جاسکتے۔ اگر اچھا ہے تو بھاؤ ہے اور اگر بھونڈا ہے تو کوئی دوسری بلا ہے۔ بات شیطان کی آنت ہوگئی۔ مگر آپ لوگ میری بکواس سنتے ہیں، اس لیے اگر کہیے تو بھاؤ بتانے کی ایک مثال بھی دیتا چلوں"۔

ہم لوگ "ضرور ضرور"۔

مرزا صاحب "بہت خوب"۔

"میر مونس کے پڑوس میں ایک بھانڈ رہتا تھا۔ بچپن میں دونوں ساتھ کھیلے تھے۔ بڑھ کے دونوں کی راہیں جدا ہوگئی تھیں۔ مگر رشتہ باقی تھا۔ ایک مرتبہ اس بھانڈ کو ایک مشکل آن پڑی، مشکل یہ تھی کہ "گوری گگریا" بتانا تھا مگر ذہن وہاں تک نہیں پہنچ رہا تھا۔ موقعہ پاکر میر مونس مرحوم کے پاس آیا۔ اِدھر اُدھر دیکھ کر کہنے لگا، ایک کام ہے اگر کردینے کا وعدہ کیجیے تو کہوں، کہو تو۔ نہیں وعدہ کرلیجیے۔ وعدہ کیسے کرلیں، اگر امکان میں ہوا تو کریں گے۔ آہستہ سے "گوری گگریا" سمجھ میں نہیں آتا کہ کیسے بتاؤں، ہائیں لاحول و لاقوۃ میں کیا جانوں، بھانڈ (پاؤں کا پنجہ پکڑ کر) حضور میں تو یہ قدم نہ

چھوڑوں گا۔ بچپن سے جوتیاں سیدھی کی ہیں، اسی دن کے لیے۔ اگر آپ نے نہ بتایا تو میں جان دے دوں گا۔ میر صاحب (سنجیدہ ہوکر) ''کنواڑ بند کرواؤ'' مونس صاحب نے بائیں ہاتھ کی پانچوں انگلیاں اوپر کیں جیسے پھول کی آدھی سے ایک ذرا زیادہ کھلی ہوئی کلی ہوتی ہے، ہاتھ چہرے کے برابر اور سامنے لائے، داہنے ہاتھ سے ڈھیلی مٹھی باندھی اور بیچ کی انگلی کو سیدھی کر کے آدھی، اس طرح خم کی کہ بیچ کا پور دوسرے پوروں سے آگے نکلا رہا اور بائیں ہاتھ کی انگلیوں سے کچھ بلندی پر خیالی گگریا کو ٹھنکا مار دیا۔ خیر یہ تو جملہ معترضہ تھا۔ بھاؤ بتانے میں صرف ذاتی ذہانت ہی سے کام نہیں لیا جاتا بلکہ یہ بھی دیکھنا پڑتا ہے کہ کس کے سامنے کمال دکھایا جارہا ہے''۔

''انھیں کتھکوں میں ایک فن کار عالی قدر والا جاہ نواب وزیر مرزا بہادر چوکھی والے ''کدر پیا'' کے سامنے مجرا کر رہا تھا۔ جوانی کا عالم تھا، جوہر شناس کا سامنا تھا۔ جان توڑ کر اپنے کمالات دکھائے۔ اصطلاحوں میں باتیں ہوئیں۔ انکسار کے ساتھ داد چاہی۔ فراخ دلی سے حوصلہ افزائی کی گئی، ناچ کے بعد بھاؤ بتانے کا وقت آیا۔

گانے کی چیز کوئی ہو فن کار نہ معلوم کتنی خوب صورتیاں نکال لیتا ہے کتنی جدّتیں پیدا کرلیتا ہے۔

سویفٹ کے لیے کسی نے کہا ہے کہ اگر جھاڑو کی سوانح عمری لکھنے بیٹھتے تو وہ بھی دلآویز ہوتی۔ یہی حال بھاؤ بتانے والے کا ہے کہ اگر لطافت رکھتا ہو تو کیسی ہی بھدی چیز ہو، خوبصورت سے خوبصورت تصویریں دکھاتا چلا جائے گا، چیز جو اس نے شروع کی آپ کے شعر سے ملتی جلتی تھی۔ ''وہیں جاؤ جہاں رہے رتیاں'' کئی طرح ابھیاسار دکھایا، مان دکھایا، برہا کا خاکہ اتارا اور نہ معلوم کتنے پہلو، گوشے پیش نظر کردیے۔ آخر میں ایک جگہ پاؤں ڈگ گیا۔ کی کرائی محنت پر پانی پھر گیا موقع یہ تھا اب مکُرو نہیں، تمھارے کپڑوں کی خوشبو سے یہ ثابت ہے کہ تم سَوت کے یہاں تھے۔ دیکھو تمھارے لباس میں کون عطر ہے اور تمھاری بغل سے کس زنانے عطر کی لپٹیں آرہی ہیں۔ معشوق کو بغل سے جو نسبت ہے، وہ ظاہر ہے مگر بغل سے مطلب پہلو ہے اور کتھک نے غضب کیا کہ واقعی بغل کی طرف اشارہ کیا بس غضب ہوگیا۔

حضور کی لطافت طبع نزاکت مزاج کو ایسی ٹھیس لگی کہ منہ پھیر لیا۔ ہے ہے بدمذاقی کی انتہا کردی، اگر یہ بات دکھانی تھی تو پہلے آستینیں سونگھتا، پھر دامن سونگھتا، دونوں میں مختلف خوشبوئیں کہاں سے آئیں، ''وہیں جاؤ جہاں رہے رتیاں'' مطلب حاصل تھا''۔

○

(چہرو میاں) ''ایک دن اپنی نئی نئی شادی کا اور بیوی پر فریفتگی کا قصہ بیان کرنے لگے کہ میری بیوی کے پیٹ میں درد اٹھا، میں دواؤں پر دوائیں دے رہا تھا اور وہ مچھلی کی طرح تڑپ رہی تھیں۔ اتنے میں قصبے کی ایک بیوی ملنے کو آگئیں۔ میری بیوی کراہ رہی تھیں اور میں بے تاب ہو رہا تھا۔ درد کی شدت سے انھوں نے ایک چیخ ماری اور میں دیوانہ وار یہ کہتا ہوا ان پر جھک پڑا ''جان من میں کیا کروں، کیسے تمھاری تکلیف دور کروں۔''

مہمان بیوی نے جب یہ سماں دیکھا تو دوپٹے سے اپنا آدھا چہرہ ڈھک لیا اور بولیں۔ ''بھیا مجھے کوئی ڈولی بلا دو میں اپنے گھر جاؤں۔ اب یہاں جانِ من وانِ من ہونے لگا ہے ......''

(انیس قدوائی : اب جن کے دیکھنے کو......، صفحہ ۵۷)

جاگتی تصویریں

چودہ پندرہ برس ہوئے اکیڈمی آف آرٹ لندن میں ایک تصویر کی بڑی دھومیں تھیں۔ تصویر کا نام تھا "لبھانے کی راہیں" تختے پر پانچ چھ کم سن لڑکے تھے اور ایک چھوٹی سی لڑکی تھی۔ یہ سب پیرو اور پیرٹ تھے، جو تماشے میں ہنسی مذاق کا پارٹ کرتے ہیں۔ حسب قاعدہ ان کے چہرے سفید رنگے ہوئے تھے اور کپڑے بھی سفید تھے۔ سب کے سب لڑکی کو اپنی طرف مخاطب کرنے کی کوشش میں ہیں۔ ایک لڑکا اس کے پاس بیٹھا ہوا بڑے شوق سے اس کو پتّی لگی مٹھائی دے رہا ہے۔ گویا زبانِ حال سے کہہ رہا ہے کہ لو کھاؤ، ہم تم تو ایک ہی ہیں "میں اور میرا بنا اور سب روتا" ایک دوسرے صاحبزادے ایک چھڑی لیے اس کے گال کا نشانہ لگا رہے ہیں، گویا کونچ ہی تو دیں گے۔ ان کا فلسفہ ہے کہ ہنسی تو پھنسی اور یقین رکھتے ہیں کہ اگر اس طرح وہ کھِل کھِلا کر ہنس پڑی تو پالا یاروں ہی کے ہاتھ رہے گا، ایک تیسرے صاحب کپڑوں کی شکنیں دور کیے ہوئے ایک خاص آن سے علیحدہ بیٹھے ہوئے ہیں اور اپنی دلآویزی بڑھا رہے ہیں۔ 'بھنویں تنی ہیں خنجر ہاتھ میں ہے، تن کے بیٹھے ہیں کسی سے آج بگڑی ہے جو یوں بن ٹھن کے بیٹھے ہیں۔' اپنے زعم ناقص میں سمجھے ہوئے ہیں کہ جہاں انھوں نے یہ ٹھاٹھ بدلے، بس عورت رال کی طرح ٹپک ہی تو پڑے گی۔ اپنی آنکھ کی موہنی کے خود دل سے قائل ہیں، چاہے کسی اور کو کوئی دکھائی دیتی ہو یا نہیں، ایک اور صاحب ہیں، انھوں نے تو غضب ہی ڈھایا ہے، مغموم، مہجور اور چہرہ اداس، نیناں بان کے گھائل، دل پکڑے، کونے کے اندھیرے میں بیٹھے ہیں، گویا فرما رہے ہیں "اپنی بپتا میں کس سے کہوں، تمرے کارن جو دکھ پاوا" ہم لوگ اس تصویر کو دیکھ ہی رہے تھے، اتنے میں مرزا صاحب آگئے، فرمانے لگے۔

ارے میاں تم کاغذ پر دیکھ رہے ہو، ہم نے یہی تماشہ جیتے جاگتے انسانوں کا ان

آنکھوں سے دیکھا ہے۔ یاد ہے وہ سال جب فلاں نیم قومی نیم مذہبی جلسہ ہمارے لکھنو میں ہوا تھا۔ فلاں والئی ملک شریک ہوئے تھے، بھئی وہ اجلاس بھی یاد رہے گا۔ ڈائس پر کا سماں آج بھی آنکھوں میں پھر رہا ہے۔ جلسہ بیچ ادھڑ میں تھا کہ سواری کی آمد آمد معلوم ہوئی، جس طرح طوفان کے پہلے سکون ہوتا ہے، اسی طرح پورا جلسہ ساکن مگر حرکت کے لیے تیار۔ جیسے بھڑوں کا چھتہ اس وقت ہوتا ہے جب کوئی اس کے قریب آتا ہے۔ اتنے میں تشریف آ ہی گئی۔ اللہ اللہ وہ جوش، وہ نعرہ ہائے درود، پورے جلسہ نے سروقد تعظیم کی۔ اس کے بعد پھر کارروائی شروع ہوئی، ہم کو کچھ خبر نہیں کہ کیا ہوا۔ ہم تو چند حضرات ابوالخیرات کے دیکھنے میں ایسا محو ہوئے کہ جلسے کو بھول ہی گئے۔ ایک صاحب کا چہرۂ مبارک ہنستا پھول، بکستی کلی، کرسی پر متمکن مگر سر اور سینہ ایسا آگے کو جھکائے تھے گویا جو کچھ اوپر سے ٹپکے گا، یہی تو گوچ لیں گے۔

ایک دوسرے بزرگ اور استغنا کی تصویر تو کل کی نظیرِ بے نظیر اس طرح تشریف فرما تھے گویا الدنیا جیفة و طالبھا کلاب کا وِرد فرما رہے تھے، مگر باوجود اس کے ہر بُنِ مو سے ٹپکا پڑتا تھا کہ

بزم عشاق میں کیا جانے کدھر دیکھیں گے
دل یہ دیتا ہے گواہی کہ اِدھر دیکھیں گے

تیسرے صاحب انکسار و خاکساری کا مجسمہ زبان حال سے ''نہد شاخ بر میوہ سر برزمین'' فرما رہے تھے اور مہمان والا شان کی میزبانی کے تمام مراحل بے منت و بے سوال و بے استحقاق طے کرنے پر تلے تھے۔

چوتھے بزرگوار دولتِ علم و ایمان میں سرشار ظاہراً دنیا اور اہل دنیا سے بے پروا مگر باطناً پورے جلسہ سے خبردار چھت کا ملاحظہ فرما رہے تھے۔ انھیں میں ایک معتقد بندۂ خدا ایسا بھی تھا جو انانیت سے الگ اپنے کھلے ڈلے انداز سے "خیر الامور اوسطھا" کی تفسیر فرما رہا تھا۔ تصنع سے دور وہ توازن قائم کیے ہوئے تھا جس کو دیکھ کر انسان کی اشرفیت سمجھ میں آجاتی تھی۔

O

میزوکزم

اودھ کے ایک جنوبی ضلع میں مشاعرہ ہورہا تھا۔ مصرع طرح پر

''برق سی ایک چمک گئی آج سر نیاز میں''

اکثر شعراء کی تضمینیں تھیں۔ سب سے بہتر غزل میں مصرع طرح پر مصرع لگایا گیا تھ

اس سے زیادہ اور کیا شوخیِ نقش پا کہوں
برق سی اک چمک گئی آج سر نیاز میں

لوگوں نے تعریفوں کے پل باندھ دیے ہمارے مرزا صاحب نے صرف ایک واہ پر اکتفا کی۔ اس کے بعد ایک اور تضمین پڑھی گئی۔

ٹیپ جو اس نے جھاڑ دی کس کے وفورِ ناز میں
برق سی اک چمک گئی آج سر نیاز میں

مذاق کے اشعار کی تعریف سہل ہوتی ہے نقادی کی غلطیاں ہنسی میں ٹل جاتی ہیں۔ بڑا قہقہہ پڑا، بڑی تعریفیں ہوئیں، مگر مرزا صاحب نے ایسی سنجیدگی سے داد دی کہ شعر کی اصلی وقعت لوگوں پر کھل گئی اور احباب خاص سمجھ گئے کہ مرزا صاحب بعد کو اس شعر پر کچھ اور اظہار خیالات کریں گے۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ دوسرے تیسرے دن جب ہم لوگوں کی صحبت گرم ہوئی تو میں نے ذکر چھیڑا۔ مرزا صاحب نے کہا دو جنسی بیماریاں ہوتی ہیں جن کو سیڈزم اور میزوکزم کہتے ہیں۔ سیڈزم میں مار کر اور میزوکزم میں پٹ کر خالی لطف ہی نہیں آتا، بلکہ اندرونی اعضا کا تناؤ بھی کم ہوجاتا ہے اور تسکین بھی ہوتی ہے۔ مشاعرے سے واپسی پر ٹیپ والا شعر میرے ذہن پر برابر چھایا رہا۔ مجھ کو ایک واقعہ بھی یاد آگیا جو کہانی کی صورت میں کہا جاسکتا ہے۔ اگر کسی صاحب کا دل چاہے تو اس کو لکھ سکتے ہیں۔ ہیولاک ایلس کے یہاں قصہ کی ہر ہر بات

موجود ہے اور بیسوں طرح سے ظاہر ہوئی ہے اور اس طرح کی مثالیں روز دیکھنے میں آتی ہیں۔ حضرات قصہ ذرا لمبا ہے۔ اگلے زمانے میں لوگ دوستی میں تلواریں کھاتے تھے۔ زخم اٹھاتے تھے۔ اب تو یہ ہے کہ ہم بکواس کریں اور آپ نہایت صبر و تحمل سے اس کو سنئے۔

میں : مرزا صاحب معاف کیجیے گا۔ آفتاب کے داغوں کی طرح آپ میں بھی ایک عیب ہے کہ بلاوجہ انکسار شروع کردیتے ہیں۔ اجی حضرت اسی واسطے تو آپ کو چھیڑا ہے۔

مرزا صاحب : بہت خوب سنئے۔ ہمارے مکتب کے مولوی صاحب کی دو خصوصیتیں قصبہ میں مشہور تھیں۔ بڑوں میں تو یہ کہ ان کے شاگرد دنیا میں ناکامیاب نہیں رہتے اور لڑکوں میں یہ کہ بڑے قصائی قسم کا مولوی ہے۔ واقعی انھوں نے جہاں نیچے کا ہونٹ دبا کر کھچڑی داڑھی کھڑی کی بس قیامت آگئی۔ مولوی صاحب کی دو چوٹیں منجھی ہوئی تھیں ایک تو ہاتھ سے دوسرے قمچی سے۔ جب ہاتھوں سے مارتے تھے تو صرف گالوں پر آفت آتی تھی۔ جب قمچی چلتی تھی تو چوتڑوں پر۔ مولوی صاحب کی قمچی یا ہاتھ جب اپنا کام کرتے تھے تو معلوم ہوتا تھا کہ مینھ برس رہا ہے۔ بٹیر بازوں کی اصطلاح میں ایک بٹیر ہوتا ہے جو کڑوے منھ کا کہلاتا ہے اسی طرح مولوی صاحب کی ضربوں میں بھی ایک خاص قسم کی کڑواہٹ تھی یعنی وہ جگہ جہاں چوٹیں پڑتی تھیں سُن ہوجاتی تھی۔ یہ بات ہاتھوں سے کم اور قمچی سے زیادہ ہوتی تھی، مگر تھی دونوں میں۔ تھپڑوں میں تو لڑکا مبہوت ہوکر رہ جاتا تھا۔ مگر قمچیوں میں ایک عجیب بات تھی۔ یعنی دو چار ہاتھوں کے بعد جسم سُن ہوجاتا تھا۔ مگر ایک قسم کا حظ پیدا ہوتا تھا۔ یہ بات میں نے خود محسوس کی اور دوسروں سے بھی پتہ چلا۔ قمچی کی مار میں پہلے بڑی تکلیف ہوتی تھی، اس کے بعد ایک خاص قسم کا مزا پیدا ہوجاتا تھا۔ اس کے دو چار گھنٹوں کے بعد جو تکلیف شروع ہوتی تھی وہ دیر تک قائم رہتی تھی، مگر عجیب بات یہ تھی کہ لڑکے آپس میں اس حظ کا

ذکر نہیں کرتے تھے۔ ان کے چہروں سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ ایک دوسرے کی دلی کیفیتوں سے واقف ہیں۔ مگر ہمدردی کا موقع نہ سمجھتے تھے، میرے خیال میں ان کی حالت کچھ ان بیاہی عورتوں سے ملتی جلتی تھی جو ان کی کسی نئی دلہن سے مل کر ہوتی ہوگی۔ یہ خیالات مولوی صاحب مرحوم کے ایک شاگرد کے دل میں کیوں آئے۔ اس وجہ سے مولوی صاحب کی مار میں کچھ جنسی لگاؤ ضرور تھا۔ لڑکپن میں یہ بات ان کے شاگردوں کے وہم و گمان میں بھی نہ تھی۔ مگر دنیا دیکھنے کے بعد اب سمجھ میں آئی ہے۔

ہمارے ایک ہم سبق تھے، جو بعد کو پولیس انسپکٹر ہوگئے تھے اور بہت دن پنشن کھا کر ابھی ابھی مرے ہیں۔ گوکہ مرحوم انسپکٹر اس جوار میں نہیں رہے، پھر بھی ان کے کارنمایاں ڈاکوؤں کے پکڑنے اور اپنی جان جوکھم میں ڈالنے کے آج تک مشہور ہیں۔ پولیس کا سب سے بڑا بادشاہی تمغہ ان کو ملا تھا اور خاص پنشن پائی تھی۔ نام کیا کیجیے گا پوچھ کر۔ شاید آپ حضرات میں سے کوئی جانتا ہی ہو تو کیا فائدہ میرے خیال میں مولوی صاحب کی مار کا اثر عمر بھر رہا، آپ کہیں گے کہ دوسروں پر وہی اثر کیوں نہ ہوا۔ اس کا جواب میرے پاس صرف یہ ہے کہ نزلہ کی ہوا چلتی ہے موسم کا تغیر و تبدل ہوتا ہے لیکن سب پر ایک طرح کا اثر دکھائی نہیں دیتا، کسی کو زکام بھی نہیں ہوتا، کسی کو زکام سے کھانسی، کسی کو نمونیا ہوجاتا ہے۔ نمونیا کے بعد کسی کے آگے نزلہ زکام ہاتھ باندھے کھڑے رہتے ہیں۔ کسی کو دمہ ہوجاتا ہے اور کسی کو یاد بھی نہیں رہتا کہ تحریک بھی ہوئی تھی۔ شبلی کے طالب علمی کے زمانے میں انگلستان میں بھی یہی فلسفہ تھا کہ لڑکے کو اگر تباہ کرنا ہو تو مولوی صاحب تچی گھر دھر آویں اسی ایٹن میں نازک اندام شبلی پر جو مار پڑ چکی ہے وہ ضرب المثل ہے۔ شبلی کے زندگی کے جو خاص پہلو ہوئے وہ بھی آپ سے چھپے نہیں۔ ایٹن کے ڈاکٹر کیٹس امراء کے لڑکوں کو مار مار کر فرنچ ریولیوشن کے اثرات سے محفوظ رکھنا چاہتے تھے۔ جھوٹ بولو کوئی نقصان نہیں ہے، بدعقیدہ ہو کوئی ہرج نہیں، لیکن منہ سے کوئی ایسی بات نہ نکلنے پائے جس میں جھوٹ یا لامذہبی کا انداز کھل جائے۔ سچے دِلی خیالات کوئی پا جائے۔ فٹ بال یا ہاکی میں ٹانگ ٹوٹ جائے

کوئی ہرج نہیں ہے۔ باکسنگ میں کوئی لڑکا مرجائے تو کچھ پروا نہیں ہے مگر انگلستان کے امراء سے ان کی خصوصیات نہ چھوٹیں، ہمارے انسپکٹر صاحب نے اسی مار سے دوسرے اثرات قبول کیے، ان کا ڈیل ڈول مکتب میں سب سے زیادہ تھا۔ پڑھنے میں تو ایسے ہی ویسے تھے مگر کبڈی وغیرہ میں کوئی ان کا مقابل نہ تھا۔ جوان ہونے پر چھ فٹ دو انچ کا قد، بیالیس انچ کا سینہ، کوئی کہاں سے لاتا جو ان سے ٹکر لیتا۔ رنگ کالا تھا، ماں باپ نے سیپ کا دُر کان میں ڈال دیا تھا۔ اس لیے ہم لوگ ان کو موتی گنج کہتے تھے۔ بعد کو ان کی شادی ایک خوبصورت لڑکی سے ہوئی تھی۔ کامنی عورت کی تعریف کتابوں میں پڑھی تھی۔ مگر دیکھا انسپکٹر کی بی بی کو۔ صورت شکل، مزاج، چال ڈھال کیا بیان کروں، بس یہ سمجھ لیجیے کہ خوبصورت سے خوبصورت عورت اسی وقت تک خوبصورت معلوم ہوتی تھی جب تک رباب محفل میں نہ ہوں۔ اے لیجیے میں نام بھی لے گیا۔ خیر ہوگا، مگر ہمارے انسپکٹر صاحب کافر نعمت تھے، جیسے سوکھے ساون ویسے ہرے بھادوں۔ ان کے منھ سے کبھی اس غریب کا ذکر نہ سنا۔ ان کو اپنے کار منصبی اور کشتی لڑنے سے فرصت نہ تھی۔ جو اس غریب کو پوچھتے۔ ورزش بھی ان کی کچھ نرالی ہی تھی۔ ہاتھ پاؤں کو دیکھتے ڈنڈکم لگاتے، مگدر کا صرف یکہ ہلاتے تھے، جس میں نمائش زیادہ اور فائدہ کم ہوتا ہے ممکن ہے کہ اس کی یہ وجہ رہی ہو کہ ان کی جوڑ کا دوسرا پہلوان نہیں تھا یا ان کو اپنی قدرتی طاقت پر اتنا بھروسہ تھا کہ زیادہ محنت کرنے کی ضرورت نہیں سمجھتے تھے۔ کشتی کا انداز متھرا کے چوبوں کا تھا۔ جیسے بھاری جوڑوں میں ہوتا ہے چلت پھرت کم، جہاں انسپکٹر صاحب نے زمین پکڑی، پھر کیا مجال کہ کوئی ہمسا سکے گھنٹہ دو گھنٹہ خوب گدے کھائے۔ مخالف نے خوب گھسّے بتائے۔ اس کے بعد نیچے سے نکلے تو مقابل کو آسمان دکھا کر اکھاڑے سے نکل آئے۔ اکثر تو یہ ہوتا تھا کہ دو دو پٹھوں کو ساتھ زور دلوایا۔ کشتی خوب صورت نہ سہی کثرت تو ہوگئی۔ ہمارے انسپکٹر عورتوں سے متنفر نہ تھے۔ کیونکہ ناچ مجرے کے جلسوں میں ان کو کافی دلچسپی ہوتی تھی اور باوجود پہلوان ہونے کے صنف نازک کے قدردان سمجھے جاتے تھے مگر نہ جانے بی بی سے کیوں لطف نہ تھا، ایسی بی بی جس کا میاں اس کو نہ چاہتا ہو اوروں کی نظر میں نہیں آتی۔ اسی وجہ سے ان کی بی بی بھی باوجود خوبصورتی کے کسی خاص گنتی شمار میں نہ

تھی۔ ایک معتد بہ زمانے کے بعد غریب کا انتقال ہوگیا۔ انسپکٹر صاحب نے جب اس نعمت کی قدر پہلے نہیں کی تو اب زوال کے بعد کیا کرتے۔ پنشن کا وقت بھی قریب آگیا تھا۔ کسرتی بدن پہلے بھی خوبصورت نہ تھا، اب تو گوشت بھی ڈھیلا ہو چلا تھا اور توند بھی نکل آئی تھی۔ مگر پٹھوں کو زور کرانا اور کشتی کو پرانے انداز میں جاری رکھنا اب بھی چلا جاتا تھا۔ ان کے تبادلے مختلف مقامات پر ہوا کیے لیکن ان کی کشتی اور ہماری دوستی کا سلسلہ جاری رہا۔ آخری زمانہ ملازمت میں مجھ کو وہاں جانے کا پھر اتفاق ہوا، جہاں انسپکٹر صاحب تعینات تھے، گو کہ خوش تھے مگر تنہائی کی شکایت کرتے تھے۔ اپنے قیام کے زمانے میں مجھے ایک نئی بات دکھائی دی۔ یعنی انسپکٹر صاحب کو مچھلیاں کھانے کا شوق ہوگیا ہے اور ایک مچھلی والی کوئی پینتیس برس کا سن، سانولی رنگت، گداز ہاتھ پاؤں، لمبی تڑنگی عورت صبح کو مچھلیاں دے جاتی ہے۔ گھر میں اس کا آنا جانا، مچھلیاں باورچی خانہ میں رکھنا اور عموماً سودے والیوں سے زیادہ بے تکلفی برتنا کچھ غیر معمولی سا معلوم ہوا۔ میں نے مذاق میں پوچھ ہی لیا۔ ارے میاں بڑی کڑوی ہے، ادھر خیال بھی نہ لے جانا۔ (کچھ رک کر) بھئی مرزا تم ہمارے پرانے یار ہو، تم سے پورا واقعہ بیان کیے دیتا ہوں، جس دن پہلے پہلے یہ مچھلیاں بیچنے آئی، میں بنگلہ کے سائبان میں بیٹھا تھا۔ نوکر کہیں گیا تھا، میں نے مچھلیاں خریدیں اور یہ وہیں بیٹھ کر بنانے لگی۔ مجھ کو نہ معلوم شیطان نے کیا انگلی دکھائی کہ میں نے کہا مکھیاں بہت ہیں، چلو اندر چل کر بناؤ، یہ بے تکلف اندر چلی آئی اور اپنے کام میں مشغول ہوگئی۔ میں نے صدر دروازے میں کنڈی لگا دی، تب بھی یہ خبر دار نہ ہوئی اب مسکراتا ہوا قریب آکر بیٹھ گیا اور ہاتھ بڑھایا تب تو یہ شیرنی مچھلی کاٹنے کی بیٹھی لے کر کھڑی ہوگئی اور بولی اگر یہ کروگے تو مارتی ہوں۔ آنتیں ڈھیر ہو جاویں گی۔ بھیا میرے حواس پینترا ہوگئے۔ میں نے دروازہ کھول دیا اور کھسیانے پن سے اس کو اطمینان دلایا۔ تب سے یہ ہوگیا ہے کہ یہ روز آکر مچھلیاں دے جاتی ہے اور اگر ضرورت ہو تو بازار کا سودا سلف بھی کر دیتی ہے۔ ایک دن باورچی بیمار پڑ گیا تھا تو اس وقت کا کھانا بھی بغیر میرے کہے پکا گئی تھی، مگر تب سے پھر اس طرح کی کوئی بات کرنے کا ہیاؤ نہ بندھا۔ ہمارے دوست یہ باتیں کر رہے تھے اور میرا دل نہ معلوم کیوں مولوی صاحب کی مار، اکھاڑے کی رگڑ تگڑ اور

مچھلی والی کا اپنا اوزار لے کر کھڑی ہو جانا، ایک ہی سلسلہ میں گوندھتا ہی رہا۔

اس واقعہ کے دو ہی برس کے بعد انسپکٹر صاحب کی پنشن ہوگئی مگر وہ وطن نہ آئے، بلکہ سنا گیا کہ وہیں کہیں بازار میں ایک مکان لے لیا ہے اور اسی مچھلی والی سے نکاح پڑھوا لیا ہے۔ پھر میرا اتفاق اس ضلع میں جانے کا ہوا۔ ان باتوں کے سننے کے بعد میرا پاؤں انسپکٹر صاحب کے مکان کی طرف نہ اٹھا اور میں ایک وکیل دوست کے یہاں ٹھہر گیا۔ باتوں باتوں میں میں نے انسپکٹر صاحب کا حال پوچھا۔ وکیل صاحب ''ارے صاحب ان کی تو عجیب حالت ہوگئی ہے۔ ایسی کایا پلٹ تو دیکھی ہی نہیں۔ پڑھے لکھوں کی صحبت تو ان کی کبھی تھی نہیں، وہی پہلوان وغیرہ ان کے یہاں آتے جاتے تھے۔ مگر اب تو نہ معلوم کیسی مت پلٹی ہے کہ سمجھ میں نہیں آتا۔ بازار میں ایک چھوٹا سا مکان کرایہ پر لے لیا ہے اب وہ ہیں اور مچھلی والی۔ نہایت گندی گلی ہے مگر وہ مگن ہیں۔ سنا جاتا ہے کہ مسماۃ نشے میں مرمت بھی کرتی ہیں۔ گالم گلوج تو اڑوس پڑوس والے ہر وقت سنا کرتے ہیں، مگر انسپکٹر صاحب، ہم تم راضی تو کیا کریں قاضی ان واقعات کے سننے کے بعد دل میں کچھ ایسی گدگدی اٹھی کہ ٹہلتا ہوا وہاں پہنچ ہی گیا۔ دیکھتا کیا ہوں کہ انسپکٹر صاحب برآمدے میں ایک کھرّی چارپائی پر پاؤں لٹکائے بیٹھے ہیں اور ایک سڑیل حقہ پی رہے ہیں۔ مجھے دیکھ کر بہت خوش ہوئے اور اصرار کرنے لگے کہ یہیں ٹھہرو۔ ان کی مسماۃ بھی کوٹھری سے نکل آئیں اور اس اصرار میں شریک ہوگئیں۔ میرے دل کی عجیب کیفیت تھی، پرانا یار اور اتنے دنوں کے مراسم کچھ کہتے نہیں بنتا تھا نہ معلوم کیا ہوا کہ میں نے ہامی بھرلی۔ انسپکٹر صاحب جلدی سے اٹھے اور سڑک پر اتر کر پاس کے بنئے کو پکارا۔ ارے لالہ ذرا اس کمرے کی کنجی تو دینا، ہمارے ایک دوست آگئے ہیں۔ کنجی لے کر درمیان کی کوٹھری سے ملا ہوا کمرہ کھول دیا۔ درمیانی کوٹھری سے ایک دروازہ اس میں کھلتا تھا۔

انسپکٹر صاحب نے بتایا کہ مرزا صاحب یہ کمرہ اسی واسطے ہے یہ اسی مکان سے متعلق ہے مگر ہم لوگوں کو کیا کرنا ہے۔ اس طرح کرایہ بھی کم ہوگیا اور جب ضرورت ہوتی ہے کھلوا بھی لیتے ہیں۔ اکیلا کمرہ کون لیتا، خالی ہی تو پڑا رہتا تھا جو مکانیت انسپکٹر صاحب کے قبضے میں تھی، اس میں صرف دو کوٹھریاں اور اس کے آگے ایک برآمدہ

پشت پر ایک چھوٹی سے انگنائی اور پائخانہ، ان کے سامنے کوٹھری کے اندر ایک چھپر پڑا تھا جو باورچی خانے کا کام دیتا تھا، اللہ اللہ خیر صلاح، ایک کوٹھری میں گھر کا سامان تھا۔ دوسری کوٹھری انسپکٹر صاحب کا استراحت خانہ، بیڈ روم جو سمجھیے، ان کی بی بی نے کھانا تیار کیا۔ تامچینی کی کوری پلیٹوں، پیالوں میں کھانا آیا۔ ہم لوگ کھا کر حقہ پی پی کر سونے چلے گئے۔ رات کو دو تین کا عمل رہا ہوگا کہ میری آنکھ کھل گئی، میرے کمرے میں روشنی نہیں تھی کیونکہ مجھ کو اندھیرے میں سونے کی عادت ہے۔ انسپکٹر صاحب کی کوٹھری میں روشنی تھی اور کچھ عجیب طرح کی آوازیں آرہی تھیں جو فوراً جاگنے کے بعد اور زیادہ بھیانک معلوم ہورہی تھیں، معلوم ہوتا تھا کہ جیسے کوئی کراہ رہا ہے۔ اس طرح کے موقعوں پر مختلف آوازیں سن کر بجائے پریشان ہونے کے ہنسی آنا چاہئے مگر کچھ اور آوازیں تھیں جن سے میری پریشانی کی انتہا نہ رہی۔ نہ معلوم کون کون فاسد خیالات دماغ میں آگئے۔ ایک آواز تو ایسی تھی جیسے کوئی تھپڑ مار رہا ہے۔ دوسری آواز تھی جیسے کوئی لاٹھی کا ہولا بارہا زمین پر مار رہا ہے۔ مجھے تاب نہ رہی میں نے دراڑے سے دیکھ ہی لیا۔ کیا دیکھتا ہوں کہ انسپکٹر صاحب زمین پر چٹائی بچھائے لیٹے ہیں اور مچھلی والی ان کے سینے پر کھڑی ان کو روند رہی ہے اور دونوں ہاتھوں میں دو لاٹھیاں پکڑے ہے کہ انسپکٹر صاحب پر سے پھسل نہ جائے، جب پیٹ کی طرف سے بڑھتی ہوئی سینے پر پہنچتی ہے تو لاٹھی پر زور دے کر باری باری ایک ایک پاؤں اٹھا کر پنجے اور تلوؤں سے انسپکٹر صاحب کے منھ اور سر پر طمانچے مارتی ہے۔ دونوں آدمی اس حالت میں ہیں جیسے دنیا میں آئے تھے عورت کی دھرتی دھمک چال سے یہ پتہ نہیں چلتا تھا کہ وہ بھی کچھ لطف اندوز ہورہی ہے یا نہیں مگر انسپکٹر صاحب مزے میں آکر اس کے پاؤں کی لے پر دونوں ہاتھوں سے چٹکیاں بجا رہے تھے، کالی اور مہا کالا کا شاکتی ناچ معہ سب سامان کے ہورہا تھا۔ اِس ناچ کی پانچوں ضروری چیزیں مہیا تھیں مے تھنا، مدھ مچھلی والی کی طرف سے مدُرا انسپکٹر صاحب کے اٹھے ہاتھوں کو سمجھ لیجیے۔ رہے ماس اور مچھلی۔ جہاں دو اتنے تن و توش کے آدمی موجود ہوں وہاں گوشت کی کیا کمی، مچھلی والی مچھلی کی کمی کو پورا کر رہی تھی۔

○

میٹھا معشوق

اللہ بخشے مرزا صاحب کا دماغ بذلہ سنجیوں کا ذخیرہ تھا، زبان چٹکلوں کی پوٹ تھی
پھر عمر بھی اتنی پائی کہ دوسرے کے پاس اتنا سامان ہو ہی نہیں سکتا تھا۔ اس کے علاوہ
انداز بیان کچھ ایسا تھا کہ سیدھی سیدھی بات روزمرہ کے واقعات جب کہنے لگتے تھے تو
داستان گو کی داستانیں مات تھیں۔ نہ معلوم کس طرح کا الٹ پھیر لفظوں کا ہوتا تھا کہ
جملوں میں نئے نئے معنوں کی جھلک پیدا ہوجاتی تھی۔ فقروں میں اصلی معنی کے ساتھ
ساتھ دوسرے پہلوؤں کی پرچھائیاں دکھائی دیتی تھیں۔ جیسے نگینے کی چھوٹ پڑتی ہے۔
اختصار کے بادشاہ تھے۔ ایک دن ایک شاعر صاحب کہنے لگے میں تو بہت کم کہتا ہوں۔
مرزا صاحب بولے خیر غنیمت ہے۔ ان کا طول بھی ایسا ہی دل آویز ہوتا تھا۔ کسی نے
مزاج شریف پوچھا، کہنے لگے اگر شکر نہیں بھی ہے تو شکایت کی مجال کس کو ہے۔

ایک قصہ خود اپنے خاندان کا بیان کرتے تھے مگر وہ زبان کہاں سے لاؤں گا،
فرمانے لگے کہ غدر کے بعد ہمارے ایک دادھیالی عزیز تھے۔ لکھنؤ سے فاصلہ پر رہتے
تھے۔ ان کا مقدمہ فائنانشلی میں تھا۔ ریل اس وقت تک نکلی نہیں تھی۔ لوگ شکرم اور
اونٹ گاڑیوں پر سفر کرتے تھے۔ امراء کہاروں کی ڈاک بٹھاکر چلتے تھے۔ متوسط حال
لوگ اپنے گھر کی رتھ بہلیوں پر معہ نوکروں چاکروں کے آہستہ خرام بلکہ مخرام کی چال
چلتے تھے۔ انھیں حضرات میں مرزا صاحب کے چچا بھی تھے، خود بہلی پر، اور مصاحبت
میں مختصر ریاست کے دیوان منشی بخت بلی کائستھ جن کے چھوٹی بڑی ریاست کا ہونا ویسا
ہی ممکن تھا جیسے ان کی ماش کی دال بے ہینگ کے ہو۔ جلو میں کارکن صاحب جن کو
نائب کہہ لیجیے ٹٹو پر ایک لٹھ بند سپاہی اور دو نفر ہمراہی جن میں ایک بڑے مرزا صاحب
کا خدمتگار اور دوسرا نائب صاحب کا نیم سائیس اور نیم خدمت گار اور وقت ضرورت
باورچی بھی۔ میری گستاخی کی جسارت معاف ہو۔ اس جگہ میں اپنے پڑھنے والوں کا

امتحان لینا چاہتا ہوں، بھلا بتایئے تو اس کہانی کا ہیرو کون ہے۔''اتنے کے بیچ موری بندیا ہرانی۔'' ہے انھی لوگوں میں مگر تنکے اوٹ پہاڑ اگر آپ بوجھ گئے تو ہم بھی قائل ہیں۔

بہلی کے ساز و سامان میں بچھونے، لالہ کی لٹیا، مرزا صاحب کا لوٹا، جانماز، مختصر سامان مطبخ ایک عدد توا اور ایک دو پتیلیاں، کچھ دال مسالے کی پوٹلی بہلی کے پیچھے جال میں، مِسل مقدمہ کی دیوانجی کی بغل میں، مگر لالہ صاحب اور بڑے مرزا صاحب کے درمیان میں اور گاڑی بان کے پیچھے یہ کون چیز رکھی ہے۔ حضرت اس کو نہ پوچھیے، یہی تو قصے کی جان ہے۔ اگر یہ نہ ہوتی تو کہاں ہم کہاں آپ، کہاں یہ کہانی، بڑے مرزا صاحب کے ایسے ہزاروں سفر کر گئے، ہزاروں سفر کر رہے ہیں اور لاکھوں سفر کریں گے، مگر ہر مسافر کی کہانی تھوڑے ہی لکھی جاسکتی ہے۔ داستان گو اور قدردانوں کو جمع کرنے والی وہی ہے جو بہلی کے بیچوں بیچ میں بڑی حفاظت سے رکھی ہے۔ یہ مٹھائی کی ایک ٹوکری ہے جس میں کم سے کم دس بارہ سیر مٹھائی ہوگی۔ اس پر ایک پرانی چادر سِلی ہوئی ہے اور انداز سے سوغات معلوم ہوئی ہے۔ تین دن دو راتوں کا سفر ہے، خدا خدا کرکے پہلا دن کٹا، سرا کی صورت دکھائی دی۔ کمریں کھلیں، اسباب اتارا گیا۔ لالہ نے عرض کی کہ ان کے ایک عزیز کا گھر سرائے سے تھوڑی ہی دور پر ہے۔ اگر بڑے مرزا صاحب اجازت دیں تو یہ وہیں سو رہیں۔ ضروری سامان مثل حقہ، بچھونے کے، کوٹھری میں اتارا گیا۔ باقی بھٹیاری کی سپردگی میں دیا گیا۔ اتنے میں بھٹیاری پان کھائے مکہ لال کیے مسکراتی سامنے آن کھڑی ہوئی۔ میاں مٹھائی میرے یہاں نہ رکھتے تو اچھا ہوتا۔ میرے لڑکے بہت شریر ہیں، کھانے پینے کی چیز رکھنے والا میرا گھر نہیں۔ اگر نقصان ہوگیا تو میں کہاں سے پورا کروں گی۔ بڑے مرزا صاحب پریشان ہوگئے، بے ساختہ اپنے خدمت گار پر نگاہ جمائی اور پھر کارکن صاحب کی طرف بے بسی سے دیکھا اور زبان حال سے بولے کہ بتاؤ اب کیا کیا جائے جب کوئی کچھ نہ بولا تو فرمانے لگے کہ مٹھائی اس کوٹھری میں نہیں رہ سکتی۔ اپنے خدمت گار کی طرف اشارہ کرکے کہنے لگے کہ جب تک یہ مردود یہاں ہے مٹھائی کی ٹوکری اس کوٹھری میں نہیں رہ سکتی۔

ملازم: (نہایت بے باکی سے جس میں گزشتہ اورموجودہ جھوٹے سچے الزامات کی شکایت بھی پائی جاتی تھی) ہم آپ کی کوٹھری کے پاس نہ جائیں گے۔ ایسی ایسی مٹھائی کی طرف ہم پھر کے بھی نہ دیکھیں گے۔ راستے میں چھوڑ کر چلے جانا نمک حرامی ہے، مگر گھر پہنچ کر میاں ہمارا حساب ہوجائے۔ پچ پی ہزار نعمت کھائی۔ اب ہم نوکری نہ کریں گے۔ چار آدمیوں کے بیچ میں جب دیکھو آپ ہم کو چوری لگاتے ہیں، ہاتھ بیچا ہے کوئی ذات نہیں بیچی ہے، جب آبرو ہی نہ رہی تو نوکری کس کام کی۔ اپنے گھر کے سوکھے ٹکڑے ہم کو بہت ہیں، جہاں کام کریں گے وہیں پیٹ پَل جائے گا۔

بڑے مرزا صاحب (نائب صاحب کی طرف اس طرح مخاطب ہوئے گویا انھوں نے ملازم کی باتیں سنی ہی نہیں) شیخ جی یہ مٹھائی کہاں رکھوائی جائے۔

شیخ جی: آپ کو اگر ایسا ہی خیال ہے تو منشی بخت بلی کے ساتھ کردیجیے، صبح کو لیتے آئیں گے۔ ہاں ہاں ٹھیک ہے۔ لالہ تم یہ ٹوکری لیتے جاؤ، اسی طرح یہ بچ سکتی ہے، نہیں تو یہ مردود ضرور کھا جائے گا۔

ناظرین! ایسے بدتمیز، بدنیت نوکر کو رکھنا مرزا صاحب ہی کا کام تھا۔ کیونکہ بجائے ہمارے آپ کے مرزا صاحب ہی کا ہاتھ پتھر کے نیچے دبا تھا۔ گھر میں ایک نوجوان لڑکی رہتی تھی۔ اس سے اور بڑے مرزا صاحب سے کچھ لگا سگا ہوگیا، بے چارے بھاری بھرکم، مہذب، شائستہ، ذی عزت آدمی تھے، مگر دل کے ہاتھوں مجبور ہوگئے تھے اور اس مقام پر پہنچ چکے تھے جہاں رذیل شریف سب میں مساوات ہوتی ہے۔

بندۂ عشق شدی ترک نسب کن جامی
کاندریں راہ فلاں ابن فلاں چیزے نیست

چیز اچھی تھی، جیسے گھورے کا گلاب، نہ پگڑی میں لگاتے بنے نہ توڑ کر پھینکتے بنے۔ اس لیے یہی ٹھہری تھی کہ ایک ٹٹی کی آڑ ضرور ہونی چاہیے اور یہ ملازم صاحب وہی ٹٹی تھے، جن کی آڑ میں شکار ہوتا تھا چونکہ ان واقعات سے تینوں فریق واقف

تھے۔ اس وجہ سے آپ ہی کہیے کہ اس تثلیث میں تفریق کیوں کر ہوسکتی تھی۔ رات کو لوگوں نے آرام کیا اور صبح اندھیرے منھ چلنے کا پاٹراب ہوا۔ مگر منشی جی کو آنے میں کچھ دیر ہوئی۔ مرزا صاحب کا ملازم دوڑا گیا۔ منشی جی آئے تو مگر بہت پریشان اور شرمندہ۔

منشی جی: حضور ایک بڑی غلطی ہوگئی ہے جو سزا دیجیے کم ہے، مجھ سے ایک چوک ہوگئی۔

مرزا صاحب: کیا چوک ہوگئی ہے۔

منشی جی: چوک حضور یہ ہوگئی ہے کہ جب آپ کا خدمت گار پہنچا تو میں نے اپنے عزیز سے کہا کہ مٹھائی اندر سے منگواؤ اور میں بیٹھ کر داتون کرنے لگا، اتنے میں ٹوکری میں کتے نے منھ ڈال دیا۔

بڑے مرزا صاحب: ایں یہ کیسے ہوا (خدمت گار کی طرف اشارہ کرکے) اور یہ کہاں تھا۔

منشی جی: یہ بھی وہیں تھے۔ انھوں نے ہی دوت دوت کہا مگر وہ منھ ڈال چکا تھا۔

بڑے مرزا صاحب: اجی بالکل غلط، کتاؤتا کچھ نہیں، یہ اسی بے ایمان کی حرکت ہے۔ تم منشی جی اس کو کیا جانو یہ بڑا حرام زادہ ہے۔ حرام خور نمک حرام آدمی ہے۔

ملازم: آپ ہم ہی کو کہتے ہیں، دیکھیے کپڑا دانت سے پھٹا ہے کہ نہیں، اگر میں دوت دوت نہ کرتا تو سب کھا جاتا۔

بڑے مرزا صاحب: کچھ نہیں ایک ہی طرف تو خراب ہوئی ہے اس نے کپڑا دانت سے پھاڑ ڈالا ہوگا اور پھر دوت دوت چلایا ہوگا۔ اجی میں اس کے ہتھکنڈوں سے خوب واقف ہوں۔ بھٹیاری سے کہو کہ جلدی سے اس کو سی دے، یہ مٹھائی خراب وراب نہیں ہے۔

لیجیے صاحب دوسرے دن کا سفر شروع ہوا اور شام کو بجائے سرائے میں سونے کے میدان میں پڑاؤ ڈالنے کی ٹھہری، چاندنی آدھی رات کے پہلے پہلے کھیت کر آئے

گی۔ چپقلش سے یہ کھلے میدان کی ہوا کہیں خوشگوار ہے۔ بہلی ایک طرف کھڑی کی گئی اور بیل اور گھوڑا درختوں سے باندھے گئے۔ گاڑی بان اور سائیس جانوروں کی حفاظت کے لیے نکل گئے۔ باقی لوگ مٹھائی کی رکھوالی کرنے لگے۔ بیچ میں مٹھائی کی ٹوکری اور اس کے ایک طرف بہ نفس نفیس خود مرزا صاحب کا بستر لگا۔ دوسری طرف نائب صاحب، تیسری طرف منشی جی کا اور چوتھی جانب سپاہی تعینات ہوا۔ یہ دیکھ کر خدمت گار نے اپنا مختصر بچھونا بہت دور ہٹ کر لگایا۔ رات کو دو کا عمل رہا ہوگا کہ دور سے آواز آئی، دوت دوت۔

مرزا صاحب اٹھ بیٹھے اور نائب صاحب سے کہنے لگے، شیخ جی دیکھتے ہیں آپ، کتا اسی سالے کو دکھائی دیا اور کسی کو نہیں۔

خدمت گار: میاں آپ گالی دے رہے ہیں۔ وہ دیکھیے کالا کالا جارہا ہے۔ خیر رات کو بھاگتا ہوا کتا کسی کو کیا دکھائی دیا ہوگا۔ مگر ٹوکری کا کپڑا پھر اسی طرح پھٹا ہوا پایا گیا اور کچھ مٹھائی بھی اِدھر اُدھر پڑی دیکھی گئی۔ کتے اور آدمی کا مسئلہ دوبارہ تازہ ہوا۔ آج بھٹیاری تو تھی نہیں، لیکن سوئی دھاگہ سپاہی کے بٹوے میں نکل آیا اور مرزا صاحب نے خود گانٹھ گانٹھ کر ٹوکری کو درست کیا اور شاموشام بخیر و خوبی لکھنؤ پہنچ گئے۔

لکھنؤ سے دو چارکوس پہلے جب بڑے مرزا صاحب ایک خاص ضرورت سے اَرہر کے کھیت کی طرف تشریف لے گئے تھے اور خدمت گار لوٹا لے کر ساتھ گیا تھا، اس وقت منشی جی اور سپاہی میں مٹھائی کی باتیں چھڑیں تھیں۔ ان دونوں آدمیوں کو مٹھائی سے کوئی واسطہ ہی نہیں ہوسکتا تھا، اس لیے یہ لوگ بہتر رائے قائم کرسکتے تھے۔ منشی جی کا خیال تھا کہ مرزا صاحب اتنے شوق سے مٹھائی کی سوغات لے کر چلے ہیں وہ نہیں چاہتے کہ کتے والی بات ثابت ہوجائے کیونکہ پھر تو مٹھائی پھینک ہی دینا پڑے گی۔ سپاہی اس کے خلاف تھا، مگر اس کی بھی رائے بدل چکی تھی کہ نائب صاحب کا ملازم آگیا اور اس نے آہستہ سے کہا کہ خدمت گار نے مٹھائی کی دو ڈلیاں مجھ کو بھی دی ہیں۔ اب معاملہ صاف ہوگیا۔ مرزا صاحب سے کسی نے نہیں کہا۔ بہرحال لکھنؤ پہنچ

کر مٹھائی رات کو سرائے کی کوٹھری کے اندر قفل میں رکھی گئی اور رات ہی سے صبح کو کچہری کی تیاریاں شروع ہوئیں۔ منشی جی کسی اور کام سے بھیجے گئے اور خود مرزا صاحب مع نائب صاحب کے عدالت کو چلے۔ احتیاطاً خدمت گار علیہ ماعلیہ کو ساتھ لے لیا کہ مٹھائی اس کے دست برد سے بچی رہے۔ عدالت کے دروازے پر خدمت گار سے بستہ مانگا گیا تو معلوم ہوا کہ وہ کوٹھری ہی میں رکھا ہے۔ مٹھائی کی تباہی اور نیز لذت تینوں آدمیوں کی نگاہوں میں پھر گئی، مگر مرتا کیا نہ کرتا، وہی خدمت گار واپس بھیجا گیا، اور سخت حکم دیا گیا کہ الٹے پاؤں واپس آئے، مٹھائی کا خیال بار بار آیا، مگر مجبوری تھی۔ اب مرزا صاحب کی الجھن نہ پوچھیے بے چارے پریشان حال سراسیمہ ادھر ادھر ٹہل رہے ہیں۔

کیوں شیخ جی اگر پکار ہوگئی تو کیا ہوگا۔ مقدمہ تو خاک میں مل ہی چکا۔ غضب تو یہ ہے کہ جو کوئی سنے گا کیا کہے گا کہ گئے تھے مقدمہ لڑنے اور مِسل گھر ہی چھوڑ آئے۔ ہمارے مدمقابل وطن پہنچ کر کیا کیا ہنسی اڑائیں گے۔ قصے کو کیسا کیسا مشہور کریں گے، نمک حرامی کی انتہا کردی۔

اب گھر پہنچتے ہی اس مردود بے ایمان، مربی کش محسن سوز، مارآستین کو نکال ہی دیں گے اور بری طرح نکالیں گے۔ بھلا میں کہتا ہوں کہ دوسرے فریق سے مل تو نہیں گیا ہے اور جو مِسل سَرا میں بھی نہ ہوئی تو۔ یہ بڑا بے وقوف ہے اس کا اعتبار تو شاید دشمن بھی نہ کریں۔

شیخ جی: جی نہیں اتنے دنوں کا رہا سہا ہے ایسا تو کیا کرے گا، دیکھیے معلوم ہوا جاتا ہے۔ اگر پیشی کے وقت تک نہ آیا تو کوئی نہ کوئی ترکیب نکال ہی لی جائے گی آپ پریشان نہ ہوں۔

بڑے مرزا صاحب: پریشان کیسے نہ ہوں، سب کی کرائی محنت غارت غول ہوئی جارہی ہے۔ نقصان مایہ اور شماتت ہمسایہ اوپر سے خدا کرے ابھی پکار نہ ہو۔

مرزا صاحب یہ دعائیں مانگ ہی رہے تھے کہ قیامت کا صور پھنک گیا، ہرجا

فلاں بنام فلاں کوئی حاجر ہے۔ چہرے پر ہوائیاں چھوٹنے لگیں۔ کلیجہ بلیوں اچھلنے لگا، ہاتھ پاؤں برف ہوگئے، حواس یہ جا وہ جا۔ خدمت گار سے جا ملے۔

بڑے مرزا صاحب: اب کیا ہوگا شیخ جی۔

شیخ جی: چلیے تو عدالت سے عذر کریں گے۔

خدا نے خیر کی کہ وہاں پہنچتے ہی معلوم ہوا کہ تاریخ بڑھ گئی۔ جان میں جان آئی۔ باہر نکلے، کچھ خوش کچھ غصہ لمبے لمبے قدم رکھتے چلے کہ مسل کی خبر لیں۔ سرا کے پھاٹک پر نائب صاحب کا نوکر دکھائی دیا۔

بڑے مرزا صاحب: اور وہ کیوں نہیں آیا۔

نوکر: اس نے کہا کہ میرے پاؤں میں موچ آ گئی ہے۔ تم لے کر جاؤ۔

بڑے مرزا صاحب: شیخ جی مٹھائی کی خیر نہیں معلوم ہوتی۔

دور ہی سے کوٹھری کی کنڈی اتری ہوئی اور دروازہ۔ بھڑا ہوا دکھائی دیا۔ مرزا صاحب نے چال بدل دی اور دبے پاؤں چلنے لگے۔ دراڑ سے بھڑ کر ملاحظہ کیا۔ دیکھتے کیا ہیں کہ پلنگ پر رنگ برنگ کی مٹھائی کا چورا اور ٹکڑے بکھرے ہوئے بہار دکھا رہے ہیں۔ ٹوکری کا گریبان پہلے ہی سے تار تار ہو چکا ہے اور رقیب رو سیاہ کا منھ اور جیبیں پھولی ہوئی ہیں اور وہ پانچوں انگلیاں زمین پر رگڑ رگڑ کر صاف چادر پر موقع موقع سے کتے کے پاؤں بنا رہا ہے۔ دروازہ کھلا دھڑ سے چٹاخ چٹاخ، چٹ پٹ، دھم پٹ تڑ، بھلا بے اندھی رانڈ کے جنے، آج پکڑا گیا نا۔

○

نیک کام

مرزا صاحب کہنے لگے، لوگ اپنی نیکیاں نہیں بیان کرتے، ہم کو اپنے نیک کام کا ذکر کر کے لطف آتا ہے۔ اس کی کیا وجہ ہے؟ شاید یہ ہو کہ ہم اپنی چھوٹی چھوٹی برائیاں بھی کہہ گزرتے ہیں اور پیٹ میں کوئی اچھی بری بات رکھ نہیں سکتے، ممکن ہے یہ سبب ہو کہ جو لوگ بہت نیکیاں کرتے ہیں وہ کہاں تک یاد رکھیں گے اور ہم سے اگر کوئی اچھی بات ہوجاتی ہے تو وہ ہر وقت دماغ میں کھیلا کرتی ہے۔ جیسے وہ عورت جس کا ایک ہی بچہ ہو اور وہ چاہے کہ اس کا بچہ کسی وقت نگاہ سے اوجھل نہ ہو اگر کسی کے بہت سے ہوئے ممکن ہے کہ اس کے خیال سے بعض وقت کوئی بچہ اتر بھی جائے، یا یہ بات ہو کہ مذہب کی طرف سے ہم کچھ بے پرواہ سے ہیں اور اچھائیاں اور برائیاں جہنم کے خوف یا بہشت کی لالچ سے نہ کرتے ہوں، بلکہ زیادہ تر فطرت کے تقاضے سے کرتے ہوں اور بہشت دوزخ بجائے دوسری دنیا کے خود اپنے دل ہی میں پاتے ہوں بہرحال جو کچھ ہو، واقعہ سنیے ہم کو تھوڑی دیر کے لیے بھاڑ میں جھونکیے، میں بھی اس وقت یہی کوشش کر رہا ہوں گو مشکلیں پڑ رہی ہیں، اللہ کرے کامیاب ہوجاؤں۔

گرمیوں کا زمانہ ہے، پہاڑ کا مقام ہے، ہوٹل میں ہمارا کمرہ شاگرد پیشہ کے پاس ہے۔ ہوٹل کے فیشن ایبل مہمان اس طرف کا راستہ بھی نہیں چلتے، حالانکہ پہاڑ کی سنہری دھوپ کا لطف جیسا اس طرف ہے دوسری طرف خواب میں بھی نہیں دکھائی دیتا۔ پاس ہی نوکروں چاکروں کے لڑکے کھیل رہے ہیں۔ میلے، کچیلے، دبلے پتلے، بعض بیمار بھی ہوں گے، بعض کی صورتیں اچھی بھی ہیں، مگر گندے کپڑوں اور میلے چہروں میں ایسے چھپے ہیں کہ پتہ ہی نہیں چلتا۔ مگر سب خوش ہیں اور شور مچا رہے ہیں۔ ان کو دیکھ کر مفلسی، بیماری، غریبی کا خیال، اللہ میاں کے خزانے کی تازہ ہوا، اور جنت کے ایسے موسم کا مزا کرکرا کردیتا ہے۔ اسی لیے بڑے بڑے روشن خیال فلاسفر اور قومی خدمت

کرنے والے رفارمر جو ہوٹل میں ٹھہرتے ہیں، ادھر نہیں آتے ہیں۔ ان بچوں میں ایک لڑکی بھی ہے، کوئی آٹھ نو برس کی ہوگی۔ یہ کھیل میں کیوں نہیں شریک ہوتی؟ اے ہے، یہ تو ایک ہی ہاتھ کی ہے۔ دوسرے ہاتھ میں کوڑھ کا اثر معلوم ہوتا ہے ارے تیرے ہاتھ دیکھیں؟ نہیں کوڑھ نہیں ہے۔ جل گیا ہے یہ کیسے جلا؟

لڑکی: ہم کو نہیں معلوم، ہم بہت چھوٹے تھے، تب جلا تھا۔

میں: ارے اس زخم کی دوا نہیں کرتی ہے۔

ایک نوکر: جاتی تو ہے اسپتال مگر روز چھٹی کہاں پاوے۔

میں: کیوں اس کو کون کام ہے۔

نوکر: اس کو مالی نے اپنے لڑکے کے واسطے دو سو کی مول لیا تھا اس کی ساس بڑی حاکم ہے۔

میں: ارے اس کا بیاہ ہوگیا ہے؟

لڑکی ایک ذرا سا گھونگھٹ نکال لیتی ہے اور چہرے پر سے بچپن دور کر کے بیاہی عورت کی ذمہ داریاں لانے کی کوشش کرتی ہے۔

ناظرین تیار ہو جایئے قصے کا نچوڑ آ گیا۔ میں تصویر کھینچنے کی کوشش کرتا ہوں، آپ بھی موقلم لے کر بیٹھ جایئے۔ جہاں مجھ سے رنگ بھرتے نہ بنے، وہاں آپ میری مدد کیجیے گا اور اپنے لطافت خیال سے تصویر مکمل کیجیے گا۔ اتنا سمجھ لیجیے کہ ہندستانی لڑکی سرد ملکوں کی لڑکیوں سے پہلے نسوانیت کی ذمہ داریاں محسوس کرنے لگتی ہیں۔ یہ نکتہ مجھ کو سر آرتھر سائمن نے سروجنی نائیڈو کے حال بیان کرنے میں بتایا تھا۔

دوسری بات میں خود عرض کرتا ہوں۔ غریبی کی درس گاہ میں بچہ بہت جلد پڑھ لکھ کر فاضل ہو جاتا ہے۔ اگر اس کے ساتھ بیماری حیرانی بھی لگ گئی، جیسا کہ اکثر ہو جاتا ہے تو کیا کہنا، پھر تو زمانے کا گرم سرد ایسا سمجھنے لگتا ہے کہ ہم آپ جن پر مصیبت نہیں پڑتی ہے، کیا سمجھیں گے۔ آپ نے کسی چھوٹے بچے کو پیاس کے چنگے میں مبتلا نہیں دیکھا ہے، جتنی مصیبت وہ بے زبان اپنی آنکھوں سے کہہ گزرتا ہے، عاشق کی نگاہ کیا کہے گی۔

دوسرا نوکر: حضور یہ تو ہاتھ کی وجہ سے سو روپیہ کی بھی مہنگی تھی، نہ جانے مالی نے اس کو اتنے داموں پر کیوں لے لیا۔

اب لڑکی پر نہ بچپن کا الہڑپن پایا جاتا تھا، نہ بیاہی عورت کی ذمہ داری کا اثر، اس کا چہرہ ہر طرح کے تاثر سے بالکل خالی اور صاف ہوگیا اس طرح کے مباحثے اپنی بابت جب سے اس گھر میں آئی تھی ہمیشہ سنتے سنتے عادی ہوگئی تھی، اس لیے اس کے چہرے پر نہ غصہ تھا، نہ تعجب، نہ رنج، نہ شرم۔ ان سب کے بجائے میرے دماغ میں وہ چھوٹا سا گھوڑا پھر گیا جو بچپن میں میرے لیے ایک مرتبہ خریدا جارہا تھا اور لوگ اس کی بال بھونری دیکھ دیکھ کر اس کے دام لگا رہے تھے۔ جانور کو اس کی کیا خبر کہ اس کی تقدیر کا فیصلہ کیونکر ہوتا رہتا ہے۔ لیکن انسان کے بچے پر اگر سماجی ظلم ایسی مصیبت ڈھاتا ہے تو وہ سمجھے یا نہ سمجھے، مگر اس کا شعور باطن برچھی پر برچھی اور گھاؤ پر گھاؤ کھاتا رہتا ہے۔ لڑکی کے دلی جذبات کا حال اللہ جانے، مگر مجھ کو کسی نے ڈھکیل کر اس لڑکی کے قریب کردیا اور میرا ہاتھ بڑھا کر اس کی ٹھڈی میں لگا دیا۔ اس کے چہرے کو پیار سے دیکھنے کے لیے میری گردن کو ایک طرف جھکا دیا۔ مجھ کو نہیں معلوم جو الفاظ میری زبان سے نکلے وہ کس نے کہلائے۔ لیکن میرے کانوں نے سنا کہ میں کہہ رہا ہوں دو سو روپے! دو سو روپے تو بہت کم ہیں، ہم سے کوئی تین سو روپے ابھی لے لے!!

لیونارڈو۔ ڈا ونچی کی روح میری مدد کرو۔

چھوٹی سی مالن کے چہرے پر نئی بات سن کر پہلے تو تعجب ظاہر ہوا، اس کے بعد شکرگزاری کی جھلک دکھائی دی۔ پھر خوبصورتی کا احساس، دلآویزی کا ادعا، ناز و شوخی کی جھلک پیدا ہوئی پھر بن بندھے موتی کی آب اور عورت کی خودی نے چہرے کو بو قلموں بنا دیا۔ اے ہے پھر بھی تصویر ناقص رہ گئی۔ ان سب باتوں کے ساتھ بچپن کی خوشی بھی چہرے پر کھیلنے لگی۔ ہماری مالن اپنی کوٹھری کی طرف مسکراتی چلی جاتی تھی اور مجھ کو پھر پھر کر دیکھتی جاتی تھی اور میرا دل چاہتا تھا کہ اس بچی کے قدموں کے نیچے آنکھیں بچھاتا جاؤں۔

O

خوش مذاق کے اندھے

پیرجی مرحوم قصبے میں اس نام سے صرف اس وجہ سے مشہور تھے کہ ان کے خاندان میں کئی پشتیں اُدھر کوئی مقدس بزرگ گزرے تھے، ورنہ یہ خود بے چارے کبھی روحانیت کے دعویدار نہیں رہے، پڑھے لکھے شائستہ دیندار آدمی تھے۔ نماز پڑھتے تھے مگر احسان کسی پر نہیں رکھتے تھے، روزہ رکھتے تھے مگر یہ نہیں سمجھتے تھے کہ محلے بھر کو انھوں نے مول لے لیا ہے۔ لڑکے کو فارسی خود پڑھائی تھی۔ عربی کی تحصیل کے لیے شہر بھیج دیا تھا۔ صاحبزادے فضیلت کی پگڑی باندھ کر آئے۔ مگر وہ بھی کچھ ایسی اچھی طبیعت کے واقع ہوئے تھے کہ فضیلت کو پگڑی پر ترجیح دیتے تھے۔ اسی وجہ سے اس پگڑی کے کرتے بنوا ڈالے تھے اور معمولی ٹوپی استعمال کرنے لگے تھے۔ طبیعت نہایت سلجھی، مذاق نہایت ستھرا، علم کی رعونت چھو نہیں گئی تھی۔ شعر نہیں کہتے تھے مگر اصلاح دے دیتے تھے۔ مشاعرہ میں ضرور جاتے تھے، مگر ایسے کونے میں بیٹھتے تھے جہاں آواز پڑ جانے کا ڈر نہیں ہوتا۔ غریب کے پاس بیٹھ کر شرماتے نہیں تھے۔ امیر سے مل کر فخر نہیں کرتے تھے، ہاں اگر ہم مذاق کہیں سے نہ پاتے تو پھر اُدھر کا راستہ نہیں چلتے تھے۔
ان مولوی صاحب کا نام ابراہیم حسین تھا۔ ابراہیم حسین صاحب کی بدقسمتی سمجھیے یا اتفاق، ان سے جب کسی امیر آدمی سے ملاقات ہوئی تو کسی نہ کسی طرح ان کی غریبی کو بھی ٹھیس لگ ہی گئی۔ نتیجہ اس کا یہ ہوا کہ یہ امیروں کے طبقہ ہی سے گھبرانے لگے، علم اور دولت کا جوڑ اکثر مل جاتا ہے۔ غریبی میں علم حاصل کرنے کی وہ آسانیاں کہاں، اسی وجہ سے غریبی کے ساتھ جہالت، دولت کے ساتھ دوسرے عیوب مولوی ابراہیم صاحب کو اپنا ہم مذاق کم ہاتھ آتا تھا۔ غریب وطن میں غریب الوطنی کے مزے اٹھاتے تھے۔

اتنے میں پیرجی نے مولوی ابراہیم کی نسبت ٹھہرائی۔ پیرجی کی ایک بہن کسی کور دیہہ

میں بیاہی تھیں۔ اس خیال سے نسل نہ بگڑنے پائے انھیں کی لڑکی کے ساتھ شادی طے ہوئی۔

مولوی ابراہیم کے اشارے سے دو آدمیوں نے کہا بھی کہ آپ کے صاحبزادے پڑھے لکھے، شہر کے تعلیم پائے نہایت نفیس مزاج آدمی ہیں، ان کو جاہل بی بی سے کیا لطف ہوگا۔ مگر پیر جی نے ایک نہ سنی اور شادی کر ہی دی۔ مولوی ابراہیم کی بی بی آئیں، ٹھیٹھ دیہاتن، کئی دن تو شرم کے مارے دولہا سے بولیں نہیں۔ اس کے بعد بولیں بھی تو معلوم ہوا کہ نہ بولتیں تو اچھا تھا۔ مولوی صاحب کا دل چاہتا تھا کہ کچھ شوخی ہوتی، کچھ شرارت، کچھ اچپلاہٹ، کچھ ناز، کچھ غمزہ، کچھ کرشمہ، کچھ چٹکی، وہاں ہر بات کا ایک ہی جواب تھا، ''کا کچھ ہم پتریا ہون'' کبھی کبھی اسی مضمون کو دوسری طرح باندھتی تھیں ''ای سب پتریا جانیں، ہم کا جانٔن'' قصہ مختصر سائنس میں اگر جدت حرکت میں بدل جاتی ہے تو یہاں ہر چیز جمود کا جامہ پہن لیتی تھی۔

ہمارے شہر میں ایک پرانا قصہ مشہور ہے کہ کوئی شاعر تھے۔ انھوں نے رات کو ایک شعر کہا، جس کو سنانے کے لیے بے تاب ہوگئے۔ رات کے ایک بجے قدرداں نکتہ رس کہاں سے آتا۔ ناچار اپنی اہلیہ کو جگایا ان سے کہنے لگے کہ ایک شعر ہوا ہے۔ انھوں نے کہا کہ ہاں تو پھر کیا کریں، وہ کہنے لگے سنوگی، انھوں نے کہا سناؤ، شعر سن کر ذرا سا رکیں اس کے بعد کہنے لگیں سمجھاؤ، جوں جوں شاعر صاحب اس کے معنی بتاتے جاتے تھے، بی بی کے چہرے پر مختلف اثرات ظاہر ہوتے جاتے تھے۔ جب یہ سمجھا چکے تو بی بی کے چہرے پر سب سے زیادہ تعجب کا اثر نمایاں تھا۔ کہنے لگیں ''تم اتنا جھوٹ بولتے ہو، تمھاری بخشش بھی ہوگی۔''

مولوی ابراہیم کی پہلی بیوی بھی اسی طرح کی تھیں جن کے دکھوں انھوں نے دوسرا بیاہ کیا تھا۔ قہر درویش برجان درویش۔ مولوی ابراہم کے دوہی کام رہ گئے تھے، یا لڑکے پیدا کروانا یا اڑوس پڑوس کے جاہلوں میں بیٹھ کر انھیں کے مذاق کی باتیں کرنا، مولوی ابراہیم کی بی بی کو ایک شعر بھی منھ زبانی یاد تھا مگر وہ صرف گرمیوں کے دن میں آفتاب نکلنے سے پہلے نسیم صبح کے تقاضے سے کبھی کبھی پڑھ نکلتی تھیں

جب دم واپسیں ہو یا اللہ
لب پہ ہو لاالہ الا اللہ

زمانہ گزرتا گیا۔ بدمذاقی کی تکلیف کے گھٹنے مضبوط ہوتے گئے۔ قضائے کار ایک نوکری باہر سے آگئی اور مولوی ابراہیم صاحب ایک جگہ پڑھانے پر نوکر ہوگئے۔ جوئندہ یابندہ، وطن سے دور ایک مسماۃ سے عقد بھی کرلیا اور زندگی حسب دل خواہ گزرنے لگی۔ دوہی تین برس کے بعد گھر سے تار پہنچا کہ تمھاری بی بی نے انتقال کیا۔ موت پر افسوس سب ہی کرتے ہیں لیکن غور کیجیے تو اصل صاحب معاملہ جو دو آدمی تھے ان دونوں کی مصیبتیں کٹ گئی تھیں۔ رہے پیرجی، ان کا دل تو پوتی پوتوں میں بہلا رہا۔ دو چار سال کے بعد مولوی ابراہیم کی دوسری بی بی نے بھی انتقال کیا، حالانکہ پیٹ کی روٹیاں وہیں سے چلتی تھیں، مگر ؎

جھجکتی ہیں اٹھتے ہوئے سوئے گلشن
جن آنکھوں کے آگے نشیمن جلا ہے

پھر مولوی ابراہیم سے وہاں نہ ٹھہرا گیا اور نوکری چھوڑ کر آگئے۔ دنیا میں ہر شخص کے خیالات اور افعال پر نکتہ چینی ہوتی ہے، اس کے ہر فعل اور خیال کے مختلف معنی لگائے جاتے ہیں۔ کوئی کہتا ہے کہ اس میں یہ چال ہے، ورنہ وہ یہ نہ کہتا، کوئی کہتا ہے کہ اس میں یہ غرض اٹکی تھی ،ور نہ وہ کچھ اور کرتا۔ ایک محبت کرنے والی عورت ہی وہ نعمت ہے جو آدمی پر صرف نیک نیتی ہی سے یقین نہیں رکھتی، بلکہ اس کی خوبیوں کو اسی طرح سمجھتی ہے جیسے وہ خود سمجھتا ہے۔ ایک عورت کے دکھوں گھر چھوڑ کر پردیس کی راہ لی تھی، دوسری عورت کے دکھوں ہر پھر کر وہیں پہنچ گئے۔ گھر میں کیا رکھا تھا، جو یہاں جی لگتا۔ پہلے تو کچھ لوگ بچپن کے ساتھ کے کھیلے ہوئے محلے میں باقی تھے۔ اگر علمی مباحثے نہ تھے تو اڑوسیوں پڑوسیوں سے باتیں کرکے دل بہلا لیتے تھے۔ اب بہت سے مر چکے تھے، جو رہ گئے تھے وہ بھی سن زیادہ ہونے سے بدل گئے تھے۔ قصہ مختصر اصلی مولوی ابراہیم کو پہچاننے والا کوئی بھی نہ رہ گیا تھا۔ محلہ میں ایک رنڈی تھی، کوئی پچپن برس کا سن مولوی ابراہیم سے تقریباً پندرہ برس بڑی، مگر واہ رے تہذیب اس کو دیکھ کر

معلوم ہوتا تھا کہ واقعی ایسی ہی رنڈیاں ہوتی ہوں گی جن کے یہاں امیرزادے آداب مجلس سیکھنے کے لیے بھیجے جاتے رہے ہوں گے۔

پڑھی لکھی تو شدبد ہی ہوگی۔ مگر ہمیشہ شریفوں کی صحبت اٹھائی تھی۔ خوش مذاقوں کا کھلونا رہی تھی۔ خلوت کا حال جاننے والے تو سب ٹھکانے لگ چکے تھے۔ جلوت کے دیکھنے والے آج بھی شائستگی کی تصویر سامنے دیکھتے تھے۔ جب جی گھبراتا تھا، مولوی صاحب گھر سے نکل کر ڈہیں جا بیٹھتے تھے۔ رفتہ رفتہ یہ ہوا کہ جس کو کوئی غزل وغیرہ دکھانی ہوتی تھی سیدھا وہیں چلا جاتا تھا۔ پیرجی کو یہ باتیں کیسے پسند آتیں مگر چپ تھے۔ یہ ان لوگوں میں ہرگز نہ تھے جو ہر ایسے فعل پر کفر کا فتویٰ جاری کردیں، مگر تب بھی سن کے فرق کی وجہ سے جزبز رہتے تھے۔

بے چارے ستر برس کے آدمی تھے، دنیا ان سے سیر ہوچکی تھی۔ یہ دنیا سے سیر ہوچکے تھے، اپنے اردگرد والوں کو اس طرح دیکھتے تھے، جیسے کوئی باہر سے تماشا دیکھتا ہے۔ پھر بھی حواس باقی تھے اوراسی وجہ سے رائے بھی رکھتے تھے۔ ایک روز کوئی مولوی ابراہیم کو پوچھتا آگیا، پیر جی حقہ پی رہے تھے، کہنے لگے وہیں دیکھو گھر میں تو ہیں نہیں۔ وہ سلام کرکے جانے لگا۔ انھوں نے کہا کہ بیٹھ جاؤ، مولوی ابراہیم ہی کی باتیں کرنے لگے۔

پیرجی: جب سے نوکری چھوڑ کر گھر آئے ہیں نہ معلوم کیسی طبیعت ہوگئی ہے۔ گھر میں بیٹھتے ہی نہیں۔

وہ شخص: گھر میں ہے ہی کون، بیٹھیں تو کس کے پاس بیٹھیں؟

پیرجی: لڑکے تو ہیں، اگر میرے پاس ان کا دل نہیں لگتا تو بچوں ہی کا تماشہ دیکھتے، میں تو کہتا تھا کہ پھر سے شادی کرلیں، مگر نہ راضی ہوئے۔

وہ شخص: ہاں یہ کرلیتے تو اچھا تھا۔ مگرآپ جانتے ہیں کیسے نفیس مزاج ہیں۔ اگر طبیعت کے موافق بی بی نہ ملی تو زندگی بھر کوفت ہوجائے گی۔

پیرجی: اچھی کوفت ہوجائے گی اور یہ جو ہورہا ہے یہ کیا اچھا ہے۔

وہ شخص : اچھا کون کہہ سکتا ہے مگر یہ تو ہے کہ ان کے دل کی بات سمجھنے والا کوئی ہے۔ یہی چیز ہے جو دنیا کو جنت بنا دیتی ہے۔

پیرجی : ارے بابا جنت کے لیے حور بھی ضروری ہے۔ یہ کونسی حور ہے جو ان سے بھی بڑی ہے، نہ منہ میں دانت نہ پیٹ میں آنت۔

وہ شخص : ہاں سن کا جوڑ تو نہیں ہے لیکن اگر ان کو پسند ہے تو ٹھیک ہے۔

پیرجی: ہم سنی بھی آخر کوئی چیز ہے کہ نہیں، جب میں نے دیکھا کہ اس طرف (رنڈی کے گھر کی طرف اشارہ کرکے) زیادہ جاتے ہیں تو میں نے خیال کیا کہ وہاں کون سی دلچسپی ہوسکتی ہے۔ عقل نے کہا، اس کے یہاں وہی جو ایک کالی کالی لونڈیا رہتی ہے نا، اسی خیال میں چکر لگاتے ہوں گے۔

ہم سے واسطہ تم جانتے ہوگے یہ لونڈیا اس رنڈی نے پالی تھی کہ اس کو ناچ گانا سکھائے گی۔ مگر وہ ایسی کوڑھ نکلی کہ اس کو کچھ آیا ہی نہیں مجبوراً استاد وغیرہ چھڑا دیے اور ماما گیری کروانے لگی۔

اگر ابراہیم اس سے لگاسگا کر لیتے تو صورت شکل نہ سہی سن کے دیکھتے ایک بات تھی، مگر یہ راز تو اب کھلا کہ اس سے کوئی لگاؤ نہیں، بلکہ اپنی دادی جان پر ریجھے ہیں۔

O

رقابت

مرزا صاحب واللہ آپ کی نثر میں وہ لطف ہے کہ کسی نظم میں کیا ہوگا۔ آپ کی باتوں میں قصیدہ کی شان، تغزل کی آن، نعمت خاں عالی کی نغزگوئی ہر چیز کا مزہ ہے اور پھر کوئی نہ کوئی نئی بات نیا خیال ضرور معلوم ہو جاتا ہے۔

مرزا صاحب: بھئی خدا کے لیے میری باتوں کی تعریف نہ کرو جہاں کسی نے اس کا ذکر کیا میں لرز جاتا ہوں مجھے اختلاج ہونے لگتا ہے۔ آپ جانتے ہیں میرے پیٹ میں بات تو رہتی نہیں اب ذکر آ گیا ہے تو یہ واقعہ بھی سن لیجیے۔ 1975 کا ہے، یہاں ایک بات عرض کروں۔ حضرت اپنی تاریخ دانی کو تھوڑی دیر کے لیے تہہ کر کے رکھ دیں اور وعدہ کریں کہ جرح نہ کریں گے نہیں تو میں چپ ہوں اس میں چاہے میرا پیٹ پھٹ جائے یا دماغ کی کوئی رگ خون ہی کیوں نہ دے دے۔

احباب: نہیں نہیں، ہم لوگ کچھ نہ کہیں گے آپ کہے جائیے۔

مرزا صاحب: ایک بات اور آپ حضرات کو معلوم ہے کہ فن مصوری میں استاد لوگ درخت اور باغ کہیں سے عمارت کہیں سے بادل کسی اور ملک سے لے کر تصویر مکمل کرتے ہیں۔ اگر اسی طرح میں بھی گاؤں، ٹھاؤں، ناؤں اور زمانہ بدل دوں تو اعتراض نہ کیجیے گا۔

احباب: ہم کو شرائط قبول ہیں، آپ قصہ تو شروع کیجیے۔

مرزا صاحب: لگے ہاتھوں اتنا اور کہے دیتا ہوں کہ بعد کو یہ نہ کہیے گا کہ یار یہ تو آپ بیتی معلوم ہوتی ہے۔ حافظ کے دیوان سے لوگ فال نکالتے ہیں جس میں ہر شخص کو آپ بیتی مل جاتی ہے۔ مگر آپ بھی جانتے ہیں اور میں بھی

کہ تمام فال کھولنے والوں کا پتہ بھی حافظ کو نہ تھا۔ اسی طرح اگر میری گزارش میں کوئی بات فطرت کے موافق نکل آئے تو ممکن ہے کہ مجھ پر گذری ہو، ممکن ہے ہم آپ دونوں پر گذر چکی ہو یا آئندہ گذرے۔ خیر ہم پر اب کیا گزرے گی آپ لوگوں پر گزرے۔

احباب: ہاں ہاں منظور۔

مرزا صاحب: اچھا تو سنیے ساٹھ اکسٹھ برس ہوئے اس زمانے میں ہندستانی صرف پہاڑ کا نام سنتے تھے مگر جاتے کم تھے اور اس زمانے میں جانا بھی ہمت والوں ہی کا کام تھا۔ کہیں تانگا کہیں گھوڑا کہیں پیدل کا سفر، پھر بیچ میں پہاڑ، اگر گر پڑا تو میاں معہ نوکروں اور اسباب کے ایک طرف اور بی بی دوسری طرف کھڑے چکوے چکوری کی طرح ایک دوسرے کو دیکھ رہے ہیں نہ یہ اُدھر پہنچ سکتے ہیں نہ وہ اِدھر۔ یہ اکثر ہوا کرتا تھا اور اس میں دو دو دن لگ جاتے تھے۔ ہم کو جو شامت نے گھیرا تو ہم بھی شملہ پہنچ گئے۔

ایک بہت بڑی رئیس زادی سے کسی دعوت میں ملاقات ہوگئی اور اپنی نیک دلی سے وہ میرے اوپر بالکل بے غرض عنایت فرمانے لگیں۔ نہایت خوبصورت، بڑی بھولی اور پوری طرح سے تندرست مگر بدقسمتی سے پیش از وقت رانڈ اس جہاز کی طرح زندگی پار کررہی تھیں جس کا پتوار ٹوٹ گیا ہو اور ٹوٹنے کے پہلے بھی بہت پرانا رہا ہو۔ سن کا ذکر کرتے کلیجہ پھٹتا ہے، بس یہ سمجھ لیجیے کہ اس وقت بیاہی گئی تھیں جب شادی کا مطلب نہیں سمجھتی تھیں، اور رانڈ ہوکر غریب کی سمجھ میں نہیں آیا ہوگا کہ قانوناً اور رواجاً اب عمر بھر کے لیے ان تمام چیزوں سے محروم ہوگئے جو ہر عورت کا حق ہے بدقسمتی کا خاتمہ رنڈاپے ہی پر نہ سمجھیے، بلکہ تمام باتیں وہ پیش آئیں جو رنڈاپے کے جلو میں چلتی ہیں۔ مقدمہ بازی، بے یاری و مددگاری، خودغرض ہمدرد، مُسِن عشاق اور گندم نما جو فروش دکاندار جو کھوٹے پیسے کا دل دے کر جواہرات کا سودا کرنے پر تلے رہتے ہیں۔

رئیس زادی: مرزا صاحب، اس دعوت کے بعد سے پھر ملاقات ہی نہیں ہوئی، آپ کی کوٹھی کا نام بھی مجھ کو نہیں معلوم تھا نہیں تو فون پر آپ کو تکلیف دیتی۔ اچھا کل اگر آپ لنچ پر تکلیف کریں تو بڑی عنایت ہوگی۔

میں: بہت خوب حاضر ہوں گا۔ شکریے کی پہلی قسط قبول کیجیے اور اقساط بعد کو ادا کروں گا۔

رئیس زادی: ہنس کر مرزا صاحب آپ باتیں خوب کرتے ہیں۔ اس دن میں آپ کے فقروں کو یاد کر کے گھر پر ہنسا کی۔ اچھا کل ضرور تشریف لائیے گا۔

رئیس زادی صاحبہ میرے اوپر بہت مہربان ہوگئیں اور چونکہ میں بالکل بے غرض اور بے واسطہ ملتا تھا اس لیے باتیں کرنے میں آمد ہی آمد ہوتی تھی آورد کی ضرورت ہی نہیں پڑتی تھی۔ اب پینگیں اتنی بڑھیں کہ لنچ پر بُلایا تو چائے کے لیے بھی روک لیا اور اگر چائے پر ملاقات ہوئی تو سنیما تک ساتھ رہا۔ جوان خوبصورت قابل رحم مستوجِب ہمدردی اور پھر عورت کا ساتھ کس کو برا لگتا ہے۔ ایسی صحبتوں میں مجھ کو بھی لطف آتا تھا، مگر تنہائی میں ملنے کا اتفاق ہوا نہ تنہائی کا موقع نکالنے کا کبھی دل میں خیال گزرا۔ رئیس زادی تو میرے اوپر عنایت کرتی ہی تھیں۔ مگر ایک کارکن صاحب جو رئیس زادی صاحبہ کے یہاں رہتے تھے۔ وہ بھی بڑی عنایت کرتے تھے۔ بے چارے بچھے جاتے تھے۔ میری بزرگ داشت کا خیال اتنا کرتے تھے جیسے کسی کی اولاد کرتی ہے مثلاً اگر میں نے سگریٹ کو ہاتھ لگایا تو انھوں نے دوڑ کر دیا سلائی جلا دی۔

میں: آپ نے کیوں تکلیف کی اتنی دور سے اٹھ کر آپ آئے، دیا سلائی تو میرے پاس تھی۔

وہ صاحب: جی ہاں میرا تو فرض تھا۔ بزرگوں کی خدمت کرنا خوردوں کے لیے باعث فخر ہے۔ جہاں میں پہنچا اور ان صاحب نے کرسی اٹھا کر میرے لیے رکھ دی۔ اگر میں نے شکریہ ادا کیا تو جواباً بولے نہیں صاحب بزرگوں کی خدمت چھوٹوں کو کرنا ہی چاہیے۔ میں اپنی جگہ شرمندہ ہوتا تھا

کہ میں اتنا بڑا شخص نہیں ہوں کہ یہ صاحب میری اتنی خاطر کریں۔ شاید یہ مجھ کو کوئی بڑا دولت مند جانتے ہوں گے۔ پہاڑ کی چڑھائی سب جانتے ہیں کہ چار قدم میں سانس پھولنے لگتی ہے اور اگر تیز چلے تو سو دو سو گز میں معلوم ہوتا ہے کہ کلیجہ منہ میں آجائے گا۔ پہاڑ کی ہوا بھی معلوم ہے کہ ایک منٹ ٹھہر جاؤ اور پھر تازہ دم ہوگئے۔ ایک دن میں مدعو تھا، اور یہ خیال کرکے کہ شاید دیر میں پہنچوں، ذرا تیز چلا اور جب پہنچا تو ہانپ رہا تھا۔ رئیس زادی نے اپنی صاف دلی کی وجہ سے مجھ کو ہاتھوں ہاتھ لیا اور خاطر سے بٹھایا۔

میں: افوہ بیگم صاحب آپ کے یہاں آنے میں یہ آخری چڑھائی بڑی زبردست ہے۔

کارکن صاحب: ہاں ں ہنہ ہنہ (چڑھائی! چڑھائی تو ایسی نہیں ہے اور پھر پہاڑ تو ہے ہی۔ ایسی چڑھائی تو کیا ہے اب ضعیفی کا عالم بھی تو ہے۔ عالم پیری میں پہنچ کر ایسا ہی ہوتا ہے) چلیے ذری دیر آرام کرلیجیے۔

میں نے شکریہ کے انداز سے جی نہیں تو کہا، مگر دل میں یہ بھی خیال کیا کہ میں اتنا بوڑھا تو ابھی نہیں ہوں جتنی کارکن صاحب کی سعادت مندی ظاہر کرتی ہے۔

ظاہراً بات ہمدردی کی تھی، حالانکہ پیش از وقت بڑھاپا اور موت کی قربت کس کو پسند ہوگی، مگر ان سب سے بالاتر عبرت کی تو یہ بات تھی کہ باوجود ادعائے حاضر جوابی کے مجھ کو کوئی مناسب جواب بھی نہیں سوجھتا تھا اتنے میں رئیس زادی کی گھلاوٹ کی نگاہ میں نے دیکھ لی، جو کارکن صاحب پر پڑ رہی تھی اور کارکن صاحب کی بھی وہ نگاہ دیکھ لی جو شکوے کا پہلو لیے ہوئے جواب میں تھی۔

تب میں سمجھا کہ میرے پیش از وقت ضعیف نحیف اور نزار ہوجانے کی کیا وجہ ہے اور کارکن صاحب کی بزرگ نوازی کن بدگمانیوں کی تحت میں کارفرما ہے۔

O

بیوی کیسی ہونا چاہیے

مجھ سے سوال کیا گیا کہ بی بی کیسی ہونا چاہیے، میں کہتا ہوں کہ کوئی بُری بی بی مجھ کو دکھادے تو میں اس سوال کا جواب دوں۔ میرے خیال میں بی بی خدا کی نعمت ہے اور خدا کی نعمت کبھی بُری نہیں ہوتی۔ بیوی کی وجہ سے گھر میں روشنی سی پھیلی رہتی ہے۔ چراغ کے نیچے ذرا سا اندھیرا بھی ہوتا ہے جیسا کہ میں ایک مرتبہ پہلے بھی کہہ چکا ہوں، اگر کوئی نادان مرد ذری سی تاریکی سے گھبراکر چراغ کی شکایت کرے تو اندھیر ہی تو ہے۔ میں اس کا بھی دعوے دار ہوں کہ میں نے آج تک کوئی بدصورت عورت بھی نہیں دیکھی۔ آنکھیں رکھتا ہوں اور دنیا دیکھی ہے، اگر کہیں ہوتی تو آخر میں نہ دیکھتا۔

اس کا ثبوت یہ بھی ہے کہ بدصورت سے بدصورت جو کہی جاسکتی ہے اس کا بھی چاہنے والا کوئی نہ کوئی نکل آتا ہے۔ پھر اگر وہ بدصورت تھی تو یہ پرستش کرنے والا کہاں سے پیدا ہوگیا۔ اس لیلیٰ کا مجنوں کہاں سے آگیا، نہیں صاحب عورت بدصورت نہیں ہوتی یہ میرا ایمان ہے اور یہی ایمان ہر شخص کا ہونا چاہیے۔ اصل وجہ یہ ہے کہ عورت میں عمدہ ترشے ہوئے ہیرے کی طرح ہزاروں پہل ہوتے ہیں اور ہر پہل میں آفتاب ایک نئے رنگ سے مہمان ہوتا ہے۔ یہ ممکن ہے کہ کوئی پہل کسی (خاص شخص) کی آنکھ میں ضرورت سے زیادہ چکاچوندھ پیدا کردے، اور وہ پسند نہ کرے تو اس سے بی بی کی برائی کہاں سے ثابت ہوئی۔

ایک پرانے یونانی ڈرامہ نویس نے لکھا ہے کہ پہلے مرد اور عورتیں اس طرح ہوتے تھے کہ دونوں کی پیٹھ ایک دوسرے سے جڑی ہوتی تھی اور یہ لوگ راستہ اس طرح چلتے تھے کہ پہلے چاروں ہاتھ زمین پر لگے اور دونوں سر نیچے آگئے۔ اور چاروں

پاؤں سر کی جگہ ہوا میں رہے۔ اس طرح کے بعد پلٹا کھایا اور چاروں پاؤں کے بل کھڑے ہوگئے اور اس طرح آگے بڑھتے گئے۔ ظاہر بات ہے کہ ایسی حالت میں یہ لوگ راستہ بہت تیز چلتے تھے اور چونکہ دو دو آدمی ملے ہوئے تھے اس لیے ان کی قوتیں بھی دوگنی تھیں۔ دیوتاؤں نے ان کی شورہ پشتی کی وجہ سے مشورہ کیا کہ کیا کرنا چاہیے، آخرکار یہ صلاح ٹھہری کہ یہ بیچ سے علیحدہ کردیے جائیں تاکہ ان کی قوتیں آدھی رہ جائیں اور ان کے چڑھاوے دوگنے ہوجائیں۔ چنانچہ ایسا ہی کیا گیا تب سے ہر عورت اور ہر مرد اپنا اپنا جوڑا ڈھونڈھتے پھرتے ہیں، جن کو مل جاتا ہے وہ خوش رہتے ہیں، جن کو بدقسمتی سے نہ ملا وہ غریب عورت کو دکھ دیتے ہیں کسی کو بے زبان نموہی بیوی پسند ہے، کسی کو ایسی عورت اچھی لگتی ہے جس کی زبان ہر وقت کترنی کی طرح چلتی رہے، اگر خوش قسمتی سے وہی قدیم جوڑا مل گیا تو دونوں خوش ہیں، نہیں تو بی بی غریب کو برا کہتے ہیں، آخر اس غریب کا جوڑا بھی تو بچھڑ گیا ہے مگر اس کی کوئی بات بھی نہیں پوچھتا۔ یہ خیال غلط ہے کہ صرف اچھوں ہی اچھے کا ساتھ مزے دار ہوتا ہے اگر تال میل ہوا اور پرگت مل گئی تو جن لوگوں کو ہم اپنے زعم ناقص میں برا سمجھتے ہیں ان کی بھی زندگی لطف کی گزرتی ہے۔ آپ نے سنا نہیں ؎

خدا کے فضل سے اترا تھا کیا ہی عرش سے جوڑا
نہ مجھ سا کوئی گرگا ہو نہ تم سی کوئی شفتل ہو

ہمارے پڑوس میں ایک میاں بی بی رہتے ہیں جن کا جوڑا پوری طور سے مل گیا ہے۔ یہ دونوں آدمی انتہا درجے کے کاہل، پرلے سرے کے جھوٹے اور حد کے نکارے ہیں، مگر جب دیکھیے دونوں قمریوں کی طرح ایک دوسرے کے ساتھ ہیں اور گل بہیاں ڈالے بیٹھے ہیں۔ ان کے دو بچے ہیں، کسی نے ان بچوں کا دھویا ہوا منھ کبھی نہیں دیکھا۔ کپڑے ان لوگوں کے تن پر سے کٹ کے گر جاتے ہیں مگر دھوبی کو دینے کی توفیق نہیں ہوتی۔ بچوں کے کپڑوں میں ذرا سی پھونک بڑھ کے نیچے سے اوپر تک پہنچ جاتی اور پھٹ کر علیحدہ ہوجاتی ہے مگر سوئی تاگے کی شرمندہ نہیں ہوتی۔ میں نے ایک دن اس عورت سے پوچھا کہ تمھارے میاں تم کو چاہتے ہیں، کہنے لگی کہ اتنا چاہتے ہیں

کہ کھانا لیے بیٹھے رہتے ہیں، مگر بغیر میرے نہیں کھاتے۔ دوسری مثال محبت کی دی کہ کل صبح بٹیر کے شکار کو جارہے تھے، میں نے کہا روز جاتے ہو مگر کبھی ایک پر بھی گھر میں نہ آیا۔ بس غصے میں ایک ڈنڈا میری پیٹھ پر رسید کیا، میں بھی دوپہر تک منھ پھلائے رہی اور نہیں بولی۔ تب دوڑے گئے، تیل کی جلیبیاں لے آئے، تب میں بولی، کبھی برابر کے جوڑ میں لطف آتا ہے، کبھی ایک نرم اور ایک گرم، زندگی کو آرام دہ بنا دیتے ہیں۔

کسی رانڈ بیوہ کے یہاں ایک طوطا پلا تھا۔ وہ ہر وقت اس عورت کو مغلظات سنایا کرتا تھا۔ ایک دن ان کے یہاں ایک پیر صاحب تشریف لائے طوطے کو سن کر کہنے لگے، ارے تیرا طوطا بڑا فحاش ہے، پنجرا کھول دے یہ اڑ جائے، کہنے لگی، رہنے دیجیے میاں صاحب گھر میں مردوے کی ایسی بولی تو سنائی دیتی ہے۔

کوئی شخص شراب بہت پیتا تھا۔ اس نے پادری کے کہنے سے شراب ترک کردی کچھ دنوں کے بعد پادری صاحب اپنے پند و نصائح پر ناز کرتے ہوئے گھر میں داخل ہوئے اور پوچھا کہ کہو اب تمھارے میاں ماردھاڑ دنگا فساد تو نہیں کرتے، نہایت مایوسی سے کہنے لگی، ارے حضور اب تو وہ میاں ایسے معلوم ہی نہیں ہوتے، کوئی دیکھے تو کہے مہمان طریق گھر میں آئے ہیں۔

چارلس ڈکنس نے ایک شخص سائکس اِے کا حال لکھا ہے کہ وہ بھی اپنی نیک شریف خصلت، محنتی، چاہنے والی بیوی کو نہ صرف مارتا ہی تھا بلکہ جو کچھ محنت مزدوری کرکے وہ کما لاتی تھی وہ بھی شراب میں اڑا دیتا تھا اور خود اس میں دنیا کا کوئی عیب نہ تھا جو نہ ہو۔ چور پرلے سرے کا تھا، ایک ہمدرد نے اس عورت کو مشورہ دیا کہ اس کو چھوڑ دے، اس نے کہا کہ افسوس ہے دنیا اس کی برائی سے واقف ہے، خوبی سے نہیں واقف۔ اب ان باتوں کے بعد کوئی کیا کہہ سکتا ہے کہ کون مرد اچھا ہے اور کون عورت۔

میرے ایک دوست ایک ڈپٹی صاحب کا حال بیان کرتے ہیں کہ وہ دورے پر تھے اور میں ان سے ملنے گیا۔ معلوم ہوا کہ ڈپٹی صاحب غسل فرما رہے ہیں۔ یہ بیٹھے

رہے، جب دیر ہوئی تو انھوں نے پھر دریافت کیا معلوم ہوا ابھی تک غسل میں ہیں۔ سرکاری کام تھا جس کے ناتمام رہ جانے میں دونوں کی بدنامی تھی اس وجہ سے سنگ آمد سخت آمد انتظار کرتے رہے۔ مگر ڈپٹی صاحب آج نکلنے کا نام لیتے ہیں نہ کل۔ ان کی آنتیں قل ہو اللہ پڑھ رہی ہیں، مگر ان کی برآمدگی کی کوئی صورت نہیں دکھائی دیتی۔ خیر کئی گھنٹوں کے بعد طلبی ہوئی تو یہ کیا دیکھتے ہیں کہ ڈپٹی صاحب دفتر کی میز کے پاس کرسی پر بڑی شان سے تشریف فرما ہیں۔ مسلوں کا ڈھیر لگا ہے مگر خالی پتلون اور کھڑاؤں پہنے بیٹھے ہیں۔ کاندھوں پر پتلون کی گیلس البتہ دکھائی دیتی ہے۔ کام پورا کرکے جب یہ باہر نکلے، نہ تاب ہوئی اردلی سے انوکھی وضع کا سبب پوچھ ہی بیٹھے۔ معلوم ہوا بیگم کو کسی بات پر غصہ آگیا ہے۔ انھوں نے حکم دیا کہ آج اس مونڈی کاٹے کو کپڑے نہ دیے جائیں۔ خیال تو کیجیے جاڑوں کا مہینہ خیمہ کی زندگی لیکن اگر ڈپٹی صاحب کو یہ باتیں پسند ہیں تو ہم آپ برا ماننے والے کون۔

پیٹر پنڈر نے لکھا ہے کہ اسکاٹ لینڈ میں میں نے ایک شخص کو دیکھا کہ اپنی بی بی کو مارتا ہے، مجھے ایسا جوش پیدا ہوا کہ میں گھر میں گھس گیا اور اس عورت کو بچانے لگا، میرا یہ کرنا تھا کہ دونوں میرے اوپر پلٹ پڑے اور مجھ کو مار کے باہر کردیا۔ لیجیے صاحب ہم تم راضی تو کیا کریں قاضی، غالب نے کہا ہے ؎

کبھی جو یاد بھی آتا ہوں تو وہ کہتے ہیں
کہ آج بزم میں کچھ فتنہ و فساد نہیں

کیوں صاحب اگر کسی کو فتنہ و فساد ہی والا شریک زندگی پسند ہو تو ہماری آپ کی پسندیدگی ناپسندیدگی کیا چیز ہے اور کون کہہ سکتا ہے کہ یہ بی بی اچھی اور یہ بُری ہے۔ اکثروں کو آس پاس کے گھروں سے اس طرح کی باتیں سننے کا اتفاق ہوا ہوگا کہ ارے یہ ہاتھ تھکیں، الٰہی تن تن کوڑھ ٹپکے، بچ مچاتی کھاٹ نکلے، تب میرے دل میں ٹھنڈک پڑے۔ اڑوسی پڑوسی ادھر ادھر کھڑے نفرین کر رہے ہیں کہ بھئی کیا بُرے لوگ ہیں۔ کیا کتے بلی کی زندگی بسر کر رہے ہیں لیجیے صاحب شور و شغب مٹ گیا۔ میاں نکل کر اپنے کام پر چلے گئے، بی ہمسائی کچھ تو ہمدردی کرنے کے خیال سے اور زیادہ تر ٹوہ لینے کو

کھڑکی کی طرف سے اندر داخل ہوئیں۔ دیکھا کہ اک طرف کا گال سوجا ہوا ہے آنکھوں کی لالی باوجود منھ دھونے کے ابھی مٹی نہیں ہے۔ حال تو سب پہلے ہی سے جانتی تھیں، مگر انجان بن کر پوچھنے لگی۔ اے بہن یہ کیا ہوا، جواب ملا بہن کیا کہیں، آپ ہی لڑے، آپ ہی خفا ہوکر چلے گئے، کھانا بھی نہیں کھایا، یہ دیکھو ویسے ہی رکھا ہے، پان کی ڈبیا بھی نہیں لے گئے، دل کڑھتا ہے کہ دن بھر بن پان کے رہیں گے، منھ صابن ہوجائے گا۔ لیجیے صاحب یہ تو گئی تھیں کہ وہ میاں کی اگر ایک برائی کریں گی تو ہم دس کریں گے۔ وہاں رنگ ہی دوسرا دیکھا۔ اپنا سا منھ لے کر چلی آئیں۔

ایک دوسرے مرحوم دوست کہا کرتے تھے کہ بی بی کے ناز و انداز ہر طرح کے اٹھائے جاسکتے ہیں، لیکن ایک بات ناقابل معافی ہے، وہ یہ کہ یہ لوگ کبھی کبھی مرجاتی ہیں۔ اسی کے مقابل یہ دوسرا لطیفہ سنیے۔

ایک صاحب نے بیان کیا کہ میری بی بی دو ہی برس کے اندر داغ مفارقت دے گئیں۔ ذرا سا لڑکا ایک پھوسڑا اپنی نشانی چھوڑ گئیں۔ میری ایک بڑی سالی تھیں جو شاید اسی انتظار میں پہلے ہی سے رنڈاپا کھے رہی تھیں۔ خوش دامن صاحبہ کہنے لگیں، میاں تمھاری سالی موجود ہے اگر عقد کرلیتے تو مردہ رشتہ پھر زندہ ہوجاتا۔ میں نے بھی سوچا کہ جب وہ جوان جہاں نہ رہی تو یہ ادھیڑ کیا رہے گی، لاؤ کر بھی لو۔ لڑکے کی خالہ ہے، بچہ بھی پل جائے گا، جہیز بھی اچھا خاصا ہاتھ لگے گا۔ ان کے مرنے کے بعد انشاء اللہ تعالیٰ اپنی ہم سن ڈھونڈھ کر کرلیں گے۔

لیجیے صاحب عقد ہونے کو تو ہوگیا مگر وہ آج مرتی ہیں نہ کل۔ وہ تو پہلے ہی سے بوڑھی تھیں، میرے بھی دانت گر گئے، مگر وہ جانے کا نام ہی نہیں لیتیں۔ ادھر میں کہیں سفر کو تیار ہوا اور ادھر وہ امام ضامن لیے ڈیوڑھی کے پاس پہنچ گئیں۔

امام ضامن کی ضمانت میں سونپا کہو قبول کیا۔ جس طرح پیٹھ دکھاتے جاتے ہو اسی طرح اصل خیر سے واپس آکر منھ دکھانا نصیب ہو۔

ان صاحب کا بیان ہے کہ بڑی بی بی کے مرنے سے تو مایوسی ہو ہی چکی ہے۔

میں نے یہ وطیرہ اختیار کیا ہے کہ ادھر انھوں نے امام ضامن باندھا، ادھر میں نے بھی ایک چیتھڑا لے کر ان کے داہنے بازو پر باندھ دیا اور کہنا شروع کیا۔ خدا تمھارے سائے میں ہمیں پروان چڑھائے۔'' وہ پوپلا منھ بٹوا سا لے کر ہنسنے لگیں، ہٹو بھی تمھاری مذاخ .... کی باتیں کبھی نہ جائیں گی۔

اب ذرا غور فرمایئے۔ اگر ان صاحب کو کہیں ہم نے صلاح دی ہوتی کہ بڑی سالی سے کرلو تو خدا واسطے کو، ہم ہی تو بدنام ہوتے۔ نہیں صاحب اس معاملے میں یہی ٹھیک ہے کہ اپنی اپنی ڈفلی اور اپنا اپنا راگ۔

مذاقِ عشق یہ ہے نکتہ چیں نہ بن ناصح
نگاہ میری، پرکھ میری، آنکھ میری ہے

جنھیں نظر نہیں اے آرزو وہ کیا جانیں
خزف سمیٹے ہیں یا موتیوں کی ڈھیری ہے؟

○

''.. ..... آج تک جب کبھی نماز پڑھی تھی تو رکعتیں ہی گِنا کیا تھا کہ اب ایک ختم ہوئی اور اب دوسری ختم ہوئی، مگر حرم محترم میں پہنچ کر نمازیں پڑھنے میں لطف آگیا۔ آپ سے وہ مزہ کیسے بیان کروں، اگر آپ جانتے ہیں تو جانتے ہیں اور اگر نہیں جانتے تو کیسے سمجھاؤں۔ بس یہ سمجھ لیجیے کہ

پڑ گیا لُوٹ میں سرکار کا مہماں بن کر

(''میرا مذہب'')

گدھی کی ہتّیا

جھمن تنبولی کی پان کی دکان سب دکانوں سے بڑی تھی۔ دیساور سے پان منگواتے، دریبے میں بھی ہر شخص کی نگاہ جھمن پر پڑتی تھی۔ مکان بھی پکا تھا، جو عزت برادری میں جھمن کی تھی، دور دور کسی تنبولی کی نہ تھی۔ لڑکا کچھ شدبد پڑھ بھی گیا تھا، لڑکی اچھے گھر بیاہی بھی گئی تھی۔ بیوی سر سے پاؤں تک چاندی کے زیور سے لدی ہوئی تھی، سونے کے بھی دو ایک عدد تھوڑے دن ہوئے بنوائے تھے جس سے برادری کی نگاہ میں ان کی آبرو اور بھی بڑھ گئی تھی۔ اگر کمی تھی تو صرف یہ کہ خود ان کے کوئی پنواڑی نہ تھی۔ حالانکہ کوئی زیادہ ایسا ہرج نہ تھا پھر بھی اگر اپنی پنواڑی لگ جاتی تو اچھا تھا۔ برادری میں اور وقعت بڑھ جاتی۔ کچھ تو اس وجہ سے کہ لڑکا لاڈوں کا پلا ہوا، اس پر کام کا بوجھ نہیں ڈالتے تھے۔ دوسرے یہ خیال تھا کہ اگر زمیندار سے زمین مانگیں گے تو کسی غریب ٹٹ پونجیئے کے مقابلے میں ان سے زیادہ لگان مانگا جائے گا اور پھر اٹکا بنیا سودا کرے، پان ادھار بھی دینا پڑیں گے۔ ادھار دینے میں کوئی ہرج نہیں مگر وقت پر روپیہ نہیں مل سکتا۔ انھیں وجوہ سے پنواڑی گومگو میں پڑی رہی۔ خدا کا کرنا ایسا کہ ایک دن خود زمیندار نے کہا ارے جھمن تم پنواڑی کیوں نہیں لگاتے۔ جھمن بولے سرکار کا حکم ہو تو لگ جائے کون مشکل ہے۔ یہ باتیں لڑکے نے سنیں، گھر جاکر اپنے باپ سے تقاضا شروع کردیا۔ جھمن کی ہمت نہیں پڑتی تھی، مگر لڑکے نے ماں سے بھی کہلانا شروع کردیا۔ تنبولن بولیں، لڑکا سامرس ہے، ایک کے دُوئی آدمی کام کرے کا ہوے گئے، اب پنواڑی نہ لگی تو کون دن آئی۔

گھر سے تھوڑی ہی دور وہ ٹکڑا تھا، جس پر جھمن کی نگاہ بہت دنوں سے تھی اور جس کو زمیندار نے دینے کا وعدہ کیا تھا۔ ٹکڑے کے پیچھے تالاب بھی ہے جب تک اس میں پانی رہے گا تب تک سینچنے کی بھی آسانی ہوگی۔ البتہ یہ بات ان دھوبیوں کو نہ پسند

آئے گی جو اس میں کپڑے دھوتے ہیں۔ چھمن بہت مرنج مرنجان آدمی تھے، سوچا کہ اگر دھوبی لوگ بہت برا مانیں گے تو ہم اپنا کچا کنواں الگ کھود لیں گے۔ آخر جیٹھ بیساکھ میں جب تالاب سوکھ جائے گا تو یوں بھی کنویں سے ہی سینچنا ہے۔ بانس وغیرہ کا انتظام شروع ہوگیا اور تھوڑے ہی دنوں میں پنواڑی لگ گئی۔ گھر کے دو آدمیوں میں ایک ہر وقت وہاں رہنے لگا۔ روٹی وغیرہ کھانے کی ضرورت ہوئی تو انھیں دھوبیوں سے کہہ دیا کہ ذرا دیکھتے رہنا۔ چھمن کے سلوک کی وجہ سے تمام دھوبی پنواڑی کی اپنے مال کی طرح حفاظت کیا کرتے تھے۔ مگر اجیالی دھوبن کی ایک گدھی تھی وہ لنگڑی بھی تھی اور بیمار بھی رہتی تھی، اس لیے وہ بغیر چھاندے یوں ہی گھوما کرتی تھی۔ اس پر کپڑے بھی نہیں لادے جاتے تھے۔ تھی تو وہ گدھی مگر جنس کی وجہ سے ضرورت نے اس کو بہت چالاک بنا دیا تھا۔ یعنی نگاہ بچاکر پنواڑی کے اندر پہنچ جاتی تھی۔ اکثر دیکھا گیا کہ چھمن دھوبن سے خوش گپیاں کر رہے ہیں اور اٹھ کر دیکھتے ہیں تو گدھی پنواڑی کے اندر براج رہی ہے۔ چھمن اس کو ہنکا کر باہر کردیا کرتے تھے اور اجیالی سے اس طرح دوستانہ شکایت کرتے تھے کہ گویا گدھی کی ناشائستہ حرکت میں گدھی، اجیالی اور چھمن بھی تینوں برابر کے شریک ہیں۔ لڑکا جوان خون اگر گدھی کو پنواڑی میں دیکھتا تو وہ غصہ سے اولہنا دیتا۔ اجیالی بھی لڑنے میں کسی سے کم نہ تھی۔ مگر چھمن کا برتاؤ اور اپنی ہی خطا پر وہ دو چار گالیاں گدھی کو دے اور بھیامنواں کہہ کے معافی مانگ لیتی۔ ہفتے میں ایک مرتبہ اجیالی گھاٹ پر نہ آتی تھی، بلکہ کپڑوں پر استری کرنے اور گاہکوں کے یہاں کپڑے پہنچانے کا کام کرتی تھی۔ آج وہی دن تھا، چھمن کا لڑکا جو پنواڑی دیکھنے آیا تو گدھی کو پنواڑی میں موجود پایا۔ ڈنڈے سے مارتے ہوئے باہر تک لے آیا۔ گدھی اونچی زمین سے نیچے آنے لگی، عین اس وقت ایک ڈنڈا پورا بیٹھ گیا اور وہ کوئی دو تین گز لڑھکتی ہوئی پانی میں گر گئی۔ دھوبیوں کی ہمدردی گدھی کے ساتھ تھی، مگر دوسرے کے معاملے میں لڑائی کون مول لیتا۔ ان لوگوں نے گدھی کو پانی سے گھسیٹ کر کنارے ڈال دیا اور دبی زبان سے کچھ گالیاں دینے لگے جو تھیں تو چھمن کے لڑکے پر، لیکن اگر وہ شکایت کرتا تو الفاظ ایسے تھے کہ دھوبی لوگ کہہ سکتے تھے کہ ہم لوگ تو اجیالی اور اس

کی گدھی کو کہہ رہے تھے۔ اگر تنبولی کا لڑکا بحث پر تیار ہوجاتا تو الفاظ میں لڑائی کی اچھی گنجائش تھی، مگر لڑکا کچھ نہ کچھ اپنی زیادتی پر نادم تھا۔ اس وجہ سے بات ٹل گئی۔ وہ گدھی کسی نہ کسی طرح رینگ کر شام تک تھان پر پہنچ گئی۔ مگر جانبر نہ ہوسکی اور تیسرے دن مر گئی۔ دھوبن زمیندار کے پاس آئی۔ زمیندار نے کچھمن کو بلایا۔ گرہ سے دو روپیہ دینا کس کو اچھا لگتا ہے مگر کچھمن نے نہایت خوشامد سے کہا کہ سرکار جو فیصلہ کردیں عذر نہ ہوگا۔ زمیندار نے چار روپیہ دھوبن کو دلوائے لیکن دھوبن نے چلانا شروع کیا، میری گدھی دس روپیہ کی تھی۔

دھوبن کی یہ زیادتی کسی کو بھی پسند نہ آئی۔ کچھمن نے نہایت خوشامد سے کہا...... اور جو کہو دے دیں، مگر چلاؤ مت۔

جب زمیندار نے کچھمن کو اس طرح تیار پایا تو تین روپیہ اور دلوائے، اور اپنے خیال میں فیصلہ ختم کردیا۔

دو تین دن کے بعد پنڈت برہمادت جی کچھمن تنبولی کے وہاں پہنچے، پائے لاگی، آشرباد کے بعد کہنے لگے۔

پنڈت: ارے کچھمن، ای گدھی کا کا ماملہ بھوا۔

کچھمن: مہراج گدھی کا کون ماملہ۔

پنڈت: ارے وہی جون تمرا لڑکا گدھی مار ڈالس۔

کچھمن: ہمرا لڑکا کاہے کا مار ڈالس او تو بہت دِنن سے بیمار رہی مر گئی۔

پنڈت: سب لوگ کہت ہیں کہ تمرا لڑکا مار ڈالس۔

کچھمن: ارے رام رام لڑکا کاہے کا مار ڈالس، مری سسری اپنی موت سے اوکا مار کے کوئی کا کرتا۔

پنڈت: گدھی تمری پنواڑی ماں پڑی کہو ہاں، تمھار لڑکا گدھی کا ڈھکیل دِہس کہو ہاں اور پھر گس ہوت ہے جیو لیب۔

لچھمن: ارے مہراج اوکا تو بہت دن بھئے اور گدھی تو مری ہے اَب ہیں۔

پنڈت: تیسرے دن مری ہے۔

لچھمن: اب تیسرا دن رہا ہو یا چوتھ دن۔ مُل او تو ھُوَاں سے اپنے پاؤں چلی گئی رہے۔ پھر سنا کہ مرگئی اور اوتو پہلن سے ہی بیمار رہے۔

پنڈت: تو ہتیا لاگ گئی۔

لچھمن: ارے رام رام ای ہتیا کَس۔

پنڈت: گئو سے اتر کے پھر گدھن ہتیا ہے۔

لچھمن: ارے مہراج ای کا کہت ہو۔

پنڈت: ہم کہت ہن کہ شاستر کہت ہے۔

لچھمن: تو مہراج ایسا تو کبھوں سنا نہیں۔ گدھی اور گئو کیسے برابر ہوئے سکت ہے ای گجب اندھیر تو نہیں سنا۔

پنڈت: ارے اندھیر کیسا ''گا سے گئو لکھا جاتا ہے اور گا سے گدھیو'' لچھمن کی بیوی یہ باتیں سن رہی تھیں، روتی ہوئی پنڈت کے قدموں پر گر پڑی۔

پنڈت: گھبراؤ نہیں، سب ٹھیک ہوئی جئی ہے۔ شاستر ماں سب کچھ ہے۔ دھرم سے اَدھرم نہ ہوئی پیہو، پوجاپاٹ سے سب ٹھیک ہوئی سکت ہے۔

لچھمن: تو پھر مہراج تم ہی ٹھیک کرو نہیں تو ہم دونوں اپنے منھ ماں کھپّر لگائے کے کونو اور نکس جاب۔ (لڑکے کی طرف دیکھ کر) یو سارتو دَھرمَو لِہس۔

پنڈت: (ہنس کے) ناہیں، تمرا دھرم تھوڑے جائے سکت ہے جب تک ہم جِیت ہیں تم اَس بات منھ سے نہ نکالو، بس تم اتنا جان لیو کہ ہم کا نیم سار تک جائے کا پڑہیئے، اور جو کچھ کھلاوے ماں لاگے اور ایک گدھی سونے کا دان کرے کا پڑہیئے۔ گدھی کہاں بناوت پھرہیو روپیہ ہی دے دیو۔

تین سو آدمی نے کھانا کھایا۔ پنواڑی ختم ہوگئی، تین چار ماہ بعد لوگ یہ فیصلہ بھول

گئے، مگر چھمن کو اب تک یاد ہے، بہت دنوں کے بعد زمیندار نے چھمن سے کہا، ارے چھمن پنواڑی تم نے ناحق چھوڑ دی۔ چھمن نے کہا سرکار اب نہ کہو چار سو روپیہ خرچ کرے کا پڑے ہم ہلک گئین، اب پنواڑی کا کہوں نام لیئی تو صاحب پچاس پنہی ماریو۔

○

''...... آٹھویں محرم کو حاضری بھی ہوتی تھی۔ چنانچہ مجھ سے بھی تبرا کہنے کو کہا جاتا تھا۔ خوب یاد ہے کہ میں نے ایک بار انکار کیا۔ میرے یہاں عورتوں نے کہا کہ یہ اثر سنّی مولوی کا ہے وہ نکال دیے جائیں .... میری سرتابی کی خبر مولوی صاحب تک بھی پہنچی تھی۔ مولوی صاحب کا رویّہ میرے دل پر نقش کالحجر ہے۔ مولوی صاحب مجھے گود میں لیتے تھے اور پیار کرتے تھے اور کہتے تھے جاؤ بیٹا جو کچھ تمھاری ماں کہتی ہیں کہہ دو......''

(''میرا مذہب''، صفحہ 11)

دوا

بوا رحمانی کے یہاں زمینداری تو کبھی نہ تھی مگر گاؤں میں آبرودار گھر سمجھا جاتا تھا۔ دو ہل کی سیر ہوتی تھی اور عورتیں پردے دار تھیں۔ بھرا پُرا گھر تھا ان کے شوہر ہمت خاں کی توقیر گاؤں میں کسی سے کم نہ تھی۔ گاؤں پٹی داری کا تھا۔ جس میں حصہ دار قبضے دار، ماتحتی والے سبھی رہتے تھے۔ اسی وجہ سے لوگ برابری کی زندگی بسر کرسکتے تھے۔ اگر ان کا گاؤں کسی بڑے علاقے میں شامل ہوتا تو رعایا سب برابر اور تعلقہ دار نائب صاحب اور ضلع دار سب کی حکومت اٹھاتے اٹھاتے لوگ محکومی کے زیادہ عادی ہوجاتے۔ ان کا گاؤں ایسا نہیں تھا۔ چھوٹے زراعت پیشہ کو بنتے بگڑتے کچھ دیر نہیں لگتی، دوفصلیں اچھی ہوگئیں۔ اناج سے گھر بھر گیا۔ لگان بھی نکل گیا۔ پرانے بیلوں کی جگہ نئ گوئی بھی آگئی اور اپنے ہم چشم عزت کی نگاہ سے دیکھنے لگے۔ ایک فصل خراب ہوگئی۔ لیجیے صاحب لیکھا ڈیوڑھا برابر ہوگیا۔ اگر کہیں دوفصلیں تابڑتوڑ بگڑگئیں تو کسان ٹوٹ گیا۔ اس کے بعد اگر کہیں خدانخواستہ کوئی بیماری حیرانی پڑگئی یا کوئی مقدمہ اٹھ کھڑا ہوا تو فاقے کی نوبت آگئی اور گھر بار چھوڑ کر دیس پردیس نکل گئے۔ نہیں تو دو تین برسوں میں پھر حالت سنبھل گئی اور کام چلنے لگا۔ ہمت خاں کے دو لڑکے تھے اور ایک لڑکی۔ بڑا لڑکا سولہ سترہ برس کا تھا۔ لڑکی کا سن دس گیارہ برس کا تھا۔ چھوٹا بچہ سات سال کا رہا ہوگا۔ رحمانی کے یہاں بچے تو آٹھ ہوئے مگر جیے تین ہی، باقی کوئی چیچک میں کوئی سوکھے میں یا اسی طرح کی دوسری بیماریوں میں جن میں حفاظت ہوسکتی تھی مگر نہیں ہوئی، مرتے گئے۔ گاؤں میں ایسی عورتیں بھی تھیں کہ جن کے بچے تو بہت سے ہوئے مگر جیا ایک بھی نہیں۔ ان کے دیکھتے رحمانی اسی کو اپنی خوش قسمتی سمجھتی تھیں اور اللہ کا شکر بھیجتی تھیں۔ زمانہ ایک طرح پر کبھی نہیں رہتا۔ اسی کو اہل جہاں انقلاب سمجھتے ہیں۔ ایک سال گاؤں میں ہیضے کی بیماری آئی جس میں ہمت خاں کا انتقال

ہوگیا۔ رحمانی نے بڑے بیٹے کی مدد سے کھیتی باڑی سنبھالنے کی کوشش کی مگر پردے کی وجہ سے کام بگڑتا ہی گیا۔ باہر جاکر پردہ چھوڑ دینا ممکن تھا مگر اپنے گاؤں میں رہ کر یہ کیسے ہوسکتا تھا۔ بڑا لڑکا بھی کچھ بیمار رہنے لگا۔ کھٹ کھٹ کھانسی تو گزشتہ جاڑوں ہی سے آتی تھی۔ اب تو تیسرے پہر کو حرارت بھی رہنے لگی۔ رفتہ رفتہ یہ حال ہوا کہ کھیت بے جوتے بوئے پڑے رہنے لگے۔ کچھ شکمی اٹھا دیے، کچھ جھوٹ موٹ بوئے بھی گئے تو بسارہ بھی مشکل سے نکلا۔ فاقوں نے بڑے لڑکے کی بیماری اور بڑھا دی، گاؤں سے دس کوس پر ایک بڑا قصبہ تھا جہاں حکیم ڈاکٹر اور سرکاری شفاخانہ سب ہی کچھ تھا۔ وہیں رحمانی کی خالہ زاد بہن رہتی تھی جو کسی رئیس کے یہاں نوکر تھی۔ رحمانی نے علاج کے بہانے وہیں چلے جانے کا ارادہ کیا۔ اڑوسیوں پڑوسیوں سے روز روز قرض مانگتے مانگتے تھک گئی تھی۔ کہاں تک مانگتی، کسی سے آٹا، کسی سے دال، کہاں تک ادھار لے۔ اگر گاؤں چھوڑ کر چلی گئی تو زمیندار کا پیادہ لگان بھی مانگنے روز سر پر نہ کھڑا رہے گا۔ لڑکے کا بھی علاج ہوجائے گا۔ گاؤں میں سوا نیم کی سینکوں کے اور دوسری دوا نہیں تھی۔ ایک دن اللہ کا نام لے کر چل کھڑی ہوئی۔

قصبے میں آکر پتہ چلا کہ لڑکے کو بڑی بیماری ہے۔ پہلے حکیم صاحب کا نسخہ پلایا۔ پھر خیراتی اسپتال سے دوا آنے لگی، مگر ''مرض بڑھتا گیا، جوں جوں دوا کی'' اور تھوڑے دنوں میں چارپائی سے لگ گیا۔

ایسے بیمار کو کون گھر میں رکھتا، مگر رحمانی کی بہن نے نکالا نہیں۔ البتہ بیمار کے برتن الگ کردیے۔ رحمانی کی خالہ زاد بہن ایسی خداترس کہاں تھی کہ بال بچوں والا گھر رکھا کر ایسے بیمار سے گھبراتیں نہ، مگر وجہ یہ تھی کہ رحمانی کی لڑکی کو اپنے لڑکے کے ساتھ کرنا چاہتی تھیں، اسی کی خوشامد تھی۔ ایک وہ زمانہ تھا کہ کسی رئیس کے یہاں نوکری کرنے کے بعد رحمانی کی لڑکی کا پیغام دینے کی جرأت بھی نہ پڑتی۔ آج یہ دن تھا کہ وہی رحمانی خود ان کی نگاہ دیکھتی تھیں۔ اللہ جس کو چاہے عزت دے جس کو چاہے ذلت دے۔ لڑکی کا سن بارہ تیرہ برس کا تھا۔ پڑھے لکھے خوش حال لوگوں کے یہاں یہ سن کھیلنے کا ہے۔ غریب اگر اپنی لڑکی کا بیاہ کرکے ذمہ داری دوسرے پر نہ ڈالنے کی کوشش

کرے تو کیا کرے۔ رحمانی کا لڑکا گرمیوں میں صاحب فراش ہوچکا تھا۔ ساون کے مہینے میں ختم ہوگیا۔ اتنی لمبی بیماری اور بیمار کی تکلیف دیکھ دیکھ کر ہر شخص کے دل میں آتا تھا کہ اللہ اس کی مشکل آسان کرے۔ اس دعا میں ماں بھی شریک تھی۔ مگر ایسی بات کون ہندستانی ماں منہ سے نکال سکتی تھی۔ انتقال کے بعد رحمانی نے بین ایسے کیے کہ ہر شخص کے دل پر چوٹ لگی۔ تجہیز و تکفین کے بعد ہمدردوں نے اصرار کرکے غریب کو کھانا کھلایا۔ لڑکے کے انتقال کے پہلے نہ معلوم کئے وقت فاقہ کیا تھا۔ اس وقت بھی کھانا کیا اچھی طرح کھایا جاتا، مگر جب تک دنیا میں آدمی ہے بغیر کھائے چارہ نہیں، لیکن اس وقت میں بھی بین ایسے کیے کہ سننے والے پھوٹ پھوٹ کر رونے لگے۔ اس باضابطہ رونے میں کتنا رونا رواج کا تھا۔ کس قدر دل کے تقاضے کا اور کس قدر دماغ کے اشارے کا اس کو اللہ ہی جانتا ہے۔

رحمانی مصیبت میں گھر سے نکلی تھی اس کے پاس تھا ہی کیا؟ جو تار چھلا رہا بھی ہوگا وہ لڑکے کی بیماری میں اڑ گیا۔ اب خانہ رسول اللہ تھا۔ جس چیز کا خیال گھر پر خواب میں بھی نہ آیا تھا اور جس کو یہاں آکر منہ سے نکالنے کی جرأت نہیں ہوئی تھی وہ سامنے آئی، یعنی رحمانی ماماگیری کرنے پر تیار ہوگئیں، اور لڑکے کے سیوم کے بعد منہ پھوڑ کر بہن سے کہہ بھی گزریں۔ بہن نے کہا اس کی فکر ہوجائے گی، مگر جوان لڑکی کو کیوں کر ساتھ لے جاؤ گی جو ان کے دل میں تھا وہی ان کی خالہ زاد بہن کے دل میں تھا۔ قصہ مختصر لڑکے لڑکی کی نسبت ہوگئی اور دو بول شرع کے بھی ہوگئے۔ گھر میں اتنی بڑی موت ہوچکی تھی اگر پیسہ ہوتا بھی تو ڈھول کیوں کر رکھی جاتی۔ لیکن ان کی سمدھن نے بھی اتنا لحاظ کیا کہ گانا وانا نہیں ہوا۔ لڑکی کے فرض سے سبکدوش ہوکر رحمانی نوکری کرنے لگیں اور رحمانی سے بوا رحمانی ہوگئیں۔ یہ تو ماماگیری کرنے پر تیار تھیں، مگر تقدیر کی اچھی تھیں۔ ایک بڑے گھر میں کھانا پکانے پر نوکر ہوگئیں۔ بہت بڑی سرکار تھی، باہر کا باورچی خانہ جدا تھا، اندر کا کارخانہ جدا۔ نوکروں چاکروں کی کثرت تھی، اندر باہر ملاکر خدا جھوٹ نہ بلاوے پچاس ساٹھ آدمیوں کی روٹی رہی ہوگی۔ نوکر تو پھر نوکر، لیکن اتنا غنیمت تھا کہ ماماگیری کی ذلت سے بچ گئیں۔ زمانہ گزرتے کچھ دیر نہیں لگتی، قصے

کہانی میں تو کچھ بھی دیر نہیں لگتی۔ دس برس ایک سطر سے دوسری سطر پر نگاہ دوڑاتے گزر جاتے ہیں۔ اتنے زمانے میں بوا رحمانی کی دنیا ہی بدل گئی تھی۔ دیہات کا گھر، کھیتی باڑی وہاں کا رہنا سہنا، پچھلے جنم کی باتیں ہوگئی تھیں۔ اس کے بجائے صاف ستھرا چھوٹا سا گھر رئیس صاحب کی مدد سے اور انھیں کی زمین پر بن گیا تھا۔ گھر میں گرستی بھی حیثیت کے موافق ہوگئی تھی۔ بوا رحمانی ادھیڑ عمر میں آئی ہی تھیں، اب اچھی خاصی بوڑھی ہوگئی تھیں۔ پہلے دبلی تھیں، اب بلغم نے بھاری بھرکم بنا دیا تھا۔ ناک میں کیل تو پہن نہیں سکتی تھیں، مگر ہاتھوں میں موٹے موٹے کڑے اور بتانے، گلے میں جھالر دار طوق اطمینان کا پتہ دیتے تھے۔ سونے کی بجلیاں بھی بنوائی تھیں مگر وہ بہو کے لیے رکھی تھیں۔ ساتھ کی ماما اصیلوں نے کہا بھی کہ بوا کان میں ڈال لو اپنے جیتے جی بہو کو کیوں دوگی۔ تمھارے بعد تو اس کا ہے ہی، اس سے ذرا بہو پر رعب رہے گا اور تابعدار رہے گی۔ مگر رحمانی نے نہ پہنا۔ اللہ وہ دن بھی لایا کہ بوا رحمانی بہو بیاہ کر لائیں، مگر اپنے قدیم دیہاتی اعزا کو نوید نہیں بھیجی اور نوید بھیجتیں بھی تو شاید نہ آتے۔ وجہ یہ تھی کہ جس لڑکی سے انھوں نے لڑکے کی نسبت کی تھی۔ اس کی پرورش ایک دوسرے رئیس کے گھر میں ہوئی تھی۔ اس کی ماں کسی زمانے میں اسی طرح رانڈ دکھیا دیہات سے آکر دودھ پلانے پر نوکر ہوئی تھی۔ پہلا ہی لڑکا گود میں تھا۔ نوکری کے بعد اس کو کافی دودھ نہ مل سکا اور وہ دبلا ہوکر مر گیا۔ قاعدہ کے موافق انا کا لڑکا اوپر کا دودھ پاتا تھا، چوری چھپے کسی وقت انا بھی پلا دیتی تھی، اگر کسی نے نہ دیکھا تو خیر۔ اگر دیکھ لیا تو آفت آتی تھی، جس لڑکے کو انھوں نے دودھ پلایا تھا اس کی دودھ بڑھائی کے بعد یہ کچھ معطل سی ہوگئیں۔ گو گھر میں عزت توقیر وہی رہی جو ہونا چاہیے تھی۔ مگر دھندا کم ہوجانے سے خیالات کچھ اچاٹ رہنے لگے جو وقت بچے کی خدمت میں صرف ہوتا تھا وہ بناؤ سنگار میں گزرنے لگا۔ دودھ بڑھ جانے کی وجہ سے پرہیز کی بھی تقید اٹھ گئی تھی۔ مرچیں کھانے کو زبان ترس گئی تھی۔ کھٹاس کا مزا خواب ہوگیا تھا وہ پھر لوٹ آیا۔ کچالو چٹ پٹے اور چنے جور گرم کا چٹخارہ بھرا جانے لگا۔ کپڑے اور زیور تو اناؤں کے پاس اچھے ہوتے ہی ہیں۔ ان کے پاس بھر دِل جوانی کا بھی خزانہ تھا۔ جوانی میں

دانت نکال کر طاق پر رکھ دو تب بھی نکلے ہی رہیں گے۔ یہی حال اتا کا تھا۔ کسی مرد سے آنکھیں چار ہوئی نہیں کہ ہونٹوں کی کلی بکس گئی۔ اسی زمانے میں بیگم صاحبہ نے ایک آدھ مرتبہ رئیس صاحب کو بھی آنکھیں ملاتے اور اتا کو مسکراتے دیکھ لیا۔ آدمی بڑی سمجھ دار تھیں۔ بجائے اس کے کہ سوئی کا بھالا بناتیں۔ بات کا بتنگڑ کرتیں، مہنامت ڈالتیں، گھر کا پالا ہوا ایک لڑکا تھا انھوں نے اسی کے سَر اُتا کو تھوپ دیا۔ لیجیے صاحب اس کا بھی گھر آباد ہوگیا اور قاضی صاحب نے اپنی عنایت سے آئندہ اور گزشتہ تہمتوں کا دروازہ بھی مسدود کردیا۔ مجال ہے کہ شوہر دار عورت پر کوئی دوکھ رکھ سکے یا باندھنو باندھے۔ مگر سال کے اندر ہی لڑکی پیدا ہوئی۔ حساب لگانے سے بیاہ کے آٹھ مہینے ہوتے تھے۔ اب کیا تھا عورتوں اور عورت مزاج مردوں کے ہاتھ ایک مشغلہ آگیا، جہاں سنئے اسی کی باتیں ہوتی ہیں۔ کہیں غصہ ہے، کہیں ہنسی ہے، کہیں تعجب ہے، کہیں کانوں پر ہاتھ رکھ کر کہا جارہا ہے توبہ توبہ، کہیں ماتھا کوٹ کر کہا جاتا ہے، اللہ ہر آفت سے بچائے، کہیں ہونٹوں پر انگلی رکھ کر اوئی بہن یہ کیا ہوا، کی آواز آتی ہے، کوئی چار دن کے بچے میں رئیس صاحب کی مشابہت دیکھ لیتی ہے، کوئی پہلے ہی سے سر پر پورے بالوں کا ذکر کرکے کہتی ہے اٹھواسی تو ہونہیں سکتی۔ ایک متشرع بزرگ شوہر کو بزرگانہ صلاح دے رہے ہیں بیٹا پھر سے نکاح پڑھوا لو۔ قصہ مختصر جتنے منھ اتنی زبانیں، جتنی زبانیں اتنی باتیں۔ ہر شخص اپنی چھوڑ پرائی بات طے کرنے پر تیار تھا۔ اگر یہ دیہات میں پیدا ہوئی ہوتی تو اس کا نام کوئی رسولن، امامن وغیرہ ہوتا، یہاں اس کا نام جو ہی خانم رکھا گیا۔ یہی لڑکی تھی جس کے ساتھ بوا رحمانی کے لڑکے کی شادی ہوئی تھی۔ بوا رحمانی نے بہو نہایت سلیقہ کی پائی، سینا پرونا، کھانا پکانا، ہر چیز میں بے مثال تھی گھر کے انتظام میں صفائی، کفایت شعاری میں اپنا جواب نہیں رکھتی تھی آنے جانے والوں سے برتاؤ، ان کی خاطر مدارات میں اپنی حیثیت سے کہیں بڑھ کر کام کرتی تھی اور گو بڑے لاڈ پیار کی پالی ہوئی تھی اور جس گھر سے آئی تھی وہاں نوکر چاکر اس کی قدر و منزلت نہ معلوم کس وجہ سے نوکروں کی دوسری لڑکیوں سے زیادہ کرتے تھے۔ پھر بھی یہ سسرال میں ہر طرح کی کڑی جھیلنے کو تیار رہتی تھی۔ بوا رحمانی جہاں نوکر تھیں وہاں

کے نوکر چاکر مختلف موقعوں پر ان کے گھر آنکلتے تھے اور ہر شخص کے ساتھ ایسا برتاؤ ہوتا تھا کہ بوا رحمانی کی بہو کی ہر طرف واہ واہ تھی۔

اب دو باتیں بوا رحمانی کے لڑکے کی بابت سن لیجیے۔ ان کا نام دائم خاں تھا۔ بوا رحمانی کی سرکار میں یہ بھی رہتے تھے۔ پہلے چلم وغیرہ بھرتے تھے۔ جب ذرا ہوش سنبھالا تو پھر خدمت گاری کرنے لگے، مگر اوروں کی طرح تنخواہ ان کی نہ مقرر ہوئی، گو مہینے میں تنخواہ سے زیادہ پا جاتے تھے غیر ذمہ داری کا کام، رفتہ رفتہ مٹرگشت زیادہ اور کام کم کرنے لگے۔ عمر بھر یہی رہا کہ گھر کا خرچ اسی سرکار سے چلا کیا۔ وقتاً فوقتاً کام بھی کیا کیے مگر مقررہ تنخواہ کبھی نہیں پائی۔ ایسے لوگوں کو لواحق کہتے ہیں۔ آدمی نیک تھا مگر بے وقوف نوکروں میں ایک کہاوت ہے۔ ''جس کی بڑھیا محل کے اندر اُس کا طالع بڑا سکندر'' بچپن سے پکے پکائے عمدہ کھانے کے عادی رہے۔ مزے مزے کی چیز جو گھر میں پکی اس میں ان کا حصہ ضرور لگا اور اوپر کا نہ سہی، پینڈی کا شوربہ تو ان کا کہیں گیا نہ تھا بغیر محنت کیے کھانے کی سزا چھوٹے بڑے ہر شخص کو ملتی ہے۔ ان میں کیا سرخاب کے پر لگے تھے، جو یہ بچ جاتے، اسی وجہ سے کاہل بھی ہوگئے تھے۔ غریبوں کے لڑکوں کا دستور ہے کہ دس ہی بارہ برس کی عمر میں اپنے آبائی یا کسی نہ کسی دوسرے کام پر لگا دیے جاتے ہیں۔ بعض اسی وقت سے کرنے لگتے ہیں، بعض جب مصیبت پڑتی ہے تب کرتے ہیں، لیکن ماں باپ کوشش یہی کرتے ہیں کہ کام کرنے کی عادت شروع ہی سے پڑ جائے۔ میاں دائم خاں کو ان کی ماں نے اس ڈھرے پر نہ لگایا۔ اسی طبقے کے دوسرے لڑکے جب دوپہر کو کام پر سے لوٹتے تھے تو موٹا جھوٹا جو کچھ ملا بے تابی میں کھا گئے، بھوک کی شدت نے شکوے شکایت کا موقع نہیں دیا۔ میاں دائم خاں کی یہ عادت پڑی تھی کہ گھومنے پھرنے کے بعد جب دوپہر کو لوٹے تو جو ڈالی ماں سرکار سے لے کر آئی ہیں سامنے رکھ کر کھانے لگے۔ اگر کسی دن سالن کم بچا تو جائزہ لیتے وہیں سے شکوے کے انداز میں پکارے ''اور اماں اس میں تو ہڈی ہڈی دکھائی دیتی ہے، بوٹی تو ہے ہی نہیں'' ماں نے کہا کھا لو نہیں بچی تو میں کیا کرتی، وہ دیکھو طاق پر کاغذ میں لپٹی ایک برفی کی ڈلی رکھی ہے وہ کھا لینا۔ اس کے بعد دائم

چپ چاپ کھا کر باہر چلے جاتے تھے۔ حق بات کہنا چاہیے۔ کھانا چاہے اچھا ہو چاہے بڑے میاں دائم خاں اس معاملے میں مذکورہ بالا شکایت سے زیادہ کبھی نہیں کرتے تھے۔

شادی کے بعد ایک نئی آفت نازل ہوئی یعنی نہ فاتح کے اوپر فتح مندی کے آثار دکھائی دیے نہ مفتوح پر فتح ہوجانے کا وہ اطمینان چمکا جو تسلط کے بعد ہوتا ہے۔ آٹھ دس دن تو بات چھپی رہی۔ رفتہ رفتہ یہ راز دائم خاں کی سسرال سے کھلنا شروع ہوا۔ بوا رحمانی بہت گھبرائیں، بیٹے کو حکیم صاحب کے پاس لے جانے کو تیار ہوئیں۔ لڑکا پہلے تو جانے ہی سے انکار کرتا رہا۔ اس کے بعد مجبوراً حکیم صاحب نے وہی سوالات کیے جو دواؤں کے اشتہاروں میں دیکھے جاتے ہیں اور یہی سبب مرض کا ٹھہرایا۔ پھکی کا نسخہ لکھ دیا کہ صبح کو گائے کے دودھ کے ساتھ پیو، کئی روپے کا حلوہ بنا دیا جب اس سے بھی کچھ فائدہ نہ ہوا تو کہا ذری سردی اور پڑنے لگے تو علاج شروع ہوگا۔ اب یہ راز پوری طور سے افشا ہو چکا تھا۔ ساتھ کے نوکروں چاکروں نے دائم خاں سے صاف صاف پوچھنا شروع کیا۔ دائم خاں کبھی جزبز ہوئے، کبھی شرمائے، کبھی ہمدردی کا اظہار پاکر کہنے لگے یار کچھ سمجھ میں نہیں آتا ہے، ایسے تو ہم اچھے ہیں مگر وہاں پہنچ کر نہ معلوم کیا ہوجاتا ہے۔ حکیم صاحب نے کہا ہے کہ جب ناقص مواد نکل جائے گا تو اچھے ہوجائیں گے۔ دیکھو بھائی کیا ہوتا ہے۔

بوا رحمانی اپنی پریشانی میں دائم کو لے کر لکھنؤ بھاگیں۔ ایک بڑے ڈاکٹر کو دکھایا۔ اس نے حال سن کر کہا کہ یہ روحانی شکایت ہے جس کو غلطیوں سے کوئی واسطہ نہیں ممکن ہے غلطیوں سے کچھ بیماری زیادہ ہوگئی ہو مگر اصل وجہ روحانی ہے اس علاج میں دیر لگے گی اور یہاں رہنا پڑے گا۔ بوا رحمانی کے پاس نہ اتنا وقت تھا نہ روپیہ۔ ناچار نسخہ لکھوا کر واپس آئیں۔ اس کے بعد پھر سے حکیم صاحب کا علاج شروع ہوا پھر میاں دائم خاں عطائیوں کے ہتھے چڑھ گئے۔ نہ معلوم کتنے زخم ڈالے گئے کتنا خون مواد ہوکر بہہ گیا۔ مگر ''مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی''۔ تقریباً دو سال یہی ہوا کیا۔ اس کے بعد مایوس ہوکر بیٹھ رہے۔ سسرال والے پہلے ہی سے طلاق مانگ رہے تھے۔ اب بڑے زور و شور سے اس کا مطالبہ کیا گیا۔ اسی زمانے میں بوا رحمانی کا بھی انتقال

ہوگیا۔ لڑکی کے ماں باپ مقدمہ چلانے پر تیار ہوئے مگر جوہی خانم نے صاف صاف کہہ دیا کہ میری تقدیر میں جو کچھ ہونا تھا ہوا اور جو ہونا ہے ہوگا ہو کے رہے گا۔ پہلے تو بے سوچے سمجھے جھونک دیا اب فارختی (فارغ خطی) لکھواتے ہیں، میں طلاق ولاق نہ لوں گی اور خدا نے چاہا تو عمر بھر یوں ہی پار کردوں گی بہت سی کمسنی میں رانڈ ہوتی آئی ہیں آخر وہ یونہی پہاڑ ایسی جوانی نہیں کاٹ دیتی ہیں۔ دائم خاں میاں بی بی کا سلوک جوں جوں اغیار دراندازیاں کرتے گئے اور اچھا ہی ہوتا گیا۔ لوگ کہتے ہیں اور دیکھنے میں بھی یہی آیا ہے کہ بغیر زناشوئی رشتے کے محبت قائم نہیں ہوتی۔ یہی فرق بہن بھائی اور میاں بیوی کی محبت میں بتایا جاتا ہے۔ مگر دائم خاں میاں بیوی کی یگانگی وہ استثناء سمجھیے جس سے ہر قاعدہ مضبوط ہوتا ہے۔ اسی طرح دس پانچ برس گزرتے گئے اور بات پرانی دُھرانی ہوتی گئی۔ دوسروں پر اعتراض جمانے کو نت نئے معاملات نکلا کرتے ہیں۔ معاشرتی، مالی، جنسی گڑبڑیں ہوا ہی کرتی ہیں۔ اس قدیم فضیحتے کو لوگ کب تک لیے بیٹھے رہتے آخر بھول گئے۔ اگر کچھ لوگ نہیں بھولے تھے تو محلے کے دو چار دل پھینک لونڈے تھے اور خود دائم خاں کی سرکار کے دو ایک نوجوان نوکر جو وقتاً فوقتاً کسی نہ کسی عذر سے دائم خاں کے گھر پہنچ ہی جاتے تھے۔ لیکن یہاں عجیب رنگ تھا۔ لوگ نہ معلوم کیا کیا ارادے اور کون کون منصوبے گانٹھ کر آتے تھے مگر وہاں نگاہ میں کچھ ایسا برف، کافور، کتیرہ، کیلے کا پانی، برومائیڈ گھلا ہوا تھا کہ لونڈے کیا بڑے بڑے تماشبین سٹ پٹا جاتے۔ مسز سڈنس انگلستان کی بڑی مشہور ایکٹرس کی پرستش کرنے والوں کی کمی نہیں تھی۔ شاہزادوں سے لے کر متوسط درجے تک پجاریوں کا شمار سیکڑوں میں تھا۔ شریڈن بھی انھیں میں تھے۔ کسی نے کہا تعجب ہے کہ تم نے باوجود اس گرم جوشی کے مسز سڈنس سے کبھی اظہار عشق نہیں کیا۔ شریڈن نے کہا ارے اس کے رعب حسن میں وہ دبدبہ ہے کہ جو شخص اس سے اظہار عشق کرلے وہ آرچ بشپ آف کینٹربری سے بھی اظہار عشق کرلے گا۔ یہی حال جوہی خانم کا تھا۔ ایک آدھ بے تکے، بے ہودہ آنے جانے والے نے مذاق میں یا کسی اور بھدے طریقے سے منھ پھوڑ کر اظہار مطلب بھی کیا مگر ایک ہی نگاہ میں کھسیانے ہوکر بھاگ آنا پڑا۔ زمانہ گزرتا گیا لوگوں کی کوششیں

جاری رہیں۔ میاں بیوی کی بے واسطہ محبت مضبوط ہوتی گئی۔ ہرج مرج میں یہ حال ہوتا تھا کہ اگر ایک کی انگلی دکھی تو دوسرا بے چین ہوگیا۔ عورت مرد کا جھوٹ موٹ کا سہارا بھی بہت ہوتا ہے لیکن مرد کو بھی ہمدرد کی کم ضرورت نہیں ہوتی۔ ظاہراً یہی وجہ معلوم ہوتی تھی کہ یہ لوگ ایک جان دو قالب تھے ورنہ معاملات ایسے تھے کہ اگر ایسا نہ ہوتا تو کون تعجب کی بات تھی۔ بعض عورتیں جو ہمدرد تھیں اور جن سے یہ بھی اپنے دل کا حال کہہ دیتی تھی، ان سے اکثر باتیں ہوئیں۔ اس نے صرف یہی کہا کہ مجھ کو کوئی تکلیف نہیں ہے۔ یہ بھی کہا کہ جب کوئی مرد اس طرح کا کوئی کنایہ کرتا ہے تو نہ صرف سر سے پاؤں تک آگ لگ جاتی ہے بلکہ یہ بھی جی چاہتا ہے کہ کنویں تالاب میں پھاند پڑوں۔ کہتی تھی کہ آبرو پر سے سوجانیں قربان ہیں۔ مختلف مردوں کے ڈورے ڈالنے کی مصیبت اس غریب پر اس وجہ سے اور زیادہ تھی کیوں کہ میاں دائم خاں رشک کے مادہ سے بالکل بے واسطہ رہے۔ اگرکوئی مرد کسی بہانے سے گھر میں آیا تو انھوں نے کوئی مزاحمت نہ کی اور اگر نہ آیا تو کوئی پوچھ گچھ نہ کی گویا ان کے دماغ میں ڈاہ کا خانہ ہی خالی تھی۔ میاں دائم خاں کو کبھی زکام ہوگیا کبھی یوں ہی طبیعت ست ہوگئی مگر ان کی بیوی ہمیشہ عورتوں کی بیماری میں گرفتار رہتی تھی کمر میں درد، سر میں درد، آنکھوں میں تکلیف، غرض کہ آئے دن روز کی بیمار تھی۔ ایسے وقتوں میں میاں دائم خاں کی بے چینی قابل دید ہوتی تھی۔ کہیں سر دبا رہے ہیں کہیں حکیم صاحب کے یہاں دوڑے جاتے ہیں کہیں قابلہ کی خوشامدیں کر رہے ہیں۔ غرض کہ یہی مشغلہ رہ گیا تھا۔

دائم خاں کی شادی کو تقریباً دس برس ہوچکے ہیں۔ جوہی خانم جوانی کے بے آب ریگستان کو پار ہی کیا چاہتی ہیں مگر مثل ہے ''عورت کو تین دن قبر میں بھی بھاری ہیں'' عاشق تن لوگ اس کی طرف سے کم و بیش مایوس ہوچکے ہیں۔ ٹوہ لگانے والی عورتیں طوطیا طوفان اٹھانے والیاں بھی بے پروا سی ہوگئی ہیں کہ ایک نیا گل کھلا۔ پڑوس میں ایک آدمی کوئی پینتیس چھتیس برس کے سن کا آکر رہا۔ ڈھونڈے نام نہ صورت نہ شکل نہ ایسی کمائی نہ اٹھتی جوانی۔

رمضان شریف کے دن ہیں، رات کے دس بجے ہیں۔ میاں دائم خاں شبینہ

پڑھنے بڑی مسجد گئے ہیں، جعفر نامی ایک خدمت گار کچھ بچی کچھی افطاری بیگم صاحبہ کے حکم سے لے کر آیا۔ صدر دروازے کی طرف تو گیا نہیں۔ کھڑکی قریب تھی، اسی طرف آیا۔ کھڑکی بند تھی، مگر کچھ آہٹ پاکر اس نے نہ آواز دی نہ زنجیر کھٹکھٹائی، بلکہ دروازے میں کان لگا کر سننے لگا، کیا سنتا ہے کہ دائم خاں کی بی بی آہستہ آہستہ کہہ رہی ہیں ''عورت کی دوا مرد، میں ہمیشہ کی بیمار، برسوں ہوگئے، ٹھیک وقت پر نہ سر دھویا نہ بغیر تکلیف کے ایک مہینہ گزرا اور وہی اب ہوں کہ کوئی بیماری نہیں، دن بھر سر جھکا کر سیا کرو، نہ آنکھوں کے ڈھیلے دکھیں نہ سر میں دھمک پیدا ہوا کمر کا درد تو جیسے تھا ہی نہیں۔'' میاں جعفر بھی ان کھسیانی بلیوں میں تھے جو کسی زمانے میں کھمبا نوچ چکے تھے، اب کیا تھا پیٹ پکڑے دوڑے اور دوسروں کو خبر سنائی۔ آبرو بڑی قیمتی چیز ہے مگر دوسرے کی آبرو کو کوڑیوں کے مول بیچنے میں سب کو لطف آتا ہے۔ بس کیا تھا لوگ چڑھ دوڑے۔ ان میں وہ بھی تھے جو خود ناکامیاب رہے تھے اور وہ بھی تھے جو مفت کی سیر دیکھنا چاہتے تھے اور چور چور کا ہلڑ کردیا۔ دو چار آدمیوں نے چور کی ہانک لگائی۔ چالیس پچاس آدمیوں نے ڈنڈے لاٹھی لے کر گھر گھیر لیا۔ کچھ لوگ چاروں طرف اپنے اپنے کوٹھوں پر چڑھ گئے کہ چوٹے نکل کر نہ جانے پائیں۔ وہاں چور ہو تب تو نکلے، میاں ڈھونڈے، شرمائے لجائے پریشان حال نکلے اور کہنے لگے، میں تو آگ لینے آیا تھا۔ لوگوں نے ایک نہ سنی بعض منچلوں نے دو چار گدّے بھی رسید کیے اور پکڑ کر رئیس صاحب کے پاس لے آئے۔ دائم خاں کی بیوی بھی طلب ہوئیں، نہایت سراسیمہ سر سے پاؤں تک کانپتی ہوئی، منہ چادر سے چھپائے آئیں اور رئیس صاحب کے قدموں پر گر پڑیں۔ رئیس صاحب کو ترس آیا اور اندر بھیج دیا اور مجمع کو منتشر ہونے کا حکم دے دیا۔ اتنے میں پولیس کا آدمی بھی آگیا مگر صورت حال دیکھ کر دست اندازی کی کوئی وجہ نہ پائی۔ اگر وہ عورت غریب آشنائی میں پختہ کار ہوتی تو نہ معلوم کتنے بہانے ڈھونڈھ لیتی اور دوسروں کے پہلے شاید خود ہی چور چور پکار اٹھتی، مگر وہ ایسی تو تھی نہیں۔ رئیس صاحب سے تنہائی میں اس نے صاف صاف کہہ دیا کہ آج اتنے دن مجھ کو ان کے گھر میں آئے ہوئے جو حال ہے آپ سے چھپا نہیں ہے۔ میں ہمیشہ آبرو پر سے جان

قربان کرتی رہی البتہ اس معاملے میں مجھ کو جو روسیاہی بدی تھی وہ ہوئی اور میں تو کہوں گی اس میں بھی میرا قصور نہیں، کیونکہ اٹھتی جوانی کا جو زمانہ تھا اس میں نہ معلوم کتنوں نے میری آبرو لینی چاہی، مگر میرا پاؤں نہ ڈگا۔ اب آدھی عمر گزر چکی تو لکھا پورا ہوا۔ اس کی صورت یہ ہوئی کہ جب جب میں نے اس مرد کو دیکھا تو میری حالت ہی بدل جانے لگی۔ ادھر اس کا سامنا ہوا اور ادھر میرا دل دھڑکنے لگا۔ اور سر سے پاؤں تک تھرتھری سی پڑ گئی۔ ہاتھ پاؤں کی طاقت سلب ہوگئی، زبان سے نہیں نکلنا مشکل ہوگیا۔ دل میرا آبرو جانے پر رویا کیا۔ مگر ہونٹ بلا اختیاری میں مسکراتے رہ گئے، میں اس کو نہ تب چاہتی تھی نہ اب چاہتی ہوں۔

اب چاہے سر منڈوا کر اور منہ میں کالک لگا کر گدھے پر سوار کیجیے چاہے اجازت دیجیے کہ کچھ کھا کر سو رہوں۔ اسی کے ساتھ یہ بھی خیال ہے کہ اگر میں مر گئی تو پھر ان کی (دائم خاں کی) کون خبر لے گا۔

جو ہی خانم کا ڈھونڈھے کی محبت سے انکار، ممکن ہے اس وجہ سے رہا ہو کہ محبت سے انکار عورت اپنا فطری حربہ سمجھتی ہے۔ ممکن ہے اس وجہ سے رہا ہو کہ دائم خاں سے شادی کے بعد وہ سمجھنے لگی ہو کہ عورت کا جنسی حق اور مرد پر جان دینے کی صفت قسام ازل کے یہاں سے اس کو ملی ہی نہیں ہے۔ رہی دائم خاں سے محبت، وہ کوئی بلند چیز رہی ہو۔ یا ہندستانی رسوم کی گنگا میں پھسل پڑنے کے بعد صرف ''ہرگنگا'' رہی ہو اس میں کلام نہیں کہ ان میاں بیوی کا تعلق وہ تعلق نہ تھا جو عورت اور مرد کی محبت کے نام سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

رئیس صاحب پڑھے لکھے نیک دل آدمی تھے۔ یہ بیان اس صفائی سے سن کر دنگ رہ گئے اور بجائے نفرت کے عبرت سی ہوئی۔ میاں دائم خاں مسجد سے واپس ہوئے انھوں نے ہاں ناں کچھ نہ کہا اور بیوی کو ساتھ لیے گھر چلے آئے۔ وہاں پہنچ کر کہنے لگے سب کے سب سالے ہماری آبرو لینے پر لگے ہیں، مگر تم کچھ پروا نہ کرو، لو مسجد سے یہ مٹھائی تمھارے لیے لائے ہیں، کھالو۔ تمھارا سَرگہی (سحرگہی) کا دودھ لاکر طاق پر رکھ دیا تھا، تب مسجد گئے تھے، دیکھنا بلی تو نہیں پی گئی۔

لیجیے صاحب قصہ ختم ہوگیا۔ میاں دائم خاں کے رقیب صاحب دوسرے دن غائب ہوگئے۔ دائم خاں کی بیوی کا کچھ خطرہ سا ٹل گیا اور تب ہی سے کچھ بہکی بہکی سی باتیں کرنے لگیں، مگر اس حالت میں بھی میاں بیوی ایک دوسرے پر فدا ہی رہے، بلکہ کچھ ایک دوسرے کا سہارا اور زیادہ ڈھونڈھنے لگے۔

○

"........... اس طرح مجلسیں منعقد کیجیے اس طرح سے دین کی اشاعت کیجیے اس طرح سے حسین کی تاسی کیجیے کہ دیکھنے والا پھٹ سے کہہ دے کہ کس کا غلام ہے، ان کی قربانیاں بیان کرکے سنّی کو شیعہ کر لیجیے، وہابی کو شیعہ کر لیجیے، صوفی تو آدھا شیعہ پہلے ہی سے ہے، عیسائی کو شیعہ کر لیجیے، ہندو کو شیعہ کر لیجیے اور پھر سب کو روحانی طواف کرا کے مسلمان کر لیجیے۔ ایسا کر دکھائیے کہ جنت میں رسول اللہ امام حسین سے فرمائیں، بیٹا تیری سعی مشکور ہوئی......"

(میرا مذہب)

دور کا نشانہ

لالہ بنسی دھر تھے تو ذات کے بنیے اور وہ بھی کشودھن جو بنیوں میں اونچی ذات نہیں سمجھی جاتی ہے۔ مگر اپنے انداز شرافت سے ہیموں بقال، ٹوڈرمل، بھارگو، سب کی یاد تازہ کردیتے تھے۔ گھر کے اندر بیٹھ کر پوجاپاٹ کرلیتے ہوں، مگر باہر آزاد خیال، آزادہ رو مشہور تھے۔ آج کل کی آزادہ روی نہیں کہ باتیں کرنے میں بدتمیزی تمغہ خودداری سمجھی جائے اور کھلم کھلا ہر چیز کھانا پینا نئی روشنی کی پہچان ٹھہرے۔ حسن اتفاق سے حسن پرست بھی واقع ہوئے تھے۔ اس لیے لکھنؤ کے چوک اور شہر کے پچھمی حصہ سے جہاں قدیم کلچر کے نام لیوا نوابین رہتے ہیں زیادہ واقف تھے، لکھپتی مشہور تھے، گھر میں مہاجنی، عدالت دیوانی سے خریدی ہوئی زمینداری سب ہی کچھ تھا مگر صحبت کے لتیا یقیناً ایسے تھے کہ باوجود مصروفیت کے ان جلسوں کے لیے وقت نکال لیتے تھے۔ چوک بھر کی خبر رکھتے تھے۔ جہاں کہیں جلسہ ہوا یا پرائیویٹ مجرا ہوا، وہاں پہنچ ہی جاتے تھے اور رکھ رکھاؤ ایسا تھا کہ ان جلسوں میں حاشیہ نشین ہوکر نہیں بیٹھتے تھے، بلکہ مسند کا کونا دبا کر بیٹھنے والوں میں شمار ہوتا تھا۔ جہاں کہیں ارباب نشاط کے انتخاب کا سوال پیش ہوتا تھا وہاں ان کی رائے بہت قیمتی سمجھی جاتی تھی اور ایسے اہم معاملات میں جو خوش قسمت ان کا مشورہ حاصل کرسکتا وہ مطمئن ہوجاتا تھا کہ صورت، دن، سن اور فن کے لحاظ سے اب کوئی کسر نہیں رہ گئی۔ آدمی منکسر مزاج اور خدمت کرنے کا جذبہ رکھتے تھے، مگر جہاں سے دل کے معاملات شروع ہوتے تھے وہاں سے ان کی خودداری ان کو اجازت نہیں دیتی تھی کہ دوسرے کے معاملات سے واسطہ رکھیں، تجربے نے ان کو بتا دیا تھا کہ چاہے جتنا بڑا دوست ہو یا کتنا ہی دولت مند ملاقاتی ہو اگر ان پرائیویٹ معاملات میں یہ کسی کی مدد کریں گے تو ذلیل ہوجائیں گے۔ میرے پڑھنے والے کہتے ہوں گے کہ لکھنے والا سٹھیا گیا ہے۔ نہ معلوم کہاں کی دقیانوسی بداخلاقیوں اور بدتہذیبیوں کو پیش کر

رہا ہے اور یہ بھی خیال نہیں کرتا کہ نوجوان لوگ پڑھ کر بے راہ ہوجائیں گے۔ چوک اور چوک بازاروں کا ذکر قانوناً ممنوع ہوجانا چاہیے۔ میں عرض کروں گا کہ کہیں ایسا کیجیے گا بھی نہیں، نہ معلوم کتنے ریسٹوران، کتنے ہوٹل، کتنے کافی ہاؤسز، مِلک کارنرس پر قفل پڑ جائیں گے اورنوجوانوں کو جو سبق فطرت پڑھا چکی ہے وہ تو بھولنے سے رہے لیکن زیب النساء کی طرح چلا اٹھیں گے ۔

پاکبازی من باعث گناہ من است

جس زمانے کی میں باتیں کر رہا ہوں اس وقت عید اور دوسرے خوشی کے موقعوں پر باضابطہ محفلیں ہوتی تھیں جن میں بچے، بوڑھے، جوان سب باضابطہ شریک ہونا اپنا فرض سمجھتے تھے۔ ہر ایازاپنی قدر پہچان کر برتاؤ کرتا تھا۔ کوئی خالی سَم پر گردن ہلا دیتا تھا کوئی ''آں'' بھی کہہ دیتا تھا۔ کوئی خالی واہ کرنا اپنا منصب سمجھتا تھا، کوئی موسیقی کے نکات بیان کردیتا تھا اور بزرگ محفل خالی شگفتہ مزاجی چہرے سے ظاہر کرتا تھا اور ان ہی مواقع پر بعض نوجوانوں کی نگاہوں کا جائزہ لیتے ہوئے زبان حال سے کہتا تھا ؎

اچھا ہے دل کے ساتھ رہے پاسبانِ عقل
لیکن کبھی کبھی اسے تنہا بھی چھوڑ دے

لالہ بنسی دھر کے ایسے لوگ آرٹسٹ سے تہذیب کے ساتھ باتیں کرکے اس کا دل بھی بڑھاتے تھے۔

لیجیے صاحب، سارنگی پر لہرا شروع ہوا۔ یہ ناچ کی تصریحیں کرتے جاتے ہیں کہ سری کرشن کی لیلا ہے۔ سری کرشن جی بچپن میں گیند کھیل رہے تھے۔ گیند سمندر میں جاگرا، ناگ دیو نے منھ میں لے لیا۔ سری کرشن جی نے اس کو پھانس لیا ہے۔ سمندر میں جاکر اس کے منھ سے گیند لا رہے ہیں۔ ناچنے والی نے بایاں ہاتھ کاندھے کی سیدھ پر پورا لانبا کیا۔ دوسرا ہاتھ بھی کاندھے کی سیدھ پر رہا مگر کہیں سے خم ہوکر پنجا سینے کے سامنے آگیا۔ بائیں ہاتھ کے پنجے نے سانپ کا پھن ثابت کیا۔ داہنے ہاتھ کی انگلیوں نے ٹھمکیاں دے کر یہ ظاہر کیا کہ جب سانپ پھنس گیا تو سری کرشن جی نے یوں ٹھمکیاں بتائیں۔ ناچنے والی پیش در پیش چال سے بتا رہی ہے کہ سانپ کی

گنڈیوں پر چڑھ کر سری کرشن یوں گیند سمندر سے لائے تھے ہاتھ کا پنجا ماتھے کے سامنے آ گیا۔ کلائی ماتھے سے چھوگئی، انگلیاں اوپر کو اٹھی رہیں ہتھیلی محفل کی طرف رہی، یہ کرشن جی کا مکٹ ہوگیا۔

اب مہادیو جی کا ناچ شروع ہوا۔ تیزی سے گھوم گھوم کر چاروں ہاتھوں سے دنیا بنا رہے ہیں۔ لالہ بنسی دھر اس طرح ارتھ بتاتے ہیں کہ ہر توڑے ہر پلٹے کے معنی آئینہ ہوتے جاتے ہیں۔ اے لیجیے پاربتی کے ناز و انداز شروع ہوئے ہر پہلو سے اپنے کو بچاتی ہیں ؎

وہ کیا کرے کہ محبت کا مقتضی ہے یہی
وگرنہ فائدہ اس کو مرے ستانے سے

لَے کی نزاکتوں، پرن کی مشکل جگہوں کی داد الگ دیتے چلے جاتے ہیں کہ سننے والوں کا لطف دوگنا ہوتا جاتا ہے۔ لیجیے صاحب اس کے بعد بھاؤ شروع ہوئے، وہ حنائی ناخون، ہونٹوں کی سرخی اور آنکھوں کے لال ڈوروں کی طرف اشارہ کرتی ہے۔ یہ مہجور کے خونین دل کا پتہ دیتے ہیں کہ خوشی کی خبریں بھی یوں رنج میں لہو کے آنسو رلاتی ہیں ؎

اپنی بپتا میں کاسے کہوں
تمرے کارن جو دکھ پاوا

کے معنی اب آئینہ ہوگئے۔ اس نے انگوٹھے کی آرسی دیکھی، زرد دوپٹے کا آنچل ہاتھ پر لیا کہ رنگ ایسا ہوگیا ہے۔ کلائی سے نیچے کو ادھر ادھر الٹے پلٹے دیے کہ رات کروٹیں بدلتے کٹی ہے پچھتاوے کے انداز سے داہنے ہاتھ کی ہتھیلی پر ٹھڈی جمائی۔ اس ہاتھ کی ہتھیلی کہنی کے نیچے رکھ کر خیالی زانو قائم کیا۔ انھوں نے انترے کے معنی ہویدا کردیے کہ:

''کدر پیا تمری کھتا (خطا) نا ہیں
مورا کیا مورے آگے آوا''

یوں ثابت کرتے ہیں خیال کو اور چوکھا بنانے کے لیے موقع کا شعر بھی پڑھ دیا:

ذرا اٹھاؤ تو نظر اداس کیوں ہو اس قدر
یہ خشک لب، یہ چشم تر، یہ کیا نصیب دشمناں

یہ حصہ تو لالہ بنسی دھر کا ہوا۔ اسی طرح بڑے چھوٹے صدر نشین، حاشیہ نشین، صف اول والے سب مل کر کلچر کا معیار مضبوط کرتے ہیں، یہ نہیں کہ ہر موقع دعوت پردہ دری دے اور بے پردگی خلوت و جلوت کا فرق مٹا دے۔ یہ تو باضابطہ صحبتوں کا حال ہوا۔ اب لالہ بنسی دھر کی پرائیویٹ تفریحوں کا حال سنیے۔ دن کو بڑا چوکور زمرد ہاتھ میں پہنے رہتے تھے۔ شام کو جب سیر کے لیے نکلتے تھے تو انیس بیس کیرٹ کا ہیرا انگلی میں اضافہ ہوتا تھا گلے میں سونے کی دو موٹی موٹی لڑیں ہوتی تھیں۔ عطر کے معاملہ میں ذری ٹکسالی گلاب کا قیمتی عطر ملتے تھے جس کی خوشبو سے نازک مزاجوں کو چھینکیں آنے لگتی تھیں۔ اتنی تمیزداری ضرور تھی کہ خس کا عطر صرف گرمیوں ہی میں لگاتے تھے، مگر اس کے آگے نفاست کا لحاظ کم رہ جاتا تھا۔ مثلاً کیوڑے کا عطر جو صرف آبدار خانے اور بھنڈی خانے میں کام آتا ہے سر کے تیل میں ڈال لیتے تھے۔ زنانہ مردانہ عطروں میں فرق نہیں کرتے تھے۔ پھولوں کے ہلکے عطر جیسے چنبیلی، جاڑوں میں بھی لگا لیتے تھے۔ جاڑوں کی عطریات مصالحہ والے جیسے حنا، شمامتہ العنبر گرمیوں میں استعمال کر جاتے تھے۔ مجموعوں کی نزاکتوں کا خیر کون ذکر، جنھیں مختلف عطروں کا خیال ہو اور پھر بھی تمیز نہ ہو سکے کہ بھینی بھینی ہلکی ہلکی خوشبو جنت سے آئی یا اسی دنیا میں پیدا ہوئی۔ جب بے فصل کی لپٹیں آتی تھیں تو نفیس مزاج کہہ اٹھتے تھے کہ ''بوئے کچوری می آید'' مہاجن آدمی تھے اس لیے دل کے معاملات میں بھی حدود کے باہر پاؤں نہیں پڑتا تھا۔ ایک دن بے تکلفی میں کہنے لگے کہ سال میں ہم سب سے پہلے تو وہ پونجی نکال لیتے ہیں جو کاروبار میں لگائی تھی۔ اس کے بعد خانہ داری کے اخراجات الگ کر لیتے ہیں۔ اس کے بعد منافع میں سے جس قدر مناسب ہوا پونجی میں اضافہ کرتے ہیں سب کے بعد کچھ روپیہ اپنے دل کی خوشی کے لیے علیحدہ کر لیتے ہیں۔ یہ روپیہ ہم بے دھڑک صرف کرتے ہیں اگر کوئی گومتی کے کنارے بیٹھ کر ہمارے ساتھ روپیہ پانی

میں پھینکیے اور یہ کھیل ہم کو پسند آجائے تو ہم اس میں بھی مقابلہ کرنے کو تیار ہیں۔ لیکن جب دل کی خوشی والا مال ختم ہو جائے گا تو ہم اٹھ کھڑے ہوں گے۔ پھر دل اور دل کے افکار کو خدا حافظ۔

ایک دادارہے، ''دل ایکے سے لاگے ہجاروں (ہزاروں) کھڑے'' لالہ آدمی وسیع الاخلاق ہے اس لیے گو منظور نظر ایک ہی رہتی تھی مگر خیر صلاً سب کی پوچھ آتے ہیں۔ شام سے لے کر دس بجے تک ؎

''رات ہی بھر گو رہے لیکن گلوں میں ہم رہے''

کا آوازہ بلند کیا کرتے تھے کسی سے تکلیف اور تہذیب کی ملاقات ہوتی تھی کسی سے خلوص اور بے تکلفی تھی۔ بعض سے مذاق اور کنایوں کی چوٹیں چلتی تھیں، کہیں کہیں ایک آدھ منچلی ایسی بھی ہوتی تھی جہاں غالبؔ مرحوم یاد آجاتے تھے ؎

دھول دھپا اس سراپا ناز کا شیوہ نہیں
ہم ہی کر بیٹھے تھے غالب پیش دستی ایک دن

لالہ جنسی دھر تھوڑے سے فلاسفر بھی تھے۔ جب دوستان ناصح ان کے پاؤں کے سنیچر اتارنے پر معترض ہو کر کہتے تھے کہ ''یک در گیر و محکم گیر'' خود کو پانی سے پتلا ہوا سے ہلکا نہ کریں اور ہر جگہ کی حاضر باشی سے باز آئیں تو یہ جواب دیتے تھے کہ جنسی تقاضے الگ چیز ہیں اور صنف نازک سے ہم کلامی اور ہم نشینی کی خواہش دوسری چیز ہے، لیکن جن ممالک میں، پردہ ہوتا ہے وہاں آدمی طے نہیں کرسکتا کہ کس قدر تقاضا آدمی میں پہلی بات کا ہے اور کس قدر دوسری بات کا اور انسان غلطی سے دوسرے تقاضے کو بھی پہلا تقاضہ ہی سمجھا کرتا ہے۔ اگر ملک میں پردہ نہ ہو تو دوسرا تقاضہ پورا ہوا کرے اور پہلا اپنے حدود سے باہر نہ جائے، بات سچے کی کہتے تھے مگر نصیحت کرنے والوں کی عقل ان باریکیوں تک کہاں پہنچتی ہے ؎

وہ بھلا کس کی بات مانے ہیں
ناصح صاحب تو کچھ دوانے ہیں

ناظرین لالہ بنسی دھر کی آوارہ گردی سے ان کی آبروریزی ہوئی اور ہمارے ناصح کی ''ح'' گر گئی تو کوئی ہرج نہیں۔ مطلب دونوں حالتوں میں نکل آیا۔

ایک دوست کے یہاں کوئی چھوٹی سی تقریب تھی، ناظرات لالہ بنسی دھر کے متعلق نہ ہوتی تو کس کے ہوتی۔ سب سے بہتر گانے والی، سب سے زیادہ شوخ طرار انتخاب کی گئی۔ جلسہ اور دعوت صرف ایک دن کی تھی۔ رات کا مجرا عام تھا۔ تقریب ختم ہوگئی۔ بھیرویں کا مجرا خاص تھا جس میں پانچ احباب تھے۔ اس سے بھی فرصت ہوئی، سازندے سلام کرکے باہر چلے گئے۔ نثر میں تغزل ہونے لگا۔ بڑی ستھری صحبت، بڑے مزے کی باتیں ہورہی تھیں کہ ایک سازندہ پریشان کمرے میں گھس آیا اور کہنے لگا کہ ایک کانسٹبل نے ہم کو خدا واسطے کو ایک تھپڑ مارا ہے۔ عورت کی موجودگی کی وجہ سے جتنے تھے سب کے دل میں صرف ہمدردی ہی نہیں بلکہ ایک طرح کا جوش پیدا ہوا مگر پڑھے لکھوں کا جلسہ تھا۔ پہلا جوش طرفۃ العین میں ختم ہوگیا۔ قانونی پہلو سب کے دل میں آیا کہ بغیر ہم لوگوں کا نام آئے کیا چارہ جوئی کی جاسکتی ہے۔ سب نے صاحب تقریب کا منھ دیکھا۔ رنڈی نے لالہ بنسی دھر کی طرف نظر کی۔ زبانِ حال سے کہنے لگی ''ہمارا آدمی ذلیل کیا گیا ہے اس کی تلافی کیا کی جائے گی'' ہم صاحب تقریب کو کیا جانیں، ہم تو تمھارے بلائے سے آئے تھے۔ ہر چیز کے ذمہ دار تم ہو، اٹھو اور کانسٹبل کو پھانسی پر چڑھا دو۔'' لالہ بنسی دھر نے سر نیچا کیا، ایک ذرا سے غور کے بعد نہایت سنجیدگی سے بہت نرم اور معاملہ فہمی کے لہجے میں سازندے سے مخاطب ہوئے۔

لالہ بنسی دھر: ''جاؤ اس کانسٹبل کے نام کا پتہ لگا آؤ۔''

رنڈی: ''آپ ہیں اچھے خاصے الو کے پٹھے۔ ہمارا آدمی تو مار گیا ہم ذلیل ہوئے اور تم بجائے اٹھ کر وہاں جانے کے نام کا پتہ لگاتے ہو'' گردن کو نیم حقارت، نیم طنز کا جھٹکا دے کر ''پتا آ آ لگا آؤ''۔

لالہ بنسی دھر: بی بی غصہ نہ کرو ہماری بات سنو، غصے سے کام بگڑتے ہیں، سنورتے نہیں۔

ہمارے ایک برادر ہیں، انھوں نے فلاں دیہاتی رئیس کو قرضہ دیا۔ ان کا نام تم

نے بھی سنا ہوگا۔ ان کی مونچھوں سے چنگاریاں اڑتی تھیں، بڑی دھاک بیٹھی تھی، پولیس ان کے دروازے جاتے ڈرتی تھی۔ نہ معلوم کتنے مقدمے فوجداری کے ان پر چلے مگر روپیہ کا زور اور ان کا خوف ایسا تھا کہ ثبوت کے گواہ کبھی نہ ملے۔ پڑھے لکھوں میں نہ سہی مگر یوں سب پر ان کا رعب تھا۔ سیکڑوں بدمعاش ان کی نگاہ دیکھتے تھے جو چاہا کر گزرے، جس کو چاہا پٹوا دیا، ہمارے برادران کے یہاں قرقی لے کر گئے۔ انھوں نے قرق امین کی خبر نقد سے لی اور ہمارے برادر کو صرف پٹوایا ہی نہیں بلکہ بری طرح ذلیل کیا مگر ہمارے برادر نے غصہ غضب بالکل نہیں کیا بلکہ اور زیادہ تابعدار ہو گئے اور بے دھڑک قرضہ اس طرح دینا شروع کر دیا جیسے کچھ ہوا ہی نہ تھا۔ آج اس کے گھر کی نیو کا ٹکا کھدوالیا۔ رئیس صاحب آج کوڑی کے نہیں، مارے مارے پھرتے ہیں۔ یہ کانسٹبل ٹکے کا آدمی کون چیز ہے، بس نام معلوم ہو جائے، ہم کل ہی سے دوستی کر کے سالے کو قرضہ دینا شروع کریں گے، تم اطمینان رکھو۔

○

گناہ کا خوف

(مؤلفہ)

محمد علی ردولوی

نیا سنسار لکھنؤ

فہرست

دیباچہ

میرے پڑھنے والے یا میری پڑھنے والی معلوم نہیں کہ آپ مجھ سے سن میں زیادہ ہیں یا کم حالانکہ آپ کا بڑا ہونا ذرا مشکل ہی معلوم ہوتا ہے۔ یہ بھی نہیں معلوم کہ آپ مرد ہیں یا عورت۔ بہرحال میری تسلیم یا دعا قبول فرمائیے۔ مجھ کو 57 برس کچھ مہینوں کی عمر میں یہ دریافت ہوا ہے کہ خلوص اور یگانگی پیدا کرنے کی سب سے بہتر ترکیب یہ ہے کہ دوسرے کے سامنے اپنا دل کھول کر رکھ دے اور اپنی نج کی زندگی کا حال بیان کرکے اس کے دل میں جگہ پیدا کرے۔ انانیت بری چیز ہے لیکن اگر اس سے کوئی مقصد پورا ہوتا ہوتو کیا پروا ہے۔ سنیے صاحب! مجھ کو بکنے کی عادت بہت ہے اس کی شروع کیوں کر ہوئی یہ بھی سن لیجیے۔

بچپن میں کالون کالج لکھنؤ میں پڑھتا تھا۔ ایک دن شام کے وقت فٹ بال ہورہا تھا، مزاج کی ناسازی کی وجہ سے میں شریک نہیں تھا۔ فیلڈ کے باہر پرنسپل صاحب کے ساتھ کھڑا تھا۔ دو ایک لڑکے اور بھی اسی طرح کھڑے تھے اتنے میں ایک راجہ صاحب ان سے ملنے آئے، پرنسپل صاحب نے مختلف چیزوں پر گفتگو شروع کی مگر راجہ صاحب نے ایک ''ہاں'' یا ''ناں'' میں ہر نئے موضوع کا گلا گھونٹ دیا۔ مثلاً پرنسپل صاحب نے مزاج پرسی کے بعد کہا آج موسم اچھا ہے۔ راجہ صاحب نے ایک زیرلبی ''ہوں'' میں بات ختم کردی۔ کچھ وقفے کے بعد پرنسپل صاحب نے کہا اب کی فصل میں آپ کے یہاں انبہ کیسا ہوا۔ راجہ صاحب ''معمولی'' لیجیے صاحب یہ بھی دفن ہوگیا۔ پھر کچھ دیر کے بعد کہا آپ کے مکان سے ریل کتنی دور ہے۔ راجہ صاحب ''تھوڑی دور'' اے لو یہ بھی گیا۔ پرنسپل صاحب ''فٹ بال کا کھیل بڑا مردانہ کھیل ہے'' راجہ صاحب 'جی ہاں'

انا للہ و انا الیہ راجعون۔

قصہ مختصر آدھ گھنٹے سے زیادہ تک یہی ہوا کیا کہ پرنسپل بے چارہ دماغ پر زور

دے کر نئی نئی باتیں شروع کرتا رہا۔ اور یہ صاحب ان کو ختم کرتے رہے۔ اس کے بعد راجہ صاحب رخصت ہوئے۔ ان کے جانے کے بعد پرنسپل صاحب ہم لوگوں کی طرف مخاطب ہوئے کہنے لگے لڑکو! تم نے راجہ صاحب کا انداز دیکھا۔ یقیناً یہ کوئی اچھے آدمی ہوں گے۔ مگر اس میں کلام نہیں کہ ان کے صفات کی فہرست میں علم مجلس کا وہ کمال نہیں لکھا جاسکتا جس میں لوگ بلا کسی اہم مسئلے پر گفتگو کیے ایک دوسرے کا دل بہلایا کرتے ہیں۔

اگر دو چار آدمی مل کر بیٹھتے ہیں تو چپ پیر کا روزہ رکھ کر نہیں بیٹھتے۔ ہمارے استاد کی اس تعلیم کا اثر حضرت عیسیٰؑ کے اس وعظ کی طرح جو پہاڑ پر دیا گیا تھا۔ مختلف لوگوں پر مختلف ہوا۔

مگر ہمارے معاملے میں تو غضب ہی ہوگیا۔ یعنی اسی وقت سے یہ کوشش شروع ہوئی کہ کسی صحبت میں اگر بیٹھو تو منھ میں دہی جما کر نہ بیٹھو۔ ہوتے ہوتے اس عادت نے عارضے کی صورت پکڑ لی اور تقریر سے ترقی کر کے تحریر تک پہنچ گئی۔ ان کہانیوں میں آپ غور کریں گے تو ظاہر ہوجائے گا کہ ذرا سا موضوع اور بڑی سی تمہید صرف اسی واسطے ہے کہ آپ سے تخاطب رہے ایک مرتبہ میرے ایک مکالمہ کے اوپر ایک بے تکلف دوست نے تنقید کی تھی۔ ''تم نے اس کے لکھنے میں کمال ہی کیا کیا ہے جو باتیں کرتے رہتے ہو وہی تم نے قلم بند کردی ہیں۔'' ان چند کہانیوں کے بارے میں بھی دو حرف معذرت کے سن لیجیے۔ حضرت میں بوڑھا آدمی ہوں جوانوں کی ایسی باتیں نہیں لکھ سکتا۔ گھر اور کلب کی صحبتیں پڑھ کر میرے ایک بڑے لائق فائق دوست نے ایسی پرکھ دکھائی کہ میری آنکھیں کھل گئیں۔

ان صاحب سے مجھ سے ایک کلب میں ملاقات ہوئی۔ شام کا وقت تھا شراب کی برکت سے تصنع کے پردے اٹھ گئے تھے اور صداقت کا دربار کھل چکا تھا کہنے لگے تم صرف بورژوا قسم کی کہانیاں لکھ سکتے ہو۔ پرولیٹیرین ازم کی ہوا بھی تم کو نہیں لگی ہے۔ اگر ان کی طرح میں بھی پیے ہوتا تو یقین جانیے یہ سچی تنقید سن کر میرا نشہ ہرن ہوجاتا مگر بدقسمتی سے ایسا نہیں تھا۔ اس لیے فوراً حافظ علیہ الرحمہ یاد آگئے۔ جنھوں نے فرمایا ہے ؎

فقیہ مدرسہ دی مست بود و فتویٰ داد
کہ مے حرام ولے بہ زمالِ اوقاف است

''یعنی شراب ہی وہ چیز ہے جس کو پی کر آدمی جھوٹ بولنے کی قابلیت کھو بیٹھتا ہے''۔

احمد علی صاحب مصنف ''شعلے'' اور حیات اللہ صاحب انصاری مصنف ''انوکھی مصیبت'' کا جوان خون کہاں سے لاؤں۔ تازہ افکار دماغ کہاں سے پاؤں ناچار جو کچھ میسر ہے وہی پیش کرتا ہوں۔ میری بعض کہانیاں ایسی ہیں کہ لوگ عورتوں کو پڑھنے سے روکیں گے اور بچوں سے کتاب چھین کر رکھ دیں گے۔ واقعی اس طرح کی باتوں سے جہاں تک ممکن ہو، معصوم دماغ کیوں نہ بچائے جائیں۔ ''جہل شئے بہتر از علم شئِ'' مگر دھڑکا ہے کہ اگر یہ کتاب گھر میں رہی تو جن لوگوں کو اس سے دور رکھنا چاہتے ہیں وہ کبھی نہ کبھی اس کے پڑھنے کا موقع نکال ہی لیں گے۔ گزشتہ زمانے میں یہ خیال کیا جاتا تھا کہ شاعری ہو مصوری ہو یا فنون لطیفہ کا کوئی اور شعبہ ہو کوشش یہ ہونا چاہیے کہ فطرت کی پیروی کی جائے اور اسی کے ساتھ یہ بھی خیال تھا کہ کسی چیز کی پوری نقل اتار لینا اس قدر مشکل ہے کہ بہتر سے بہتر کمال دکھانے کے بعد بھی ترقی کی گنجائش باقی رہتی ہے آج یہ نظریہ ہے کہ نقل اتارنے میں جو زحمت ہے اس میں آدمی کیوں سر کھپائے یہ کیوں نہ کرے کہ بلا نیچر کی پیروی کے خوبصورتی پیدا کرنے کی کوشش کرے۔ مثال کے طور پر عرض کروں ماں اور بچے کی تصویریں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے واقعہ کی وجہ سے ہر جگہ دیکھی جاتی ہیں اور ایسی تصویریں تاریخ کے سیکڑوں مصوروں کی مایہ ناز ہیں آج بھی اس موضوع کی تصویریں کھینچی جاتی ہیں مگر یہ کوشش نہیں کی جاتی کہ جیسی ماں ہم دنیا میں ہر وقت اور جگہ دیکھتے ہیں ویسی ہی ماں کا نقشہ کاغذ پر اتارا جائے یعنی اگر ضرورت ہو تو وہی ماں فلم میں بھی ماں کا روپ دکھانے کے لیے بلا بھیجی جائے۔ بجائے اس کے آج کا تصویر بنانے والا ماں کی صرف خاص خاص باتیں دکھا دیتا ہے اور باقی کی پروا نہیں کرتا۔ یعنی فرض کیجیے ایک ماں بچے کو دودھ پلا رہی ہے

آج کا مصور اس کے اعضا خوبصورت بنانے کی کوشش نہیں کرے گا بلکہ اس کا جھک کر بچے کو دیکھا کھینچ دے گا جس میں پیٹھ کی گولائی کا خط نگاہ کو لبھائے گا۔ بچہ دودھ پیتا جاتا ہے اور ماں کو دیکھتا جاتا ہے۔ یہ بھی دکھا دے گا۔ اس کی پروا نہ کرے گا کہ بچہ یا ماں خوبصورت بنے یا نہیں۔ ڈاکٹر رابندر ناتھ ٹیگور کو بڑھاپے میں تصویر کھینچنے کی سوجھی وہ تصویریں کھینچی ہیں کہ آدمی اندھیرے میں دیکھے تو ڈر جائے۔ مگر جو بات دکھانے یا بتانے کی تھی وہ پوری طور سے کاغذ پر آگئی ہے اور شاعری کی بادشاہی کے ساتھ مصوری کے مقبوضات پر بھی تسلط ہوگیا ہے۔

ان دو چار کہانیوں میں برخلاف اس نئے طرز کے وہی پرانا رویہ برقرار رکھا گیا ہے یعنی جہاں تک ممکن ہو نیچر کی پیروی رہے چھوٹا دماغ بڑا تخیل نہیں پیدا کرسکتا ۔

کافر نہ توانی شد ناچار مسلماں شو　اور　عصمت بی بی از بے چادری

میں نے بھی وہی پرانا طرز اختیار کیا ہے۔ نئی بات نہ سہی خدا کرے قدیم ہی ڈھرّے پر چلتے بن گیا ہو بعض کہانیاں ''ہندستان'' اور ''نیا ادب'' میں چھپ چکی ہیں، اس مجموعے میں وہ ایڈیٹر صاحبان متذکرہ بالا کی اجازت سے چھپ رہی ہیں۔ دونوں حضرات میرا شکریہ قبول فرمائیں۔ بعض ہیں جو پہلے پہل گھر سے باہر قدم نکال رہی ہیں خدا ان سب کا نگہبان رہے۔ دوسرا جزو اس مجموعے میں ''امامن مہری کے فلسفیانہ خیالات'' ہیں۔ ایڈیٹر اودھ پنچ مرحوم نے ان مضامین پر کہا تھا کہ تو نے ایک نئی چیز لکھی ہے جس میں کسی اور کا حصہ نہیں ہے۔ محلات کی زبان اور جُہلا کی زبان مل کر ایک تیسری چیز پیدا ہوتی ہے جو محلوں کے لواحق تک ختم ہے۔ خیر نئی چیز تو کیا ہے کیونکہ ان مضامین کے لکھنے کا خیال میرے دل میں Barry Pain کی ایک کتاب سے پیدا ہوا تھا۔

مگر جس انداز سے میں نے اس کو نقش اول سے علیحدہ کیا ہے اس پر داد طلب ہوں۔

امامن مہری والے مضامین اودھ پنچ میں چھپے تھے۔ ''آں دفتر را گاؤ خورد و گاؤ را

قصاب برد و قصاب در راہ مرد'' کس کا شکریہ ادا کیا جائے اور کس سے اجازت لی جائے۔ حکیم ممتاز حسین عثمانی مرحوم و مغفور نے اودھ پنچ متوفی کی کشتی ناقدردانی کے سمندر میں برسوں چلائی بادبان پھٹے پتوار ٹوٹا اخبار کی کشتی ڈگ مگ رہی۔ مگر اس مرحوم نے ملاحی کی بہترین روایات کو برقرار رکھا اور نہ معلوم کتنے جواہرات ملک کے ساحل پر لا کر ڈھیر کر دیے اور اس کے بعد ایک جانباز جہازراں کی طرح اپنی کشتی سمیت تہہ میں بیٹھ گیا ملک نے قدر کی ہو یا نہ کی ہو خدا مرحوم کو اس کا اجر دے۔

(مصنف)

امیری کی بو

انگریزوں کے راج کے پہلے علاوہ شہر اور گاؤں کے قصبات کی بھی ضرورت تھی، دارالسلطنت یا ایسے بڑے بڑے مقامات کی زندگی جہاں درباری امراء صوبہ دار وغیرہ رہتے ہوں، بہترین قسم کے لوگوں کو پیدا کرنے کے مناسب نہیں ہوتی تھی کیونکہ دولت کے عیوب نسل اور تربیت دونوں کے دشمن تھے، عیش پسندی اور حکومت پر شرافت اور عمدہ تربیت سب قربان ہوجاتی تھیں، دربار کی چال بازیوں اور ریشہ دوانیوں کی وجہ سے نہ خاندانی روایات باقی رہتی تھیں اور نہ ایمانداری اور راست بازی۔ بڑے بڑے مدرسے تو تھے نہیں جہاں بورڈنگ ہاؤس میں سب کو ایک طرح رکھا جائے۔ ہر گھر کی تربیت الگ تھی، اور وہ شہر میں آکر خاک میں مل جاتی تھی۔

دیہات میں لوگ اپنی کھیتی باڑی کے مشاغل میں پھنسے رہتے تھے، وہاں کی بھی آب و ہوا علمی ترقی اور دماغی ارتقاء کے خلاف پڑتی تھی۔ اسی وجہ سے زمانے نے قصبات کو پیدا کردیا تھا۔ ان کے وجود میں لانے کے لیے کسی بڑے عالی دماغ نے پہلے سے کوئی نظریہ نہیں قائم کیا تھا، بلکہ ضرورت کے موافق بلا کسی کوشش کے قصبات خودبخود پیدا ہوتے گئے۔ یہاں کی سرزمین عمدہ لوگوں کو پیدا کرنے کے مناسب تھی۔ درباری خوشامد، محلات کی بے عنوانیاں، عمال کی ترکیبیں، امراء کی سیاسی چالیں، عہدے داروں کی آپس کی اکھاڑ پچھاڑ، شاہزادوں کی اکثر حد سے گزری ہوئی طرز زندگی سب سے پناہ تھی۔ نسل، علم، تندرستی، عالی دماغی، اصولِ اخلاق کی پابندی، ان سب کے لیے یہیں کی سرزمین مناسب ٹھہری تھی۔ شہروں میں یہیں کے لوگ جاکر بادشاہ کو بادشاہی اور وزیروں کو وزارت سکھاتے تھے اور خود بھی وہیں دولت کے استھان پر بھینٹ چڑھ جاتے تھے۔ ایک دو پشتوں تک کچھ خصوصیتیں باقی رہتی تھیں، اس کے بعد نمک کی کان میں پہنچ کر یہ بھی نمک ہوجاتے اور قصبات سے نیا دستہ تیار ہوکر پہنچ جاتا تھا۔ ہندستان

میں مسلمانوں کی تاریخ اٹھا کر دیکھ لیجیے، شہر کا ہر بڑا خاندان کسی نہ کسی قصبہ کے سلسلہ پر فخر کرتا ہے۔ بوڑھوں کو مر جانے کا عارضہ ہے جوانوں کو فرصت نہیں، بچوں کو معلوم نہیں، ورنہ آپ دیکھتے کہ ہر شخص اسی پر ناز کرتا کہ ہم قصبات کی پود ہیں۔ اس کے ساتھ یہ بھی دیکھا گیا ہے کہ جب کسی چیز کی ضرورت نہیں رہتی تو صرف یہی نہیں کہ وہ گھٹ کر اپنی قدیمی حالت پر پہنچ جائے بلکہ پھر وہ تحت الثریٰ ہی کی خبر لاتی ہے اور اس کی تباہی اور خرابی کی کوئی انتہا نہیں رہ جاتی۔ دولت جانے کے بعد بھیک مانگنے کی عادت ہوجاتی ہے۔ علم کی جگہ ہٹ دھرمی لے لیتی ہے، اعتقاد کی جگہ وہم پرستی کو ملتی ہے، راست بازی دھوکا دھڑی سے بدل جاتی ہے۔ عالی ہمتی بودے پن کا جامہ قبول کرلیتی ہے۔ شیریں بیانی کج بحثی کے سامنے دم بخود رہ جاتی ہے اور بڑے بڑے قاضیوں کی نسل میں صرف کرایہ کے گواہ رہ جاتے ہیں۔ پھر یہی آخری سلاطین ترکی کی طرح کچھ باتیں گزشتہ عروج کا پتہ بتانے کو رہ جاتی ہیں۔ حمیدہ بانو بیگم صاحبہ اسی کایا پلٹ کا اگر تمام باتوں میں نہیں تو بعض باتوں میں نمونہ تھیں ان کے والد بگڑے رؤسا میں تھے۔ بڑی جائداد کے مالک تھے۔ حسب نسب میں کوئی دوسرا خاندان ان کا مقابل نہ تھا ان کی شیریں بیانی نرم کلامی پر شرافت کا سکہ بیٹھا تھا۔ داد و دہش کا یہ عالم تھا کہ جو چھو گیا پارس ہوگیا۔ خود تباہ ہوگئے، مگر ان کے لواحقین آج تک دو ایک کو روٹی دے کر کھاتے تھے۔ ہائے دولت والے دولت بھاڑ میں جائے دولت، اگر یہ کم بخت پہلے ہی ان کے دامن سے نہ چمٹتی یا بعد ہی کو ان سے منہ نہ موڑ لیتی تو یہ کہانی کہاں سے لکھی جاتی۔ ہمیشہ کہا کرتے تھے اوہ جی ہمارا قورمہ کا پیالہ کہاں گیا ہے۔ ایک لڑکی ہے گو قسمت کی پھوٹی نکلی مگر اس کی بھی کٹ جائے گی، اس کی والدہ کے پاس ان لٹے حالوں پر بھی اتنا زیور ہے کہ پشت دو پشت آرام سے کٹ ہی جائے گی، ہم بوڑھی بوڑھے کو کرنا ہی کیا ہے، کوئی اولاد نرینہ بھی نہیں ہے جو جائداد بچانے کا خیال ہو۔

واقعی سچ کہتے تھے۔ ان کی تو اسی شان سے کٹ گئی مگر ادھر ان کی آنکھیں بند ہوئیں اور ادھر گھر میں جھاڑو پھر گئی۔ محل سرا تک مہاجنوں نے بکوالی۔ اینٹ سے اینٹ بج گئی۔ نیو کا تنکا کھد گیا۔ حمیدہ بانو بیگم صاحبہ قریب ہی ایک ٹوٹے مکان میں رہنے لگیں۔ اثاثہ زیور بھی جو سنا جاتا تھا کچھ بھی نہ نکلا۔ یہ پرانی باتیں ہیں جو بیان کردی

گئیں ورنہ قصہ تو اس کے برسوں بعد سے شروع ہوتا ہے۔ ہم کو اپنے ناظرین سے معافی مانگنا ہے کہ اس قصہ کی ہیروئن خلاف امید اور خلاف روایات قصہ نویسی کوئی پچاس پچپن برس کی عورت ہے۔ گو قصہ میں حمیدہ بانو بیگم صاحبہ کی صاحبزادی بھی موجود ہیں جو ہر طرح اس قابل ہیں کہ بہتر سے بہتر رومان نویسی کی داستان میں ممتاز جگہ پاویں مگر ان کی کہانی ہم کو لکھنا نہیں۔ ہم کو تو ان بڑی بی سے کام ہے جن کی زندگی لاڈ پیار میں ماں باپ نے تباہ کی۔ جب یہ کنواری تھیں تو بڑی بڑی جگہوں سے پیام آئے، مگر ان کے والد نے ہر نسبت کو حقارت ہی سے دیکھا۔ ان کو اپنے نسب کا کوئی دکھائی نہ دیا۔ وجہ اس کی یہ بھی تھی کہ کھلونے کھیلنے کا شوق ہر سن میں باقی رہتا ہے، کم سنی میں بے جان کھلونے، آگے چل کر جیتے جاگتے کھلونوں سے دل بہلتا ہے۔ آپ نے دیکھا نہیں ہے کہ بچہ کھلانے میں بوڑھے بھی بچوں کی ایسی باتیں کرنے لگتے ہیں۔ بہرحال حمیدہ بانو بیگم صاحبہ کی شادی اک غریب آدمی کے لڑکے کے ساتھ اس حکمت سے ہوئی تھی کہ ماں باپ کے جیتے جی لڑکی نگاہ کے آگے رہے گی۔ یہاں خیالات کی تکل آسمان پر تھی۔ غریب آدمی کی محبت بغیر تحفے تحائف کا پیار کیا دل پر بیٹھتا بعض امیروں کے گھروں کا یہ بھی قاعدہ ہے کہ داماد غیر سمجھا جاتا ہے اور نوکر چاکر لواحقین جو محل سرا میں رہتے ہیں داماد کے خلاف ایک چھپی ہوئی سازش کر لیتے ہیں جس کی خبر مردانے میں پہنچے یا نہ پہنچے لڑکی کی والدہ کو ضرور ہوتی ہے اور اگر وہ خود حصہ نہ بھی لیں تو بھی جائز رکھتی ہیں۔ یہاں سونے میں سہاگا یہ ہوا کہ داماد صاحب کو پائیریا تھا۔ فی سیکڑہ پچاس آدمیوں کو پائیریا ہوتا ہے مگر بات کا بتنگڑ بنانے کو کافی ہوگیا۔ اور محل سرا میں سرگوشیاں شروع ہوئیں کہ دولہا میاں کے منھ سے بو آتی ہے گو کہ شوہر صاحب دانتوں کی خبر اچھی خاصی لیے رہتے تھے اور زیادہ تر اسی وجہ سے یہ بات لوگوں کو معلوم بھی ہوئی تھی مگر میاں بی بی کا سلوک بگڑنے لگا۔ خیر پائیریا بیچاری تو بدنام ہوئی شوہر صاحب کے دل سے اتر جانے کی اصل وجہ تو یہ ہوئی کہ ان کے ہونٹ ضرورت سے زیادہ موٹے تھے۔ اس پر غضب یہ ہوا کہ گھینگا نکلنا شروع ہوا۔ اسی وجہ سے یا قدرتاً آواز بھی خوش آئند نہ تھی۔ معلوم ہوتا تھا حلق سے بولتے ہیں۔ بہرحال نتیجہ یہ ہوا کہ صاحبزادی صاحبہ کوٹھے پر کم جانے لگیں اور اگر جاتی بھی تھیں تو جلد واپس آجاتی

تھیں۔ رفتہ رفتہ بات اس قدر بڑھی کہ شوہر صاحب اپنا بوریہ بستر باندھ کر چل دیے۔ اب کیا تھا صاحبزادی مستغیثہ ہوگئیں اور شوہر صاحب ملزم قرار پا گئے اور گھر بھر کے آدمی اندر باہر باری باری مستغیثہ کے گواہ اور مستغیثہ کے مختار بن گئے۔ ملزم مفرور کی وکالت کون کرتا جب تک ماں باپ جیے آئند و روند اعزاء اقربا نوکر چاکروں سے داماد کی بے وفائی لڑکی کی بدقسمتی کا ذکر مختلف عنوان سے ہوتا رہا اور ان سے ہمدردی کا خراج وصول ہوا کیا۔

جب بڈھی بڈھے کی آنکھ بند ہوگئی تو آسمان ٹوٹ پڑا۔ ہمدردی کیسی نان شبینہ کے لالے پڑ گئے۔ حمیدہ بانو بیگم صاحبہ سے نہ صرف مکان چھوٹا نہ فقط اثاثہ چھن گیا، نہ یہ کہ نوکر چاکر بھی چلتے پھرتے نظر آئے بلکہ رفتہ رفتہ سلائی پر بسر ہونے لگی۔ پہلے چکن کی ٹوپیاں کاڑھا کیں۔ کبھی کبھی اگر کسی نے کہا تو کٹاؤ کا انگرکھا بھی بنا دیتی تھیں۔ کچھ دنوں بعد جب ان چیزوں کا رواج بھی نئے فیشن نے مٹا دیا تو ایسی عورتوں کے موٹے جھوٹے کپڑے سینے لگیں جن کو یا تو خود سی نہیں آتا تھا یا گھر کے کاروبار اور روزگار کی ضرورتوں سے فرصت نہ پاتی تھیں اور اس طبقے کی تھیں جنھوں نے درزی کو پوری سلائی دے کر سِلوانے کا خواب بھی نہیں دیکھا تھا۔ گھوسنوں، کنڈے والیوں کی ٹول کی چشک لگی نیلی کرتیاں جن میں موٹے موٹے سفید چھپے ٹکے ہوتے ہیں چھوٹی قوموں کے بیاہ کے لہنگے، نینوں کے دوپٹے جن میں لال، سبز چوڑی چوڑی پڑاتے کی گوٹ لگی ہوتی ہے تیار کر دیتی تھیں۔ لہنگے کی گوٹ ٹکڑی کی ہر عورت نہیں جوڑ سکتی ہے۔ ذرا سی غلطی کاٹ چھانٹ میں ہوئی اور گوٹ اینٹھ گئی، چشک لگانے میں ذرا سی چٹکی ڈھیلی ہوئی اور گھمر وا لہنگا ایک طرف سے اونچا ایک طرف سے نیچا ہوگیا۔ اسی قسم کی سلائی تھی جو ان کو ملتی تھی۔ ایک اور مشکل آن پڑی تھی۔ کٹاؤ اور چکن کا کام تو ایسا تھا کہ کھلے خزانے کیا جاسکتا تھا۔ اگر اڑوس پڑوس کی کوئی عورت آبھی گئی تو کوئی حرج نہیں یہ اپنے کام میں لگی رہتی تھیں، کیونکہ یہ تو شریف زادیوں کا ہنر ہی تھا۔ گھوسنوں وغیرہ کے کپڑے سب کے سامنے سی نہیں سکتی تھیں، دروازے میں کنڈی دے کر سینے بیٹھتی تھیں اور اگر مہترانی بھی آگئی تو جلدی جلدی سمیٹ کر ان کپڑوں کو چھپا دیا، تب دروازہ کھولا۔ جمعرات کے فاتحہ کا کھانا یا اور صدقے کی چیزیں بھی لے لیتی تھیں مگر بہت

چھپا کر اور وہ بھی خاص خاص گھروں کی جن کو جانتی تھیں کہ دم بھی نکل جائے گا تو بھی منھ سے نہ نکالیں گے کہ ہم نے حمیدہ بانو بیگم صاحبہ کے ساتھ یہ مراعت کی ہے۔

لکھنے والا اس جگہ ایک مشکل میں پڑ گیا ہے مثل ہے ''جھوٹے کے آگے سچا رو مرے'' اگر سچ سچ لکھتے ہیں تو بات قرین قیاس نہیں رہی جاتی اور اگر اپنے دل سے گڑھ کر بناتے ہیں تو ڈر معلوم ہوتا ہے کہ کہانی نہ بگڑ جائے۔ تن بہ تقدیر ہم وہی لکھیں گے جو ہمارے تجربہ میں آیا ہے۔ کوئی یقین مانے یا نہ مانے۔ واقعہ یہ ہے کہ خیرات کے کھانے سے بھی حمیدہ بیگم صاحبہ جب تک، کسی غریب کو دے نہ لیتی تھیں خود نہ کھا سکتی تھیں۔ یہی وجہ تھی کہ باوجود غریبی کی فلاکت کے اردگرد کی غریب عورتیں ان کی گزشتہ ثروت کو بھولی نہیں تھیں۔ محترفہ کی عورتیں اسی طرح دباؤ مانتی تھیں اور ان کا کام کرنے کو تیار رہتی تھیں۔ برادری کی خوش حال عورتوں پر بھی ان کا رعب تھا اور کسی کی جرأت نہیں ہوتی تھی کہ ان کو کم نگاہی سے دیکھے۔ اس کی ممکن ہے ایک چھوٹی سی وجہ اور بھی رہی ہو وہ یہ کہ حمیدہ بانو ذرا کیا زبان کی اچھی خاصی سخت تھیں، برادری کی شادی غمی کی محفلوں میں ان کے اوپر قیمتی پوشاک یا سچے جڑاؤ کے زیور کا اثر بالکل نہیں ہوتا تھا اور برادری میں جو جگہ ان کی ہمیشہ سے تھی وہ آج بھی باقی تھی چاہے گھر میں فاقہ ہو (اور اس کی نوبت اکثر آجاتی تھی) مگر عزیزانہ برتاؤ میں کبھی فرق نہیں آنے دیتی تھیں۔ شادی بیاہ میں نیوتہ ڈالی ان کے گھر سے دوسروں سے پہلے پہنچتی تھی۔ چھٹی میں بچے کے کپڑے ان کے گھر سے ایسے آتے تھے کہ ہر عورت کی نگاہ ان پر پڑتی تھی۔ نئی نویلی دلہن کو دودھ ملیدہ سب سے پہلے بھیجتی تھیں اور ان سب باتوں کے بعد ایک ایثار ایسا تھا جو ہر شخص میں نہیں ہوتا، یعنی برادری میں کسی کے یہاں کوئی تقریب ہو تو تمام کام یہ اپنے ذمے لے لیتی تھیں۔ کھانا نکلوانا، جوڑے لگانا، دلہن کا زیور درست کرنا، رسوم کی ادائیگی میں فرق نہ آنے دینا ان کے حصہ کی چیزیں تھیں۔ غمی کے موقع پر مراسم سے واقف کاری کے علاوہ بین ایسے کرتی تھیں کہ بڑے سے بڑا غم نویس شاعر دنگ رہ جائیے، بہت دن ہوئے رانڈ ہوچکی تھیں مگر شوہر کے بین کرنا شرم کی بات تھی بوڑھی ہوگئی تھیں، مگر منھ ڈھانپنے میں جنسی جذبات کی چھاؤں بھی آجائے یہ شریف زادیوں کا شیوہ نہیں۔ ہمیشہ باپ کے بین کرتی تھیں۔ ادھر انھوں نے آنچل

مُنہ پر لے کر کہا ''لکھیا بابا فقیرن بیٹی تمھاری راہ پر سے صدقے ہوتی'' اور ادھر محفل میں کوک پڑ گئی۔ آواز کی نرمی الفاظ کی مناسبت، کم سن منھ چھڑانے والیوں کا یہ حال ہوتا تھا کہ آنسوؤں سے خود منھ دھوتی تھیں مگر دل یہی چاہتا تھا کہ ابھی اور سُن لیں تو کلائی پر ہاتھ رکھیں۔

حمیدہ بانو بیگم اگر اپنا ماٹو یا نقش نگیں بنواتیں تو یقیناً وہ رکھ پت رکھاپت ہوتا'' ہر شخص سے صاف دل سے ملتی تھیں لیکن اسی کے ساتھ کسی نئی دولت والی نے اگر ان کے حفظ مراتب میں ذرا سی بھی کمی کی تو اللہ دے اور بندہ لے۔ بھری محفل میں وہ کھری کھری سناتی تھیں کہ کم سن مغرور لڑکیوں کے ہمیشہ کے لیے کان ہوجاتے تھے۔ سات پشتوں کا شجرہ بیان کردیتی تھیں۔ جو جونسبی خامیاں ہوتی تھیں ان کو ایک ایک کرکے کھول دیتی تھیں اور فوراً اٹھ کر اپنے گھر چلی آتی تھیں۔ لوگ خوشامدیں کرتے رہ جاتے تھے مگر یہ غنیم کو شکست دینے کے بعد پھر وہاں نہ رکتی تھیں اور چلتے چلاتے آخری باڑھ جو دشمن کو پامال کردیتی تھی اکثر یہ ہوتی تھی ؎

پھٹے کپڑوں میں خنداں مثل گل ہوں
شرافت کیا بہار بے خزاں ہے

شہروں میں یہ رسم اس حد تک نہیں رہ گئی ہے مگر قصبات میں ابھی تک خدمتی قومیں، مثل نائی، دھوبی، درزی وغیرہ کے جو پشتوں سے خاندان میں لگے چلے آتے ہیں۔ روزمرہ کی خدمات اپنا فرض سمجھ کر بجا لاتے ہیں اور شادی یا دوسرے خوشی کے موقعوں پر جوڑے باگے نقد و جنس پانا اپنا حق سمجھتے ہیں اور لڑ کر لیتے ہیں۔ ایسے موقعوں پر ان کا دعویٰ مسکرا کر تسلیم کیا جاتا ہے اور کوشش یہ ہوتی ہے کہ وہ خوش ہوجائیں۔ جس گھر سے جیسا ملتا ہے ویسا ہی کام بھی لیا جاتا ہے اور سیکڑوں برس کی مشق سے کچھ ایسا انتظام بن گیا ہے کہ ''پرجوں'' اور ''ججمانوں'' کے درمیان میں حقوق در فرائض میں کبھی اختلاف ہوتے دیکھا نہیں۔

ایک روز کسی عزیز کے یہاں کچھ نذر نیاز کی مٹھائی بھیجنی تھی۔ حمیدہ بانو بیگم صاحبہ نے پڑوس کی کسی باہر نکلنے والی عورت کے ذریعہ سے نائن کو بلوا بھیجا وہ آئی تو مگر دیر

میں حمیدہ بیگم صاحبہ کے غصے کا پارہ پانی ابلنے کا درجہ طے کر چکا تھا۔ صورت دیکھتے ہی برس پڑیں۔ خدا کی شان اب پرجوں کے بھی یہ دماغ ہوگیا کہ بلاؤ تو آتے نہیں۔ موئی چڑیلوں کے جہاں ہاتھ گلے میں دو چیزیں ہوگئیں بس اپنے آپے سے باہر ہوگئیں۔ فرعون کی بچیاں اپنے کو سمجھنے لگیں۔ ہزار غریب ہوگئے ہیں مگر تم کو دینے بھر کو اب بھی ہیں۔ بس ہم کو تم سے کام ہی لینا منظور نہیں ہم دوسری لگا لیں گے۔ موئی کمینیوں کے بھی یہ مزاج ہوگئے۔ اللہ کی شان ہے۔

نائن: ''میری مجال پڑی ہے کہ آپ بلاویں اور میں نہ آؤں، آپ کے گھر سے یہ ہڈیاں پلی ہیں، بڑے میاں کی دی ہوئی بارہ بیگھے معافی آج تک کھا رہے ہیں اور دعائیں دیتے ہیں۔ آپ کے دشمن غریب ہوں، آج بھی آپ ہی کے یہاں سے پیٹ پلتا ہے، تن ڈھکتا ہے، دیر اس وجہ سے ہوگئی کہ دوپٹہ چیتھڑا ہوگیا تھا، ایسا بھی نہیں رہ گیا تھا کہ سر پر ڈال کر باہر نکلتی، غریبی کا معاملہ، بیگم صاحبہ آپ سے کیا چھپا ہے، میں نے کہا لاؤ جلدی جلدی سی لوں تو نکلوں، اسی میں دیر ہوگئی۔ دیکھیے نا اتنا گانٹھا ہے کہ پتلا ہوگیا ہے ایک پٹی الگ ہی ہوگئی موا جو سر ڈھانکو تو کمر کھلتی ہے۔ کمر ڈھانکو تو سر ننگا ہوا جاتا ہے۔''

حمیدہ بیگم: تو یہ کہو نا لو دوپٹہ ہم دیتے ہیں۔ بیٹی سعیدہ اپنا دوپٹہ ہم کو دو اور تم کامدانی والا دوپٹہ نکال کر اوڑھ لو۔ سفید دوپٹہ تم پر اچھا نہیں لگتا۔ بے چاری تمھارے ہاتھ کی دیکھنے والی تم نہ دوگی تو ان غریبوں کو کہاں سے ملے گا، لو ابھی یہ دوپٹہ دیتی ہوں ابھی ایک ہی دھوب پڑا ہے تمھارے بہت دن چلے گا اور ہاں بیٹی وہ کمخواب والا جُھٹکا خوان پوش بھی نکالتی لانا جس میں ماہی پشت کی گوٹ لگی ہے، میلا خوان پوش ڈال کر لے جائے گی تو جو دیکھے گا کیا کہے گا۔

نائن ادھر نکلی ادھر بیٹی نے کہا اماں دوپٹہ آپ نے دے دیا، کامدانی کا دوپٹہ اوڑھ ڈالیں گے تو پوت کے پیجامے پر کیا اوڑھیں گے اب کہاں سے آئے گا۔

ماں: ہوگا، صدقہ کیا، کون چیز ہے خدا اور دے گا بیٹی کوئی ضرورت تمھاری کبھی پڑی رہی ہے؟ سب ہوجائے گا۔ ادھر جیسے ہی کچھ ہاتھ چڑھا سب سے پہلے تار منگوا

لیں گے، چار دن کی محنت میں تو دوپٹہ تیار ہوتا ہے، تم کڑھتی کاہے کو ہو، میں تو کہتی ہوں دوسرا دوپٹہ بن جائے گا۔ تم اس کو اوڑھ ڈالو ہائے بٹیا تم نے دیکھا ہی کیا ہے ایسے ایسے دوپٹہ تو ہم دے دیا کرتے تھے۔ خیر ہوگا وہ بھی زمانہ تھا یہ بھی زمانہ ہے۔ مگر کیا ہمارے دن پھریں گے ہی نہیں بارہ برس کے بعد تو گھورے کے دن بھی پھرتے ہیں اور دے نہ دیتی تو کرتی کیا دیکھتی نہیں تھیں، بیچاری ننگی تھی، نہ تمھاری نوکر، نہ چاکر مگر ہر وقت ہاتھ باندھے کھڑی رہتی ہے، بٹیا سن لو یہ ہی دینا ساتھ جائے گا اور کچھ نہیں۔

صبح کا وقت ہے، ماں بیٹیاں نماز سے فارغ ہوکر بیٹھی ہیں گھر میں اتنا پیسہ نہیں جو چائے بنے۔ اسی وجہ سے باہر کا دروازہ ابھی نہیں کھلا ہے کہ چائے کا وقت نکل جائے تو دروازہ کھولیں۔ پاس پڑوس سے کوئی آہی جائے تو کیا کہے گا کہ ان کے یہاں آج چائے نہیں بنی۔ ہانڈی سویرے ہی چڑھا دی جائے گی صرف دال روٹی تو پکنا ہے۔ سعیدہ اٹھیں اور آگ جلائی، دیگچی میں پانی چڑھا دیا، آٹا گوندھا، اتنے میں کوٹھری سے ایک ہانڈی ہاتھ میں لیے ماں کے پاس آکھڑی ہوئیں۔ ہانڈی میں ہاتھ ڈال کر آدھی مٹھی دال نکالی۔ ہانڈی کا منھ ماں کی طرف کیا۔ اے لیجیے امی جان دال بھی تو نہیں ہے۔

حمیدہ بیگم نے سر اٹھایا، ہاں سچ تو ہے۔ اونھ ہوگا، چٹنی سے کھا لیں گے، تم نے دھنیا بوئی تھی، دیکھو کیسی ہری ہری لگی ہے۔

لوگ کہتے ہیں جب زبان جھوٹ بولتی ہے تو چہرہ اس کو جھٹلا دیا کرتا ہے۔ اگر اس وقت آپ حمیدہ بانو بیگم صاحبہ کو دیکھتے تو آپ کی سمجھ میں آجاتا کہ ہاں ایسا ہوسکتا ہے اور یہ بھی جان لیتے کہ زبان دل کا راز چھپانے کے بھی کام آتی ہے۔ بیٹی سے اونھ عجیب بے پروائی سے کہا گیا تھا جس میں ایک خفیف مسکراہٹ کا بھی شک ہوسکتا تھا مگر سعیدہ کی پیٹھ ادھر ہوتے ہی نہ معلوم کیا کرب کے آثار ظاہر ہوگئے بیٹی باورچی خانہ کی طرف سر جھکائے جارہی تھی مگر آنسو بھر جانے کی وجہ سے ماں شاید اس کو پوری طرح دیکھ نہ سکتی ہو۔ اتنے میں ایک بچے کی آواز آئی۔ اے اللہ ذری دروازہ کھول

دیجیے، بیگم صاحبہ نے کہا سعیدہ کنڈی کھول دو شبو ہے۔

ایک لڑکی پانچ چھ برس کی کرتہ پائجامہ پہنے، ننگے سر گلے میں چاند کانوں میں بندے، داخل ہوئی اور بہت جھک کر سلام کرکے تخت کے کونے پر پاؤں لٹکا کے بیٹھ گئی۔ کہو شبو اچھی ہو، تمھارے ماں باپ کہاں ہیں۔ حضور کی سلامتی مناتے ہیں، ابا تعلیم پر گئے ہیں۔ اماں کڑے میں بیاہ ہے وہاں گئی ہوئی ہیں، میں نے کہا میں حضور کو سلام کر آؤں۔ اللہ چھوٹی بیگم کو سلامت رکھے۔ سہرے کے پھول کہیں جلدی کھلیں، ہم بھی اس کی آس لگائے بیٹھے ہیں، خدا وہ دن تو لائے میں کڑے دن پہنے رہوں گی تھوڑی، کہے دیتی ہوں حضور سے حمیدہ بانو قہقہہ لگاکر اچھا شبو ضرور پہننا، ہمارے ارمان نکلیں گے تو کیا تیرے نہ نکلیں گے۔ سچ ہے بطخ کے بچے کو تیرنا کس نے سکھایا۔

اتنے میں شبو چھوٹی بیگم کی طرف باورچی خانہ چلیں۔ پاس ہی دھنیا کی کیاری تھی۔ اسی کے کنارے ایک مکو کا درخت اگا تھا۔ لال لال مکو سے گھنکنا بنا تھا۔ مکو توڑ توڑ کر کھانے لگیں، جب صاف کرچکیں تو دھنیا کی طرف مخاطب ہوئیں، نہایت یکسوئی سے توڑ توڑ کر مٹھی میں اور مٹھی سے کرتے میں جمع کرتی گئیں، حمیدہ بیگم صاحبہ تاسف کی مسکراہٹ سے اور سعیدہ غصہ کی نگاہ سے دیکھا کیں، مگر منھ سے کوئی نہ بولا۔

بی شبو دھنیا کھسوٹ چکیں تو بولیں۔

"چھوٹی بیگم آپ کے سایہ میں پروان چڑھیں، پھلیں پھولیں، آباد ہوں، ہم تو اس گھر کے ہمیشہ نمک خوار ہیں۔ آج پہلے پہل فصل میں دھنیا کی چٹنی آپ کے صدقے میں کھائیں گے۔" اور اپنے گھر چلی گئی۔

سعیدہ نے روکھی روٹی لاکر ماں کے سامنے رکھ دی۔ بیگم صاحبہ نے ہنس کر کہا شبو ہے پکی ڈومنی، بچہ ہے تو کیا ہوا۔ بیٹی ذری نمک ہی پیس لو۔

○

گناہ کا خوف

عبدالمغنی صاحب نے مختاری کے پیشے میں وہ نام پیدا کیا تھا کہ ڈپلوما والے وکیل بیرسٹر کیا کریں گے۔ بڑے بڑے زمیندار، تعلقدار، مہاجن خوشامدیں کرتے تھے، کمشنری بھر میں کون ابتدائی مقدمہ ایسا ہوتا تھا جس میں عبدالغنی صاحب دو فریق میں سے ایک کے مددگار نہ ہوں ان کی ترتیب دی ہوئی مِسل دیکھ کر چوٹی کے وکلا دنگ رہ جاتے تھے۔ اکثر کو یہ کہتے سنا ہے کہ اگر اس شخص نے وکالت کا امتحان پاس کرلیا ہوتا تو یہ ہائی کورٹ کے بہترین ایڈوکیٹس میں سے ہوتا۔

عبدالمغنی صاحب نے بلا کا دماغ پایا تھا۔ پر نہیں کٹے تھے۔ صوبہ بھر میں کہیں کا مقدمہ ہو اور کیسے ہی پیچیدہ معاملات ہوں، اگر فریق مقدمہ ان تک پہنچ گیا تو سب مشکلیں حل ہوگئیں۔ زبان میں نہ معلوم کیا جادو تھا اور نہ معلوم کیسے انچھر یاد تھے کہ رام کرلینا کوئی بات ہی نہیں تھی۔ جہاں صلح کا موقع ہوا دوسرے فریق کے دل میں جگہ کرکے صلح کرا دی۔ جہاں لڑائی کا موقع ہوا مخالف فریق کے بہترین آدمی توڑ لیے، کوئی دوسرا ہزار دو ہزار میں کام نکالے یہ سو دو سو میں کامیاب ہوجائیں۔

وکیل نہ ہونے کا خود ان کو کبھی افسوس کرتے نہیں سنا اور افسوس کرنے کا موقع ہی کہاں تھا۔ کام اتنا تھا کہ فضول خیالی گھوڑے دوڑانے کا موقع بھی نہیں ملتا تھا۔ وکیلوں کے یہاں ایک محرر ہوتا ہے۔ کوئی ایسا ہی بڑا ہوا جس کے یہاں دو ہوئے۔ ہائی کورٹ کے اونچے اونچے وکلاء کے ساتھ دو تین جونیئر لگے رہتے ہیں۔ ان کے یہاں بیس آدمی کام کرنے والے تھے اور پھر نہ جونیئر کا سوال نہ سینئر کا۔ خالی ہر شخص کی فطری قابلیت دیکھ کر کام سپرد کیا جاتا تھا جو اپنا کام سمجھ کر کرتا تھا ان کے جلسے میں مقدمہ کے ہر پہلو سے اسپیشلسٹ موجود تھے۔ حسب حیثیت باموقع اعتبار والے دیدار وچشم دید گواہ مہیا ہوسکتے تھے۔ ان کے جلسے میں ایسے لوگ بھی موجود تھے جو سو پچاس

برس کا سادہ ,کرم خوردہ کاغذ نکال دیں۔ دھواں دے کر نئے کاغذ کو پرانا بنا دیں، تین دن کے اندر حاشیہ کو دیمک سے چٹوا دیں، متن ویسے کا ویسا ہی رہے۔

دستاویزوں میں سے الفاظ غائب کردیں اور عبارتیں اس طرح داخل کردیں کہ بڑے سے بڑا تحریر شناس دھوکا کھا جائے۔ ان کے ملنے والوں میں ایک منشی صاحب تھے جو بائیں ہاتھ سے اور پاؤں سے بھی لکھ لیتے تھے اور شان خط بدل دیتے تھے۔ ہفت قلم تھے۔ اس معنی میں نہیں کہ نسخ، نستعلیق شکست وغیرہ وغیرہ لکھ لیتے تھے بلکہ اس رو سے کہ مختلف لوگوں کے انداز خط کی ایسی نقل اتارتے تھے کہ خود لکھنے والا اگر کچھ دن بعد دیکھے تو نہ جانے۔

ان کے علاوہ ایسے لوگ بھی تھے جو اکثر ضرورت ہو تو مسل گھما دیں، ریل پر سے، کچہری کے احاطے سے، گھر سے یا جہاں سے بہترین موقع ہو، بستے سے ضروری کاغذ غائب ہوجائے، باقی ویسے ہی رکھے ہیں۔ بالکل اسی طرح کا بستہ رکھ دیا گیا اور گواہ گھر سے کاجل کا چور اصلی بستہ لے گیا۔ اپنے یہاں کے اٹھنے بیٹھنے والوں میں سے ایک شخص کی خود تعریف کرتے تھے کہ انھوں نے وہ جرأت کی اور صفائی کا وہ کمال دکھایا کہ دوسرا ہوتا تو پاؤں کانپ جاتے اور دھر لیا جاتا۔ ایک بہت بوڑھے فریق مخالف عبا قبا پہنے، جاڑوں کے دن، بغل میں بستہ دبائے اپنے وکیل کے پیچھے کھڑے بحث سن رہے تھے۔ ان کی بغل سے بستہ نکل گیا اور کسی کو خبر تک نہ ہوئی۔ اس کے علاوہ ایسے لوگ بھی لگے رہتے تھے، جو لڑائی بھڑائی میں بھی بند نہ تھے مگر یہ سب دوسروں کے لیے کرتے تھے کیونکہ ان کے خیال میں مقدمہ بازی میں اور عشق بازی میں سب کچھ جائز تھا۔ مگر خود اپنے لیے عبدالغنی صاحب ان تمام باتوں سے علیحدہ رہتے تھے۔ مقدمات معاملات کی اور بات ہے۔ مثالاً بیان ہوتا ہے۔ ایک مرتبہ ایک نوجوان زمیندار تھا جو بالغ ہونے کے بعد اپنے بڑے بھائی پر مقدمہ چلانے والا تھا۔ سب سامان لیس تھا صرف دعویٰ داخل کرنا تھا۔ اسٹامپ خرید لیا گیا تھا۔ میعاد میں صرف تین دن باقی تھے اگر وہ دعویٰ ہوجاتا تو بڑے بھائی کا دیوالہ نکل جاتا اور یہ بھی زیربار ہوجاتا۔ بڑا بھائی ان کے پاس آیا۔ عبدالمغنی نے شکار کے بہانے سے اس لونڈے کو

پھانسا اور تین دن کے بجائے چار دن کے لیے اس کو نہ جانے کہاں الوپ کردیا کسی کو خبر تک نہ لگی۔ میعاد نکل جانے کے بعد چھوڑ دیا اور کچھ ایسی چالیں چلے کہ لونڈا جس بے جا کا دعویٰ کرنا کیسا ان واقعات کا ذکر کرتے ڈرتا تھا۔ یوں بلاوجہ کسی کا رویاں کبھی نہیں ستایا، نہ اپنے ذاتی معاملات میں ان کو کسی کے ساتھ زیادتی کرتے دیکھا۔ محلہ میں ہر شخص سے یگانگی کا برتاؤ تھا اور کون ایسا تھا جس کی خدمت انھوں نے نہ کی ہو، اپنی بات کے دھنی تھے اور ارادے کے ایسے مضبوط تھے کہ جس بات پر قائم ہوگئے پھر اس سے نہیں ہٹتے تھے چاہے کچھ ہوجائے۔

ایک مرتبہ طاعون آیا۔ بیماروں کی خبرگیری، غریبوں کی تیمارداری، میتوں کا دفن کروانا، سب اپنے ذمے لے لیا۔ طاعون کے نام سے لوگ گھبراتے ہیں مگر یہ ہر جگہ پل پڑتے تھے۔ نہ معلوم کتنے مُردے خود اپنے ہاتھوں سے قبر میں اتارے، لوگوں نے کہا انجکشن لے لو مگر انھوں نے پرواہ بھی نہ کی۔ ان کے مرشد نے ایک تعویذ بھیجا تھا وہ تو ضرور کُرتے کے نیچے گلے میں ڈال لیا تھا اور سورۂ تغابن کی مزاولت رکھتے تھے اور بس طاعون کی بلاختم ہونے کے بعد عبدالمغنی کا اثر اردگرد اچھا خاصا بڑھ گیا تھا۔ اول تو ایسے آڑے وقت میں لوگوں کے کام آئے تھے۔ دوسرے رفتہ رفتہ کچھ جائداد بھی پیدا کرلی تھی، بہت سی دکانیں بنوالی تھیں، جن میں کرایہ دار بساتے وقت کرایہ کا خیال اس قدر نہیں کیا جاتا تھا جتنا اثر بڑھانے کا اور لوگوں کو اپنی پارٹی میں شامل کرنے کا چنانچہ میونسپل اور ڈسٹرکٹ بورڈ وغیرہ کے الیکشن میں ان کا کینڈیڈیٹ اور ان کی پارٹی ہمیشہ جیتی تھی۔ انھیں وجوہ سے اگر مختار صاحب کسی سے کوئی بات کہہ دیں تو اس کو ٹالنا مشکل ہو۔ چنانچہ ان کے مکان کے قریب ایک زمین تھی جو ایک شخص نے مول لی تھی۔ عبدالمغنی اس کے خواہشمند تھے۔ یہ آراضی ان کے بھی موقع کی تھی اور اس کے بھی مگر ان کے رعب کی وجہ سے وہ انکار نہ کرسکا۔ اسی زمین پر انھوں نے ایک مختصر سا مکان بنوایا تھا جو ابھی ابھی تیار ہوا تھا۔ اور خیال تھا کہ مہمانوں کے لیے وقف رہے گا۔ نماز روزے کے بڑے پابند تھے مگر اسی کے ساتھ ہی زاہد خشک نہ تھے۔ دوست احباب کے ساتھ چوک بھی چلے جاتے تھے۔ خود ان کے گھر پر بھی اس طرح

کی صحبتیں آراستہ ہوجاتی تھیں۔ ان کے کمرہ میں کونے میں بایاں اور تان پورہ بھی رکھا رہتا تھا مگر یہ سب دوسروں کی خاطر اور آشنا پرستی میں گوارا کرتے تھے۔ خود ہمیشہ بے لوث رہتے تھے، حسن پرستی تک کو جائز جانتے تھے مگر تردامنی میں کبھی مبتلا نہیں ہوئے تھے۔ وضع داری کا یہ حال تھا کہ ریاست پور میں کسی زمانہ میں مختار تھے اس سلسلہ کو منقطع ہوئے برسوں گزر گئے تھے لیکن ان کے نام کا مختارنامہ آج تک پڑا تھا۔ رئیس صاحب کی جائداد چوتھائی نہیں رہ گئی تھی کچھ اس وجہ سے اور کچھ اس وجہ سے کہ ان کی مصروفیتیں بہت بڑھ گئی تھیں انھوں نے رئیس صاحب کو مشورہ دیا کہ مختارنامہ صاحبزادے کے نام ہوجائے۔ یہ سب کچھ تھا مگر آج تک رئیس کو اپنا آقا ہی سمجھتے تھے اور جو کام ہوتا تھا اپنا سمجھ کر کرتے تھے۔ رئیس صاحب کے بیٹے اور یہ قریب قریب ہم سن تھے جس وقت کا یہ واقعہ بیان کرتا ہوں، عبدالمغنی صاحب چالیس اکتالیس برس کے رہے ہوں گے اور شہامت علی رئیس صاحب کے بیٹے کا سن 35 برس کے قریب رہا ہوگا۔ آدمی ذرا شوقین مزاج تھے مقدمات کی پیروی میں بہت آیا کرتے تھے ؎

فکر بازاری بھی ہر وقت ہے درباری بھی
اک مصیبت ہے جوانی بھی زمینداری بھی

اور چونکہ عبدالمغنی صاحب کی وجہ سے کھانے اور قیام کی جگہ سے بے فکر تھے، اس لیے شوق بھی آزادی سے پورا ہوتا تھا۔ عبدالمغنی صاحب کے گھر میں ان کا کمرہ علیحدہ تھا جو سڑک کی طرف کھلتا تھا۔ اس لیے اگر رات کو انھوں نے کسی کو بلایا بھی تو کسی کو خبر نہ ہوتی تھی۔ عبدالمغنی صاحب سے کوئی تکلف نہ تھا خود ان کا دل چاہا یا شہامت علی کی خاطر سے منٹ دو منٹ کو چلے بھی آئے اور یہ دیکھ کر کہ خاص دان میں پان اور لوٹا گلاس پانی کا گھڑا سب موجود ہے چلے گئے۔

شہامت علی جب مقدمہ کے سلسلہ میں آتے تھے تو عموماً دو تین دن رہتے تھے اور جب شہر کے قیام کا کوئی عذر معقول نہ رہ جاتا تھا تو چلے جاتے تھے۔ ایک مرتبہ خلاف عادت کئی دن رہے۔ چہرے کی کچھ پریشانی کچھ فکرمندی سے عبدالغنی کو پتہ چلا پوچھنے لگے خیر تو ہے۔

شہامت علی : یار کیا کہیں، یہ سامنے درزی کی دکان نہیں ہے اس کوٹھے پر ایک رنڈی آئی ہوئی ہے کہیں باہر کی ہے، میں نے اب کی ہی دَورے میں دیکھا ہے، بھئی ہم تو کھیت رہے مگر وہ ظالم کسی طرح رنگ پر آتی ہی نہیں۔ کچھ ہم نے بھی حماقت کی کہ اپنے دل کا راز اس پر ظاہر کردیا۔ اس کے بعد اب تو اس کے مزاج ہی نہیں ملتے۔ گھمن خاں کو درمیان میں ڈالا مگر وہ پابندی کا عذر کرتی ہے۔ اور یہاں یہ حال ہے کہ خواب و خور حرام ہے۔ رات کی نیندیں اڑ گئی ہیں اور جو جو ہم کوشش کرتے ہیں وہ اور کھنچتی جاتی ہے۔

عبدالمغنی : ان اونچی رنڈیوں میں یہی تو خرابی ہوتی ہے کہ یوں خاطر مدارات لگاوٹ سب کچھ کریں گی مگر معاملے کی بات پر عجیب مزاج کی لینے لگتی ہیں اور اگر کہیں جھوٹ موٹ کی نتھ پہنے ہوئیں تو آشنائی نہ ہوئی قلعہ ہی فتح کرنا سمجھیے۔ چھوٹتے ہی بی نائکہ صاحب کہتی ہیں نا صاحب ابھی میری بچی کم سن ہے کچھ دن آیئے جایئے، اٹھیے بیٹھیے لڑکی سے مانوس ہوجایئے، آپ اس کی طبیعت پہچان لیں وہ آپ کے مزاج سے واقف ہوجائے پھر لونڈی کو عذر ہی کیا ہوسکتا ہے۔

اگر پیشے میں آچکی ہے تو نوکری کا سوال پہلے ہی دھرا ہے۔ مستقل تعلق کیجیے، پابند کیجیے اور خود بھی پابند ہوجیے، پھر سب سے بڑی خرابی یہ ہے کہ ادھر تعلق ہوا نہیں ادھر عیاشی کے گزٹ میں نام چھپا نہیں، اگر بڑے بڑے لوگوں کے نام سے یہ اپنے کو نہ منسوب کریں تو اعلیٰ طبقے والی کہلائیں کیوں کر، اگر چوری چھپے تعلق کیجیے تو اس میں بھی جب تک مہینوں حاضری نہ دیجیے اور ایک کی جگہ چار خرچ نہ کیجیے کام نہیں چلتا۔ تمھارے معاملے میں اتنا غنیمت ہے کہ تم یہاں کے رہنے والے نہیں ہو، باہر والے کی رسائی چوری چھپے کبھی کبھی ہوجاتی ہے کیونکہ اس میں دام بھلے چنگے ہاتھ آجاتے ہیں اور عام طور سے کمانے کا نام بھی نہیں ہوتا۔ خیر چلو ذرا ہم بھی دیکھیں۔ اسی طرف سے نیا مکان بھی دیکھتے آئیں گے۔ آج کئی دن سے نہیں گئے۔ تخت، پلنگ، کرسیاں وغیرہ تو پہنچ گئی ہیں ذرا دیکھنا ہے کہ کس طرح سے سجایا جائے اس طرف سے کھڑے کھڑے وہاں بھی چلنا مکان کی آرائش وغیرہ میں تمھارے سلیقے کے ہم ہمیشہ سے قائل ہیں۔

اس رنڈی کے یہاں پہنچ کر میاں عبدالمغنی صاحب نے منہ سے تو کچھ نہ کہا مگر شہامت علی کا ایسا ادب و لحاظ کیا گویا یہ ان کے ادنیٰ ملازم ہیں۔ ایک ایک گلوری نوش کی اور رئیس صاحب کی طرف سے کچھ دے کر دونوں آدمی اُٹھ آئے۔ لیجیے صاحب وہاں رنگ ہی بدل گیا۔ ادھر یہ لوگ رخصت ہوئے اور ادھر نائکہ نے استاد گھسن خاں کو بلایا کچھ سرگوشیاں ہوئیں جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ معاملہ روبراہ ہوگیا۔ پیغام بھیجا کہ لونڈی کو حکم میں کبھی عذر تھا نہ ہے۔ صرف بات یہ ہے کہ رات میں دوسرے کی پابندی ہے، دن کو جب چاہے گھڑی دو گھڑی کے لیے طلب کر لیجیے۔

اب دقّت یہ آن پڑی کہ رات کے لیے تو ان کا کمرہ مناسب تھا مگر دن کے لیے بالکل ناموزوں تھا۔ عبدالمغنی کے اعزا نوکر چاکر لڑکے سب ہی موجود تھے۔ مناسب یہی معلوم ہوا کہ وہی نوتعمیر مکان تخلیہ کے لیے کام میں لایا جائے۔ عبدالمغنی کچہری جا چکے تھے۔ چنانچہ شہامت علی نے ایک لڑکے کو دوڑایا کہ عبدالمغنی سے اس مکان کی کنجی مانگ لائے، یہ بھی کہلا بھیجا کہ جب فرصت ہو تو خود بھی چلے آئیں۔ کنجی تو انھوں نے بھجوا دی اور خود تھوڑی دیر میں آنے کو کہا۔ کلید مراد ہاتھ آگئی، اب عبدالمغنی کو کون یاد کرتا ہے۔ انھوں نے نوکر کو تو اس رنڈی کے یہاں بھیجا اور خود کنجی جیب میں لے کر اس نئے مکان کی طرف چلے۔ سب سے پہلے نل کھول کر دیکھا کہ پانی آرہا ہے۔ اس کے بعد پلنگ کی طرف متوجہ ہوئے۔ نواڑ کی پلنگڑیاں متعدد بچھی ہوی تھیں۔ اونھ، تکیہ بچھونا نہیں ہے نہ سہی، لوٹا بھی نہیں ہے، مگر شیشے کی الماری میں جگ اور گلاس تو ہیں، یار کچھ پان منگوانے چاہئیں۔ نوکر جب آئے گا تو وہ ہی لے آئے گا۔ شہامت علی کی بے تابی بیان کرکے اپنے پڑھنے والوں پر ناتجربہ کاری کا اتہام لگانا نہیں چاہتا۔

قصہ مختصر کچھ انتظار کے بعد معشوقہ محبوبہ تشریف لائیں۔ انھوں نے دھڑکتے دل سے استقبال کیا۔ نوکر کو گلوریاں، برف، لیمنیڈ لینے کو بھیجا اور پاس تو بٹھا لیا مگر نوکر کی واپسی کے انتظار میں دست ہوس اور زیادہ نہیں بڑھایا۔ ہاں جو باتیں اظہار شوق کی بالکل پیش پا افتادہ تھیں ان کا ذکر نہیں مگر نگاہ نوکر کے دھڑکے میں در ہی سے لڑی رہی۔ اتنے میں نوکر بھی آگیا اور اس کے ساتھ ساتھ میاں عبدالمغنی بھی دھر دھمکے۔ ان

کو دیکھ کر شہامت علی صاحب کے چہرے پر مسرت، خلوص اور شکرگذاری کا اشتہار لگ گیا۔ مگر عبدالمغنی صاحب کے چہرے پر خلاف امید سنجیدگی متانت بلکہ اس سے بھی بالا تر وہ کیفیت ظاہر تھی جو اس وقت ہوتی ہے جبکہ آدمی مروت کو توڑ کر کسی دوست کے خلاف دوٹوک فیصلہ کرلیتا ہے۔ شہامت علی کا دل دھک سے ہوگیا۔ رنڈی کے دوسرے پہلو میں بیٹھنے کی دعوت دی مگر عبدالمغنی نہ بیٹھے۔ ایک دو سکنڈ چپ کھڑے رہے۔ اس کے بعد کہنے لگے۔ یار سنو تم جانتے ہو کہ ہماری ہر چیز جان مال دوستوں کے لیے وقف ہے مگر ابھی اس مکان میں یہ کام نہیں ہوسکتا ہے۔ ابھی اس گھر میں میلاد شریف نہیں ہوا ہے۔

○

''چودھری محمد علی ردولوی کو مولانا صلاح الدین احمد نے اپنے رسالے 'ادبی دنیا' کے ذریعے روشناس نہ کرایا ہوتا تو آج پاکستان میں انھیں کوئی نہ جانتا۔ یوں بھی بہت کم لوگ ان سے واقف ہیں۔ اُن کا تحریری سرمایہ بہت زیادہ نہیں ہے مگر ان کی ہر تحریر خاصے کی چیز ہے۔ تحریر کے علاوہ وہ گفتگو کے فن میں بھی اپنی نظیر آپ ہیں۔ صحبتوں اور نشستوں میں بذلہ سنجیوں اور نکتہ آفرینیوں کے ایسے ایسے دریا بہاتے تھے جن کی گہرائی اور پاٹ سمندر کو آنکھیں دکھاتا تھا...''

(خلیق ابراہیم خلیق : منزلیں گرد کے مانند ...... صفحہ ۱۲۹)

اسباب کا غلام

میں نے اس طرح صورت بدل جاتے کبھی نہیں دیکھا۔ مذہبی حکایتوں میں بہت سنا تھا کہ کوئی قوم اپنے گناہوں کی وجہ سے بندر ہوگئی۔ کسی کو غصہ ور خدا نے کسی دوسرے جانور کی شکل میں بدل دیا۔ مگر ان آنکھوں سے دیکھنے کا اتفاق مجھ کو کیا کم تر آدمیوں کو ہوا ہوگا۔

کہانی شروع کرنے کے پہلے ایک بات اور عرض کردوں۔ اپنے پڑھنے والوں سے باتیں کرنے کا شوق اس حد تک پہنچ گیا ہے کہ قصے سے بے تعلق فضول باتوں کی بھرمار ہوجاتی ہے۔

لذیذ بود حکایت دراز تر گفتم
چنانکہ لفظ عصا گفت موسیٰ اندر طور

میری خاطر سے دو سطریں اور جھیل لیجیے۔ اس کے بعد کہانی سنیے گا۔ قصہ نویسی کی روایات میں سے ہے کہ اگر کسی واقعہ کو قصہ کے پیرائے میں لانا ہوتا ہے تو ناؤں گاؤں ٹھاؤں دوسرے دوسرے کردیتے ہیں اور قصے کی لڑی میں واقعات کو اس طرح پروتے ہیں کہ بات ہر آدمی پر صادق آئے مگر کسی ایک واقعہ پر اس طرح پورم پور نہ اترے کہ پڑھنے والا نام، مقام، زمانہ اور کیریکٹروں کو پہچان لے اگر ایسا ہوا تو صرف یہی نہیں کہ قصہ گوئی کا دھرم نہ رہ گیا بلکہ کہانی کا بھرم بھی کھل گیا اور جو بات پردے ہی پردے میں مزا دینے والی ہے، وہ حاصل نہ ہوئی۔ لکھنے والے اور پڑھنے والوں کی محنت رائگاں گئی اور کہانی کا راگ مالا، یا کسی خاص شخص کی ہجو ہوکر رہ گیا یا تعریفوں کا قصیدہ بن گیا۔ نہیں تو لڑکوں کو پڑھانے کا نصیحت نامہ ہوگیا جس کو پڑھنے والوں نے اس طرح پڑھا جس طرح بچے دوا پیتے ہیں۔ میرے پڑھنے والو، میں اس وقت اسی قسم کی مصیبت میں پڑ گیا ہوں قلم اٹھانے کو تو میں نے اٹھایا مگر اب کنایہ کی ٹھیک نکلی جاتی

ہے اور تصریح کا بے جوہر سپاٹ تختہ سامنے پڑا ہے ناچار سیدھا سیدھا واقعہ ہی بیان کیے دیتا ہوں۔ کالائے بد بریش خاوند، پڑھنے والے جانیں اور یہ کاغذ اور وہ ردی کی ٹوکری جس میں یہ ٹھکانے لگنے والا ہے۔

گھوڑے کی سواری اور دوسرے کھیلوں کے سلسلہ میں مجھ کو ایک انگریز سِولین کے دیکھنے کا اتفاق اکثر ہوتا تھا۔ اس کا لمبا قد چھریرا بدن، پھرتیلے اعضاء دل میں نہ صرف ایک کشش پیدا کرتے تھے بلکہ رشک کا مادہ بھی ابھارتے تھے۔ خوش قسمتی سے میری بھی دنیا ابھی آگے پڑی تھی اور کم سنی کی وجہ سے میرا بھی شمار ہونہاروں میں تھا۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو اس کے مقابلے میں خود اپنی ذات سے حقارت میری ترقی کی راہ میں بے در کی دیوار بن جاتی۔ یہ شخص صوبے کے سکریٹریٹ میں تھا اور میں اسکول کے آخری درجے میں، میرے بھی مواقع کچھ ایسے تھے کہ رات کو لیٹ کر جب اپنی خیالی دنیا تیار کرتا تھا جس میں صدر کی جگہ خود میری ہوتی تھی تو بالکل اسی درجے پر پہنچ جانا اور اس سے بھی اونچے جانا کچھ بعید از قیاس نہیں معلوم ہوتا تھا۔ میں یہ دعویٰ نہیں کرسکتا کہ میں اس سے اس قدر بے تکلف تھا کہ اس کی مزاجی کیفیت سے واقف ہوتا، کیونکہ ہندستانی اور انگریزوں کا دوستانہ ہی کیا اور وہ بھی پچیس تیس برس اُدھر اور پھر ایسے خاندان کے ایک فرد سے جس کے یہاں نذر دکھانا، ڈالی لگانا اور جوتے اتار کر کمرے میں جانا طرۂ امتیاز سمجھا جاتا ہو پھر بھی اس کے پاس بیٹھ کر دل کی کلی کھل جاتی تھی اور بے اختیار اندر سے کوئی یہ کہتا تھا کہ اس کا دل و دماغ اور ظاہر تینوں برابر کا پایہ رکھتے ہیں۔ علم کی روشنی ان سب پر اضافہ تھی۔ اسی سال میں ولایت بھیج دیا گیا اور واپسی اس وقت ہوئی جب لڑائی ختم ہوچکی تھی، جو لوگ جنگ عظیم سے واپس آئے تھے، ان کو خود اپنی غلام مزاجی پر تعجب تھا۔ اور جو لوگ یہیں رہے تھے، وہ اُن وعدے وعید کا آسرا لگائے تھے جو انگریزوں نے ہندستانیوں سے کیے تھے۔ انگریزوں کے دماغوں میں فتح مندی کا غرور قبضہ کیے ہوئے تھا اور ہندستانیوں کے دل خدمت گزاری کے انعام سے رفتہ رفتہ مایوس ہوتے جاتے تھے۔ حکمراں ملک کے دل میں پھر سے اپنی جبروت قائم کرنے کا خیال تھا اور یہی پالیسی یہاں کے انگریز بھی برت رہے تھے۔ سرولیم

میرس لیونل کرٹس، سر ویلنٹائر چرول کی امپریل پالیسی کا زور تھا۔ نہ معلوم کتنی جگہ گولیاں چل چکی تھیں اور نہ معلوم کتنی جگہ حکومت نے فولادی پنجہ سے اپنے گزشتہ رعب و داب پر پھر سے قبضہ کیا تھا اور ہندستانیوں کی امیدوں کا خون پانی ہوکر بہہ چکا تھا۔ اچھے لوگ اسباب زمانہ کے ہاتھوں برے ثابت ہوچکے تھے اور برے لوگ سخت وقت میں اچھے ٹھہرے تھے۔ سونا جانے گسے اور آدمی جانے بسے۔ ہمارے پولو اور کرکٹ کے پرانے یار بھی انھیں امپریلسٹ خیال کے لوگوں میں تھے جو دل کے تقاضے پر دماغ کے افکار کو ترجیح دیتے تھے اور جن کا شمار ان جانوروں میں ہوچکا تھا جن کی بابت یہ کہا جاتا ہے کہ جہاں ان کے منھ میں ایک بار خون لگا پھر ان کے دانت اور ناخن ہمیشہ لال ہی رہتے ہیں۔ ان کی سخت مزاجی، قصاوت قلبی، صوبے بھر میں ہر شخص پر کھل چکی تھی اور ان کی گنتی ان چند سورماؤں میں تھی جن کی حفاظت کے لیے بنگلہ پر اور باہر خفیہ پولیس اور کھلم کھلا پولیس مقرر رہتی ہے۔

حسن اتفاق سے مجھ کو اپنا ہی صوبہ مل گیا تھا۔ میری بدقسمتی سمجھیے یا میرے ذی اثر خاندان کی خوش فکری واپسی پر مجھ کو بمبئی ہی میں معلوم ہوگیا تھا کہ میری تعیناتی اسی ضلع میں ہوئی ہے جہاں ہمارے یار خونخوار برسرحکومت تھے۔ بندگی بیچارگی بادلِ ناخواستہ گیا اور قدیم زمانے کے کلبی حکمائے یونان کی طرح زندگی بسر کرنے کا ارادہ مضبوط کرلیا۔ لیکن وہاں پہنچ کر جو کچھ دیکھا اس کے لیے بالکل تیار نہ تھا۔ پانچ ہی برس کے اندر وہ جوانِ رعنا اپنے ٹھکانے لگ چکا تھا اور اس کی جگہ ایک عجیب الخلقت آدمی کرسی پر بیٹھا تھا بجائے قدیمی ہنس مکھ چہرے کے ایک صورت سامنے تھی۔ جس میں دہانے کے اِدھر اُدھر دوشکنیں، ہونٹوں کے سِروں کو اس طرح نیچے کھینچ لائی تھیں جیسے دوسنتری تعینات ہوں کہ یہ گنہگار ہنسنے نہ پائے سر کے بالوں کا قافلہ روارو میں تھا اور آنکھوں کے کوئے ایسے پھٹ گئے تھے گویا وہ زبان حال سے کہہ رہی ہیں۔ ''ہم رات کو اٹھ کر روتے ہیں جب سارا عالم سوتا ہے'' چہرے کے پٹھے گویا مفلوج ہوگئے تھے جن میں خوشی رنج تعجب شوق ظاہر کرنے کی قابلیت ہی نہیں رہ گئی تھی۔ دانتوں کی چمک دمک میں فرق نہ آیا تھا۔ مگر ہنسی جانے کی وجہ سے وہ بھی ہندستانی پردے والیوں کی طرح کم

ہی دکھائی دیتے تھے۔ اس کو دیکھ کر میری نفرت عبرت سے بدل گئی اور خون کا ہیجان حیرت سے ٹھہر گیا۔ صرف مغائرت کا خیال اپنی جگہ پر قائم رہا کیونکہ میری پرانی شناسائی اور آج کی ملاقات کے درمیان میں ہندستانی بچوں اور بوڑھوں کا خون لہریں مار رہا تھا مگر بھلے کو اس نے خود پرانی جان پہچان کی چھاؤں نہ آنے دی، باوجود اس قدر مسخ ہوجانے کے اس بدنصیب آدمی میں ایک پرانی جھلک ہر جگہ نمایاں رہتی تھی۔ یعنی جہاں ضابطہ مجبور نہ کرے وہاں کسی کو بے جا تکلیف کیوں دی جائے۔ وہ باتیں تھیں جو تقریباً پہلی ہی ملاقات میں دل میں آئیں پھر تو رفتہ رفتہ بہت سی باتوں میں یہی رائے قائم ہوتی گئی۔

جس طرح ایک تنکا دریا کا رخ بتا دیتا ہے اسی طرح ایک دن ایک اشارہ اس کی دلی حالت کو سمجھانے کے لیے کافی ہوگیا۔ کلب میں کوئی ڈنر تھا اور ہم اور یہ پاس پاس بیٹھے تھے۔ صحبت بڑے لطف کی تھی اور خوش دلی ہونٹوں کی کلیاں بکسا رہی تھی۔ بیچ بیچ قہقہہ بھی پڑتا تھا مگر یہ غریب ہنسنے سے مجبور تھا گویا دیوتاؤں کی تجویز کی ہوئی سزا بھگت رہا تھا۔ آخرکار اس نے ایک مرتبہ رومال نکالا اور اس کو دونوں ہاتھوں میں سنجیدگی سے پھیلا دیا اور پورا چہرہ چھپاکر خوب ہنسا اس کے بعد پھر وہی سنجیدگی۔ اور مجھ سے جھک کر آہستہ سے کہنے لگا میرا چہرہ تو بندر کا ہوگیا ہے۔

معاشرتی زندگی اس شخص کی اس قدر محدود ہوگئی تھی کہ اس کی رفتارطبیعت جانچنے کا موقع لوگوں کو کم رہ گیا تھا۔ شکار بالکل چھوڑ دیا تھا، بندوق کی طرف پھر کے نہیں دیکھتا تھا، آدمیوں پر گولیاں چلانے کے بعد گویا بڑے شکار کے مقابلے میں چھوٹا شکار نظروں سے گر گیا تھا، کلب میں بھی کبھی کبھار صرف اس قدر چلا آتا تھا کہ واسطہ باقی رہے۔ اس کے علاوہ کچھ باتیں اور بھی انوکھی ہوگئی تھیں۔ مثلاً کمرے کے اندر نہیں سوسکتا تھا، افواہاً یہ بھی سنا گیا تھا کہ اسی کشت وخون کے بعد اس کی منگیتر نے شادی سے بھی انکار کردیا تھا ضابطہ کی زندگی میں البتہ کسی طرح کا فرق نہ آیا تھا۔ تجویزیں اسی قابلیت سے لکھتا تھا، اور احکام جاری کرنے میں عقل سلیم کا دامن کہیں سے نہیں چھوٹتا تھا۔ اگر مجھ کو اس کی رائے سے اختلاف کرنے کا اتفاق ہوتا تھا تو کچھ اچھا سا معلوم

ہوتا تھا۔ مگر ایسے موقع شاذ و نادر ہوتے تھے۔ زیادہ تر تو یہی ہوتا تھا کہ اس کی رائے نہ صرف مضبوط ہی ہوتی تھی بلکہ ایسے موقعوں پر دل میں اس کی جگہ ہوتی معلوم ہوتی تھی مگر فوراً اپنے ہم وطن زخمی بچے اور بوڑھوں کی تصویریں آنکھوں کے سامنے آجاتی تھیں بعض ان میں سے دانتوں میں انگلی دبا کر مجھ کو اس کی طرف میلان سے روکتے تھے، بعض آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر صرف مجھ کو دیکھتے تھے گویا کہہ رہے ہیں ہائیں اس نے ہمارا بے گناہ خون بہایا، وہی خون تمھاری رگوں میں بھی ہے اور پھر بھی اس کو اچھا آدمی ماننے پر تیار ہو۔

خیر ایک دن ایسا آگیا کہ باوجود تمام باتوں کے میں نے اپنی رائے میں ترمیم کرہی دی یعنی اچھے سے اچھا آدمی بُرے سے بُرا آدمی دونوں اسباب کے غلام ہیں۔ کوئی آج بچ نکلے کل بچ نکلے مگر ایک نہ ایک دن ایک نہ ایک معاملے میں ضعیف انسان اسباب کی زنجیروں میں جکڑ کر ان کا تابع فرمان ہو ہی جاتا ہے۔ چاہے وہ آپ ہوں یا میں ہوں یا وہ بدبخت آدمی ہو جس کا ذکر کر رہا ہوں۔ واقعہ یوں پیش آیا کہ وہ اور ہم دورے کے سلسلہ میں گھوڑوں پر جارہے تھے کہ راستے میں ایک پرانی عمارت کے پاس پہنچے یہ ایک بزرگ کی درگاہ تھی جو نہایت مقبول سمجھی جاتی تھی، مہینے میں ایک مرتبہ نوچندی جمعرات کو یہاں خلائق کا ہجوم ہوتا ہے اور سال بھر کے بعد عظیم الشان عرس ہوتا ہے۔ جس میں دور دور سے لوگ آتے ہیں۔ یہ جگہ آبادی سے ذرا ہٹ کر ہے اور کئی چہار دیواریوں کے اندر الگ الگ تقسم ہے۔ سوا خاص خاص موقعوں کے یہاں مجاور تک نہیں رہتا مگر صاحب درگاہ کی ہیبت و جلال ایسا ہے کہ کوئی نقصان نہیں ہوتا اور نقصان کاہے کا ہوگا۔ دو چار مٹی کے چراغ ہیں اگر کوئی چاہے اٹھالے جائے، باقی اللہ کا نام ہے۔ جس وقت ہم لوگ پہلے حصے میں داخل ہوئے وہاں صرف دو دیہاتی عورتیں اور ان کے دو تین بچے تھے۔ بچوں نے تو ہم کو تعجب سے دیکھا اور نڈری سے دیکھتے رہے مگر عورتیں دو انگریزی ٹوپیاں دیکھ کر سہم سی گئیں۔ میں نے انھیں کے لہجے میں ان کو سمجھا دیا اور وہ مطمئن ہوگئیں۔ بچوں میں ایک لڑکی تھی تین چار سال کا سِن، جھنڈولے بال، سیاہ رنگت، گلگوتھنا سی، پھولے پھولے گال، موٹاپے کی وجہ سے

آنکھیں یوں ہی گھرے میں تھیں۔ اس پر غضب یہ ہوا کہ اس نے اپنی ماں کو آستانے کی خاک چہرے پر ملتے ہوئے دیکھا تھا اور اس نے شہ نشین کے ہر در پر ہاتھ رگڑ کر منھ پر مل لیا تھا۔ چہرہ چونے سے بالکل سفید تھا۔ صرف آنکھوں کے حلقے بچے تھے اسی وجہ سے دیدے اور جگر جگر چمکنے لگے تھے۔ دوسرے بچے ہم لوگوں کو بھی دیکھتے تھے اور دوسری طرف بھی بہلے ہوئے تھے، مگر یہ لڑکی تھوڑے فاصلے پر برابر ہم لوگوں کو دیکھتی چلی آتی تھی۔ اور اپنے ساتھیوں سے بالکل بے پرواہ ہوگئی تھی۔ میرا ساتھی غریب چہرے پر کسی طرح کا جذبہ ظاہر کرنے کے قابل تو رہ نہیں گیا تھا مگر میں برابر غور کر رہا تھا کہ بار بار اپنا نامتغیر چہرہ گردن پھیر پھیر کر اسی لڑکی کی طرف دیکھتا تھا۔ دو ایک مرتبہ مجھ کو خیال ہوا کہ اس نے اپنی چال بھی آہستہ کردی؟ گویا چاہتا تھا کہ اس کو گود میں لے کر پیار کرے یا شاید اٹھا کر پتھر کے فرش پر پٹخ دے تاکہ اس کا بھیجا نکل پڑے۔ آخرکار اس نے اپنا ارادہ مصمم اور مضبوط کرلیا اور اپنی چال کا رخ سیدھا اس لڑکی کی طرف کیا۔ اس کو آتے دیکھ کر لڑکی چپ کھڑی ہوگئی۔ میں بھی اپنی جگہ ٹھٹھک کر رہ گیا۔ یہ انگریز اس لڑکی کے پاس پہنچ کر نہایت اطمینان سے گھٹنیاں زمین پر ٹیک کر جھک گیا۔ چابک رکھ دیا اور اس لڑکی کے سر اور کاندھوں پر اور پیٹھ پر نہایت نرمی سے ہاتھ پھیرنے لگے۔ چہرہ تو سنگ مرمر کے بت کی طرح بے حس رہا مگر ہاتھوں کی جنبش، گردن کے ڈورے اور پیٹھ کے جھکے ہوئے خط سے ہزار باپوں کا پیار ابلا پڑتا تھا اور ہزار ماؤں کی آتما آنچ لو دے رہی تھی۔

○

آنکھوں کی زبان

یہ مضمون ایک واقعہ پر مبنی ہے جس میں زبان سے بالکل کام نہیں لیا گیا تھا، بلکہ جتنی باتیں ہوئیں وہ صرف آنکھوں سے ہوئی تھیں۔ یہ کہنا بہت مشکل ہے کہ آیا ہم لوگوں کی نگاہوں نے یہ سب کچھ کہا اور یہ سب کچھ سنا بھی، لیکن اس میں کلام نہیں کہ تمام باتیں جو قلم بند ہوئی ہیں اس شریف زادی کی نگاہ سے میرے دماغ میں آئیں۔ میں نے پانچ دوسری شریف زادیوں کو یہ مضمون سنایا اور ان سے دریافت کیا کہ آیا نگاہوں نگاہوں میں اتنا کچھ بیان ہوسکتا ہے۔ چار نے کہا کہ ممکن ہے! پانچویں نے کہا کہ یہی نگاہ دوسرے افتادطبع والے کے دل میں دوسرے خیالات لاتی اور وہ بھی سچے ہوتے۔ کیونکہ نگاہ وجدان کی زبان سے باتیں کرتی ہے جس میں غلطی ہونا ناممکن ہے۔ میں جانتا ہوں کہ خدا کی مخلوق ایک اور بھی ہے جو کہے گی کہ جب تک زبان کچھ کہے نہیں اور کان کچھ سنیں نہیں تب تک کسی کے دل کا حال کیسے کھلا۔ ان حضرات سے مجھے صرف یہ عرض کرنا ہے کہ شعر مرا بمدرسہ کہ برو۔

ڈاکٹر صاحب ہمارے عنایت فرماؤں میں تھے۔ ہم چار احباب میں طے پایا تھا کہ کل دن کا کھانا ہم لوگ ڈاکٹر صاحب کے یہاں کھائیں گے۔ ہمارے ایک دوست مجھ کو اور دوسرے دوست کو اپنی کار پر ہسپتال پہنچائیں گے اور وہاں سے ڈاکٹر صاحب کو لیتے ہوئے ان کے گھر چل کر کھانا کھائیں گے۔ چنانچہ گیارہ بجے ہم لوگ ہسپتال پہنچ گئے۔ ڈاکٹر صاحب کسی مریض کو دیکھنے گئے تھے۔ اس لیے ہم لوگ ان کا انتظار کرتے رہے۔

یہ ہسپتال سرکاری نہ تھا۔ اسی لیے عمارت واجبی ہی واجبی تھی۔ البتہ ڈاکٹر صاحب کی عام قبولیت کی وجہ سے مجمع اچھا خاصا تھا۔ صدر کمرہ ڈاکٹر صاحب کے بیٹھنے کا تھا۔ پیچھے یقیناً آپریشن کا کمرہ تھا۔ ادھر ادھر دو دو کمرے تھے ایک ایک بڑا اور ایک ایک

چھوٹا۔ داہنی طرف والے کمرے میں شاید دفتر رہا ہوگا۔ اس کے پاس والے کمرہ میں دوائیاں بانٹی جاتی تھیں۔ دوسری طرف کے کمرہ میں پردے والے بیمار بیٹھے تھے اور اس کے پاس والے کمرے میں ایک نرس کی مدد سے ڈاکٹر صاحب عورتوں کو دیکھتے تھے۔ چونکہ کمپاؤنڈر کی طرف بڑا مجمع تھا، اس لیے ہم لوگ صدر کے کمرے کے سامنے برآمدے میں کھڑے ہوگئے۔ پاس ہی عورتوں والے کمرے کے دروازے بھڑے ہوئے تھے، لیکن کھڑکی کا ایک پٹ شاید ہوا سے کھل گیا تھا۔ اس کھڑکی کے سامنے والی دیوار سے ملا ہوا ایک بنچ تھا جس پر ایک نوجوان عورت برقع پہنے بیٹھی تھی۔ نقاب بالکل الٹی ہوئی نہ تھی مگر چہرے پر سے اس طرح سے ہٹی ہوئی تھی کہ ضرورت ہو تو فوراً پردہ ہو سکے۔ جہاں میں کھڑا ہوا تھا صرف وہاں سے اس بنچ کا سامنا تھا۔ اتفاق سمجھیے یا ارادہ میری نظر جا پڑی۔

سنیے صاحب یہ نوجوان شریف زادی مصر کی کلیوپیٹرا، یونان کی ہیلن، ایران کی منیژہ، ہندستان کی شکنتلا، شیکسپیئر کی جولیٹ سب سے کم خوبصورت تھی۔ اس مجمع میں شاید کوئی اس غریب کی بات بھی نہ پوچھتا، البتہ صاف دلی کی بے تکلف نگاہ، پاکبازی کا نڈر انداز، سادگی کی چھب، شرافت کی آب، بن ہنسی کا ہنس مکھ چہرہ، اگر ان باتوں میں مقابلہ ہوتا تو ہماری ہیروئن نہ تو متذکرہ بالا معشوقوں ہی سے کم تھی نہ آج کی ہالی ووڈ کی فلم ایکٹریسیز ہی اس کے سامنے ٹھہر سکتی تھیں۔ بہرحال میں دیکھ رہا تھا کہ چار آنکھیں ہو گئیں۔

''اے معاف کیجیے گا میری بدتمیزی۔''

''جی نہیں بدتمیزی کاہے کی اور معافی کس بات کی۔ صورت دیکھنے ہی کو ہوتی ہے۔ اگر آپ کا دل چاہتا ہے تو دیکھیے۔''

''بھئی واہ آپ تو خوب آدمی ہیں آپ سے مل کر تو بڑی خوشی ہوئی۔ ماشاء اللہ بہت روشن خیال ہیں، حالانکہ وضع قطع سے یہ پتہ نہیں چلتا کہ آپ نے کالج وغیرہ میں تعلیم پائی ہوگی۔''

''آپ کا خیال درست ہے میں زیادہ پڑھی لکھی نہیں ہوں لیکن اس کے ساتھ ہی

یہ بھی ضرور سمجھتی ہوں کہ فطرت کے موافق صحیح رائے قائم کرنے کے لیے بی اے، ایم اے کی ڈگری کی ضرورت نہیں ہے۔"

"آپ کا سرخ و سفید رنگ اور بے شکن چہرہ دیکھ کر ہسپتال میں آپ کی موجودگی پر تعجب بھی ہوتا ہے اور تردد بھی نصیب دشمناں مزاج تو اچھا ہے۔"

"جی نہیں میں بیمار نہیں ہوں، تیمار دار ہوں۔"

"یہی تو میں کہہ رہا تھا۔"

"اگر ناگوار نہ ہو تو ایک بات عرض کروں۔"

"کہیے کہیے آپ اس قدر بچھے کیوں جاتے ہیں۔"

"ایک ذرا نقاب اور ہٹ جاتا تو اچھا ہوتا۔"

"لیجیے، اگر یہ تصویر آپ کو پسند ہے تو تھوڑا سا پردہ اور کھسکائے دیتی ہوں۔ اس سے زیادہ کی جرأت مجھ کو بھی نہیں ہے۔ حالانکہ اگر برقع پھینک کر آپ کے پاس بھی کھڑی ہو جاؤں تب بھی کوئی حرج نہیں معلوم ہوتا۔

اول تو اس کے نیچے میں کپڑے ایسے پہنے ہوں جو بدنیت اعزا سے گھر کے اندر ہماری وہ حفاظت کرتے ہیں کہ باہر برقع کیا کرے گا۔ دوسرے وضع قطع سے آپ باہر کے معلوم ہوتے ہیں۔ اور کہتے ہوئے رکتی ہوں۔ لیکن اس خیال سے کہ آپ بات سمجھتے ہیں اور ہمارے آپ کے درمیان دل کی صفائی نہ ہونے کی وجہ نہیں اس لیے کہے ڈالتی ہوں۔ ہمارے آپ کے سن میں بھی اچھا خاصا فرق ہے۔ اگر نانا نواسی کا نہیں تو باپ بیٹی کا ضرور ہے۔

"جی ہاں، ہے تو ضرور مگر۔"

"لیجیے آپ برا مان گئے۔ میرا مطلب ہرگز نہیں تھا کہ خوانخواستہ آپ میں جوانی کی گرمی باقی نہیں ہے۔ مجھے پورا یقین ہے کہ ایسا نہیں ہے برخلاف اس کے آپ کی نگاہ سے صاف ظاہر ہے کہ دوسرے جنس کی قدردانی آپ میں ویسی ہی موجود ہے، لیکن، ہم لوگ تو اس وقت جنس کا خیال نہیں کر رہے تھے۔ آدمی آدمی کو دیکھ کر خوش ہوتا

ہے۔ اسی طرح ہم آپ بھی ایک دوسرے کو دیکھ کر دل بہلا رہے تھے۔ جس میں جنس کا حصہ صرف اس قدر تھا کہ میں آپ کو مرد سمجھ رہی تھی اور آپ مجھے عورت۔

ہاں اگر ہمارا آپ کا ساتھ پڑے اور اتحاد خیال کی وجہ سے اتحاد جسم کی نوبت آجائے تو اور بات ہے۔ لیکن اس وقت تک تو کوئی ایسی بات نہیں۔ نہ خود میری یہ عادت ہے کہ صرف فتح مندی حاصل کرنے کے لیے لوگوں کو اپنے عشق میں مبتلا کیا کروں۔ میں جس کو چاہتی ہوں اس کو چاہتی ہوں اور کم سے کم جب تک میری وہ محبت قائم ہے تب تک ہر مرد جس میں آپ بھی شریک ہیں میری طرف سے مطمئن رہ سکتا ہے۔''

''بجا ہے، بالکل درست، میں بھی اس وقت جیسا کہ آپ جانتی ہیں جنس کا خیال نہیں کر رہا تھا اور صرف صنعت پروردگار کو دیکھ رہا تھا۔''

اچھا خیر۔ اب آگے نہ بڑھیے گا نہیں تو صنعت پروردگار دیکھتے دیکھتے اسی میدان میں پہنچ جائے گا جہاں اس وقت میں آپ کو دیکھنا نہیں چاہتی۔ آخر انصاف کیجیے گا ہم عورتیں اگر کسی کو دیکھیں تو جنس کے خیال سے اگر کسی کو دکھلائیں تو جنس کے خیال سے کپڑے پہنیں تو مرد کے لبھانے کو، ہاتھ، کان، گلے میں کچھ ہو تو مرد کی لونڈی بننے کو، کوئی کمال حاصل کریں تو شوہر پھانسنے کو، خوبصورت ہوں تو مرد کے لیے، بدصورت ہوں تب بھی مرد کی کسوٹی پر کس کر پھینک دیے جانے کو، خدا کے لیے انصاف کیجیے گا۔ آٹھوں پہر میں گھڑی دو گھڑی تو ایسی ہونی چاہیے جب آپ لوگ ہماری جان چھوڑ دیں اور جنس کے نجھیڑے سے دم مارنے کی فرصت نکلے۔ اور ہم لوگ خود اپنی زندگی بسر کرسکیں۔ آپ کو میری تندرستی اور انداز سے معلوم ہوگیا ہوگا کہ میں خدا کی ہر نعمت کو صرف پسند ہی نہیں کرتی بلکہ کفران نعمت بھی کرنا نہیں چاہتی، پھر بھی ہر چیز کی انتہا ہوتی ہے خدا لگتی کہیے گا۔ آخر کسی وقت تو عورت کو مرد کا بت پوجنے سے چھٹی ملنی چاہیے۔ اس کو میں مانتی ہوں کہ ہماری تعلیم، ہماری تربیت، ہمارے قوانین، خود ہمارے جسم کی بناوٹ ایسی واقع ہوئی ہے کہ سوا مرد کے استھان پر بھینٹ چڑھ جانے کے ہمارا کوئی مصرف نہیں، لیکن پھر بھی میں یہ ماننے پر تیار نہیں ہوں کہ سوا جنس کے کوئی

پہلو ہماری زندگی کا ہو ہی نہیں سکتا اور پیدا کرنے والے نے ہم کو صرف اس واسطے پیدا کیا ہے کہ آپ کی خدمت کیا کریں اور بس۔ ہاتھ پاؤں دل و دماغ صرف اس واسطے پیدا کیے گئے ہیں کہ مرد کے لیے جیو اور مرد کے لیے مرجاؤ۔ اگر کسی وقت بھول بھی جاؤ تو پردہ نگوڑا شرم کی باتوں سے خیال ہٹنے نہیں دیتا۔"

"واہ واہ، کیا پاکیزہ خیالات ہیں۔ ایسی باتیں سن کر دل تو یہی چاہتا ہے کہ کسی نہ کسی طرح پھر بھی ملاقات ہونے کا سامان ہو جاتا، اگر آپ کے مکان کا............"

"لیجیے پھسل پڑے نا، مرد کی بھی عجیب ذات ہوتی ہے۔ اجی بھاڑ میں جھونکیے مکان کو اور وفان کیجیے پتے نشان کو، یہ بے لوث صحبت غنیمت جانیے جس میں نہ میری غرض آپ سے اٹکی ہے نہ آپ کو مجھ سے۔ ایسے موقع تقدیر سے ہاتھ آتے ہیں اور آپ ہیں کہ قیمتی وقت فضولیات میں ضائع کر رہے ہیں۔ بس اتنا سمجھ لیجیے کہ خیالات کو چھوڑ کر میں بالکل حضرت حوا کی ایسی عورت ہوں اور آپ حضرت آدم کے ایسے مرد نہ آپ میں کوئی بات نرالی ہوگی نہ مجھ میں۔"

"اچھا معاف کیجیے گا، معاف کیجیے گا میں مانتا ہوں میری غلطی تھی۔ آپ کی باتوں سے میرے سامنے تو ایک نئی دنیا آگئی گویا دماغ میں ایک نئی کھڑکی کھل گئی۔"

"اچھا تو اسی کھڑکی میں بیٹھے بیٹھے اسی نئی دنیا کی ابھی اور سیر کیجیے ہاں تو میں کہہ رہی تھی............"

عین اسی وقت ہمارے دوستوں میں سے ایک صاحب جو وہیں کے رہنے والے تھے اور جن کی وضع قطع میں میری ایسی اجنبیت نہیں تھی، اس نظارہ بازی میں بڑی للک سے شریک ہوگئے۔

اونھ یہ کہاں سے پھٹ پڑے ازغیبی ڈھیلا، کیا مزا کرکرا کیا ہے۔ عین کریال میں غلہ مارا ہے۔ آپ کو دیکھیے آپ آئے ہیں ڈورے ڈالتے ہوئے کیا بدمذاق واقع ہوئے ہیں۔ ذری نگاہ کی گھلاوٹ دیکھیے گا، معلوم ہوتا ہے بے چارے ابھی یتیم ہوئے ہیں۔ آپ کے نزدیک یہ نگاہ ہر عورت کے دل کا پاسپورٹ ہے، بھلا کوئی یہ تو آپ سے

پوچھے کہ عورت پہلے انتخابی نظر ڈالتی ہے کہ مرد ہی کے اختیار میں سب کچھ ہے۔ مگر ان باریکیوں سے آپ کا کیا واسطہ آپ تو اس واسطے پیدا ہوئے ہیں کہ جا بے جا عورتوں کو گھورا کریں اور یار دوستوں میں بیٹھ کر یہ ظاہر کیا کریں کہ عورتوں کے بھیڑیے آپ ہی ہیں ہائے کیا بیکسی نگاہ سے ٹپک رہی ہے اور بڑا غضب تو یہ ہے کہ جب تک پردہ رہے گا تب تک نہ ایسے مردوں کی نگاہ تربیت یافتہ ہوگی نہ عورت غریب کو ان کی بدتمیزی سے نجات ہے۔ بے چارے ندیدے رال ایسے ٹپکے پڑتے ہیں۔ ایک لطیفہ عرض کروں۔

دو پڑھے لکھے احباب دماغ کی تھکن دور کرنے کے لیے آپس میں بے سر و پا باتیں کر کے ہنس رہے تھے کہ طبیعت کا کسل مٹے، اتنے میں ایک تیسرے صاحب جنھوں نے انھیں لوگوں کے مقابلے میں ان سے اونچی ڈگریاں کی تھیں اور سدا بہار طالب علم تھے۔ آتے دکھائی دیے۔ ان صاحب سے اور تفریح طبع سے باپ مارے کا بیر تھا، پہلے نے دوسرے سے کہا۔

"بھئی اب سلیقہ کی باتیں کرو، وہ دیکھو ایک بے وقوف آرہا ہے۔" اسی طرح ہم آپ بھی اپنی دلچسپیاں ختم کردیں۔ آپ کو خیال نہیں حافظ مرحوم فرمایا کرتے تھے۔

چہ جائے صحبت نا محرم است مجلس انس
سرِ پیالہ بپوشاں کہ خرقہ پوش آمد

"اگر ان صاحب کی انانیت بھری نگاہ اور بوالہوسی کی گھورا گھاری سے چھٹکارا ملا تو پھر باتیں کرلیں گے، نہیں تو خدا حافظ۔"

میں نے بھی کہا تم کو بھی خدا کی امان میں سونپا، کہو قبول کیا۔

میرے پڑھنے والو، یا میری پڑھنے والیو، برا ہو، اس کا جو برا چیتے یا برا گمان دل میں لائے۔ میں پھر عرض کرتا ہوں کہ یہ پوری کی پوری کہانی لب و دہان کی شرمندہ نہیں ہے نہ کہیں پائے سخن درمیان میں آیا۔

○

شاعر کا کلام

عرب کا قول ہے "ان من الشعر لحکمة و ان من البیان لسحراً۔ یعنی اشعار میں فلسفہ ہوتا ہے اور بیان میں اثر کرنے والا جادو ہے۔ خیر عرب میں تو ملک کے قوانین ہی اشعار کے ذریعہ سے بنتے تھے اور قبیلوں کا دستورالعمل ہی قائم ہوتا تھا۔ کسی نے ایک شعر اپنے قبیلے کی تعریف میں کہہ دیا کہ ''ہمارے خاندان میں مرد سخی ہوتے ہیں اور عورتیں خسیس۔'' لیجیے صاحب پشت در پشت کے لیے قانون پاس ہوگیا اور اگر موقع آن پڑا تو ان کی اولاد نے مہمان داری میں گھر لٹا دیا اور عورتوں نے باوجود گرم مزاج ہونے کے آبرو پر جانیں قربان کردیں۔ کچھ عرب پر موقوف نہیں ہر جگہ کا یہی حال ہے۔ کوئی ملک ایسا نہیں ہے جہاں قابلیت کے موافق، گیتوں اور شعروں نے ملک کے اخلاق، اقتصاد، سیاست، تمدن کو سانچے میں نہ ڈھالا ہو۔

اگر کسی جادو کے زور سے ہندستان کے کتب خانہ سے رامائن مہابھارت سمرتیاں نکال ڈالیے۔ ایران سے سعدیؔ، حافظؔ، فردوسی کو علیحدہ کردیجیے، انگلستان والوں کو شیکسپیئر سے محروم کر دیجیے تو ان قوموں کو اپنی روایات تیار کرنے میں اور قومی خصوصیات بنانے میں ہزاروں سال لگیں۔ آپ گھبرائیں نہیں، میں کوئی علمی مباحثہ لکھنے نہیں جارہا ہوں جو کہانی میں آپ کو سنانے والا ہوں وہ روزمرہ کی زندگی سے تعلق رکھتی ہے اور اس میں صرف دو تین جاہلوں کا ذکر ہے۔

بڑے بڑے الفاظ جو کام میں لائے گئے ہیں یہ تو صرف آپ کو مخاطب کرنے کے لیے تھے۔ دل کے اندر چھپا ہوا یہ بھی خیال تھا کہ اگر کوئی بھولا بھالا پڑھنے والا خالی خولی لفظوں سے مرعوب ہوگیا تو ہماری قابلیت کا سکہ اس کے دل پر بیٹھ جائے گا۔ خیر اب قصہ سنیے۔

بہت زمانہ ہوا ایک مرتبہ میں زخمی ہوگیا تھا اور لکھنؤ علاج کے لیے گیا تھا جس مکان میں میرا قیام تھا وہ بہت چھوٹا تھا۔ نیچے کا حصہ مرطوب اور چاروں طرف سے گھرا ہوا تھا۔ جہاں بیمار کے رکھنے کا خیال بھی نہیں کیا جاسکتا تھا۔ کوٹھے پر صرف ایک کمرہ اور ایک کوٹھری اور ایک اتر رخ کا برآمدہ تھا۔ میں تقریباً دن رات اسی برآمدے میں پڑا رہتا تھا۔ یہ برآمدہ راستے پر تھا اور ہوادار تھا۔ سڑک خوب چلتی تھی، اس لیے دل بھی نہیں گھبراتا تھا، جوانی کی طاقت تھی، شور و شغب سے بجائے دماغ پریشان ہونے کے دل بہلا رہتا تھا۔ ایک مرتبہ رات کے دس گیارہ بجے ہوں گے۔ اتفاق سے سڑک پر بالکل سناٹا ہوگیا تھا۔ ہمارے برآمدے کے نیچے روشنی بھی کم تھی کہ ایک شخص ایک عجیب گیت گاتا ہوا نکلا۔ لکھنؤ کے لوگ عموماً سریلے کہلاتے ہیں مگر یہ شخص اس قدر بدآواز اور فن سے دور تھا کہ اس کو سن کر اور اپنی مجبوری پر غصہ چڑھتا تھا۔ حالانکہ اس کے لہجے پر لکھنؤ کا ٹھپّہ موجود تھا گیت کے الفاظ بھی ایسے تھے کہ باوجود دماغ پر زور دینے کے اس میں کسی طرح کا تغزل یا شعریت سمجھ میں نہیں آتی تھی۔ معنی بھی مشکل سے لگائے جاسکتے تھے۔ الفاظ یہ تھے:

''نکھٹو دیکھ لی تاکت مری ناجک کلائی کی۔'' خیر وہ گانے والا تو گاتا ہوا نکل گیا، مگر میں اس کے مفہوم پر پیچ و تاب کھاتا رہا۔ اسی درمیان میں اُس عربی جملے کا بھی خیال آیا جو میں نے شروع میں لکھا ہے اور اس کو بھی میں نے انھیں غلط کہاوتوں میں شمار کیا جن سے دنیا بھری پڑی ہے۔

اس کے کچھ دیر بعد میں سوگیا اور یہ پورا واقعہ دماغ سے محو ہوگیا جس سے ظاہراً کسی کا کوئی نقصان نہ ہوا۔ یاد نہیں پانچ دن کے بعد یا دس دن کے بعد شام کا جھٹپٹا وقت ہے، موسم خوشگوار ہے، ٹھنڈی ہوا چل رہی ہے۔ میں آرام کرسی پر لیٹا ہوا سڑک کی سیر کر رہا ہوں۔ اتنے میں نظر ایک یکے پر پڑی اس میں علاوہ یکے والے کے دو سواریاں ہیں۔ ایک ذلیل قسم کی رنڈی اور ان کے چاہنے والے، دونوں کے چہروں سے بے فکری اور عیش کا سامان درست ہوجانے پر اطمینان کا انداز معلوم ہوتا ہے۔ یقیناً یہ لوگ پاس ہی کی بھٹی پر سے آرہے ہیں گو ابھی تک چہروں پر شراب کا پورا قبضہ

نہیں ہوا ہے۔

رنڈی ایک طرف پائے دان پر پیر رکھے یکے اور سڑک کی سیدھ سے ۴۵ درجہ کے زاویے پر بیٹھی ہے چہرہ مڑ کر سڑک سے ۹۰ درجہ کے زاویہ پر آگیا ہے۔ یہ اپنے عاشق سے بے پرواہ جیسا کہ عورتوں کا قاعدہ ہے۔ رات کے لیے گاہک ٹھیک ہوجانے کی وجہ سے راہ کے آنے جانے والوں سے بے غرض سیر میں مصروف ہے۔ مرد دوسری طرف بیٹھا ہے مگر وہ بجائے اور سیر تماشا دیکھنے کے مردوں کی عادت کے موافق اسی طرح کھسکتا چلا آتا ہے۔ اب یہ جھک کر اپنا منہ رنڈی کے کاندھے کے قریب لایا اور کوئی لگاوٹ شوخی کی بات کہی۔ الفاظ تو مجھ تک کیا پہنچتے مگر ان کے چہرے سے پتہ چلتا تھا کہ کم سے کم یکہ والے نے ضرور سنے ہوں گے، اور چونکہ ایسے موقعوں پر لوگ صرف مزاج شریف کا حال نہیں پوچھتے نہ جواب میں فقط شکریہ ادا کیا جاتا ہے اس لیے یہ بھی گمان ہوا کہ کچھ ایسا کہا گیا ہوگا جو جرأت دہلوی کے معاملوں سے بھی زیادہ کھلا ڈلا رہا ہوگا۔ اس رنڈی نے تیوریوں پر خفیف بل ڈال کر سنا اور اوپر کا ہونٹ نام کو چڑھایا اور نہایت اطمینان سے اپنے بازو کو ایسی جنبش دی کہ کہنی عاشق صاحب کے بیچو بیچ منہ پر پڑی، یکے کی جنبش نے کہنی کی حرکت کو زور بخشا اور عاشق کی ٹھڈی اوپر اٹھ گئی، ہونٹوں کی لمبائی نے گولائی اختیار کی، منہ کی خیریت پوچھنے کو عاشق صاحب کی پانچوں انگلیاں پہنچیں اور میری سمجھ میں آگیا کہ ''نکھٹو دیکھ لی تاکت میری ناجک کلائی کی'' معنی دار مصرعہ ہے جس میں بے صبروں کے لیے نصیحت ہے۔

O

آنکھوں کی سوئیاں

میرے دوست کو مہاراجہ صاحب کی راجدھانی دیکھنے کا بڑا اشتیاق تھا۔ میرے منھ سے جوں جوں باتیں سنتے تھے ان کا اشتیاق اور زیادہ ہوتا جاتا تھا۔ خصوصاً قلمی کتابوں کا، ہمیشہ واقعات بیان کرنے کے بعد میں ان کو دعوت بھی دیتا تھا مگر ان کا کام ایسا تھا جس میں فرصت بہت کم ہوتی ہے آخر کار ایک بار بڑے دن کی تعطیل میں وہ آہی گئے۔ مہاراجہ صاحب دو تین دن کو کلکتہ گئے ہوئے تھے، اس لیے شاہی محل کی سیر میں اور آسانی ہوگئی۔ پرانا قلعہ دیکھا، مہمان خانہ دیکھا جس محل میں دربار کا ہال تھا اور جہاں پرانے اسلحہ رکھے تھے اور کتب خانہ تھا وہاں گھومے پھرے۔ شہر سے باہر نکل کر ایک جگہ شکارگاہ کے نام سے مشہور تھی وہاں گئے۔ راستے میں ایک کوٹھی پڑتی ہے جو خود تو ایسی عالی شان نہیں ہے مگر باغ اس کا لاجواب ہے وہ دیکھا۔ یہ باغ موجودہ مہاراجہ صاحب کے دادا کے وقت کا ہے اور ہمیشہ تفریح کی جگہ سمجھا گیا ہے مگر آج کی ایسی سجاوٹ کسی زمانہ میں نہ رہی ہوگی۔ جس باغ کے نشیب و فراز بنانے میں دو تین برس کے اندر کئی لاکھ روپیہ صرف کیا گیا ہو اس کا اچھا ہونا کون سی تعجب کی بات ہے اس باغ میں شام کو تفریح کے لیے عام اجازت ہے البتہ جب مہاراجہ صاحب وہاں خود مقیم ہوتے ہیں تب پہرہ ہوتا ہے اور کوئی جانے نہیں پاتا۔ میرے دوست نے اندر چلنے کی خواہش ظاہر کی مگر میں ٹال گیا جب دوبارہ اصرار ہوا تب مجھ کو بتانا پڑا کہ آج کل وہاں مہاراج کی نئی نظر کردہ...... جان رہتی ہیں، اس وجہ سے ہم لوگ وہاں نہیں جاسکتے لیکن میں نے کہا چلو تم کو وہ نئی عمارت دکھا لائیں جو سنا جاتا ہے اسی رنڈی کے لیے بن رہی ہے اور جب تیار ہوجائے گی تو لوگوں کا خیال ہے کہ مہاراجہ صاحب اس کو چھوٹی مہارانی بنالیں گے۔ اس نئی عمارت تک مہاراج نے ایک سڑک نکلوائی ہے جو شہر کے تین طرف پھرتی ہوئی جاتی ہے اور ہوا کھانے کے لیے اس سے بہتر دوسری سڑک شہر میں نہیں ہے مکان کا صرف پھاٹک ہی تیار ہوا ہے باقی تو ابھی نیو ہی بھری گئی ہے

لیکن تب بھی پتہ چلتا ہے کہ حاصل تیاری پر یہ عمارت بھی کوئی چیز ہوگی۔ ہمارے دوست کو مکان سے زیادہ اس رنڈی کو دیکھنے کا اشتیاق ہوگیا۔ میں نے یقین دلایا کہ یہ کوئی مشکل بات نہیں کیونکہ وہ اس وقت تک پردے میں نہیں تھی اور امید تھی کہ تفریح کے اوقات میں کہیں نہ کہیں سامنا ہو ہی جائے گا۔ پھاٹک کی بلندی اور طرز تعمیر دیکھ کر ہمارے دوست کے دل میں رنڈی کے دیکھنے کا شوق اور زور پکڑ گیا۔ واقعی اس کو دیکھ کر فتبارك الله احسن الخالقين پڑھنے کو دل چاہتا تھا۔ بہتر سے بہتر عورت میں بھی کوئی نہ کوئی کمی ضرور محسوس ہوتی ہے مگر اس پر نظر ڈال کر کہیں سے خامی کا خیال بھی دل میں نہیں گزرتا تھا۔ چہرہ، مہرہ، نک سک، ڈیل ڈول، چھب، تختی، اتار چڑھاؤ، رنگ روپ، گات گولائی ہر چیز معلوم ہوتا تھا کہ خدا نے اپنے ہاتھ سے بنائی ہے۔ پیازی رنگ کی ساڑی چہرہ سے ایسی مل جاتی تھی، گویا کپڑے نے گالوں کی رنگت کی نقل اتاری ہے۔ گردن اگر ادھر ادھر پھرتی تھی تو گلے کی رنگت ایسی پھوٹی نکلتی تھی گویا پان کی سرخی جلد سے جھلک رہی ہے۔

ہم لوگ یہی ذکر کرتے ہوئے پھاٹک کی دو منزلیں طے کرکے چھت پر پہنچ گئے جہاں سے تمام شہر کی سیر مفت تھی۔ گویا اتنے زینوں کے چڑھنے کا انعام مل گیا تھا۔ ہم لوگ پہنچے ہی تھے اور ابھی سانس بھی ٹھیک نہیں ہوئی تھی کہ ہمارے دوست کو اس سے بڑا انعام ملتا ہوا معلوم ہوا۔ یعنی اس نئی سڑک پر بہت دور سے زرد رولز رائیس آتا دکھائی دیا۔

میں نے کہا اے لو تمھاری وہ مراد بھی پوری ہوگئی وہ دیکھو اس کا کار آرہا ہے۔ میرے دوست نے یہ سن کر اترنا شروع کیا اور دو دو تین تین زینے پھاندتے ہوئے بڑی تیزی سے نیچے آنے لگے تاکہ کار پہنچنے کے پہلے ہی یہ پھاٹک پر پہنچ جائیں، میں اتر ہی رہا تھا کہ یہ پہنچ گئے اور اس بیتابانہ انداز سے پہنچے کہ میں اپنے دل میں ان کی بے قراری کے مزے لے رہا تھا۔ میں آخری زینے پر تھا کہ اتنے میں دیکھتا کیا ہوں کہ ان کا شوق مایوسی سے بدل گیا اور چہرہ یکبارگی اتر گیا۔ ایک قدم آگے بڑھ کر میں نے بھی چاہا کہ اس کی وجہ دریافت کروں اتنے میں کار بھی پھاٹک کی طرف مڑ گیا۔ اب دیکھتا کیا ہوں کہ اس کار میں بجائے اس رنڈی کے صرف ایک بڑا موٹا بھڑوا اور ایک نہایت دبلی بوڑھیا نائکہ بیٹھی ہے۔

O

میٹھے بول

لکھنؤ کی زبان کی شستگی، لکھنؤ کا انداز گفتگو لکھنؤ ہی پر ختم ہے۔ باہر والوں نے عمریں یہاں صرف کی ہیں۔ مگر بیرونی کے بیرونی رہے، بارہ برس دہلی میں رہے مگر بھاڑ ہی جھونکا کیے۔ اگر بڑی کوشش سے کچھ محاورے یاد بھی کرلیے تو ان کا استعمال شہری اور دیہاتی کا فرق کھول دیتا ہے، اگر اس میں بھی کامیاب ہوگئے تو زبان کی موچ نہیں نکلتی۔ عجیب بات ہے کہ شہر کے احاطے سے دو چار کوس کا بھی رہنے والا فوراً پہچان لیا جاتا ہے۔ علاوہ زبان کے کچھ خصوصیات لکھنؤ کی اور بھی ہیں۔

طرز معاشرت، ملنے جلنے کا انداز، مخاطب کرنے کا طریقہ، جواب دینے کا ڈھنگ، ہر چیز یہاں کی خاص ہے۔ یہ دعویٰ کوئی نہیں کرتا کہ ہر بات اچھی ہی ہے مگر یہ ضرور ہے کہ نرالی ہے۔ ٹکسالی زبان سب کی نہیں ہے۔ مگر خواہ وہ ٹکسالی زبان ہو، محلات کی زبان ہو، یا بازاری ہو لکھنؤ کی مہر سب پر لگی ہوئی ہے۔ انداز میں نزاکت، برتاؤ میں نرمی یہاں عیب کی حد تک پہنچ گیا ہے جس پر باہر والوں کو تعجب بھی ہوتا ہے، ہنسی بھی آتی ہے اور بعض اوقات نفرت تک ہوتی ہے۔ ایک بار میں تانگے پر چلا جاتا تھا۔ رات زیادہ ہوگئی تھی۔ مجمع چھٹ چکا تھا، ہمارے تانگے کے سامنے ایک صاحب بیچوں بیچ سڑک پر چلے جاتے تھے، تانگے والے نے پکار کہا ''ابا ہٹ جائیے'' وہ صاحب بغیر مڑے ہوئے پٹری پر چلے گئے۔ جب تانگہ برابر آیا تو میں نے دیکھا کہ تانگے والے اور ان صاحب کے سن میں باپ بیٹے کا فرق کسی طرح نہیں تھا۔ میں نے اس سے تعجب کے لہجے میں پوچھا ''ارے میاں یہ تمھارے ابا ہیں'' کہنے لگا ''جی نہیں حضور، ابا وبا کچھ نہیں ہیں، اِنھیں میٹھے بولوں سے آج تک کسی سالے نے چالان نہیں بولا۔''

○

تیسری جنس

مدّی کا اصلی نام احمدی خانم تھا۔ تحصیلدار صاحب پیار سے مدّی مدّی کہتے تھے۔ وہی مشہور ہوگیا۔ مدّی کا رنگ بنگال میں سو دو سو میں اور ہمارے صوبہ میں ہزار دو ہزار میں ایک تھا۔ جس طرح فیروزے کا رنگ مختلف روشنیوں میں بدلا کرتا ہے اسی طرح مدّی کا رنگ تھا۔

تھی تو کھلتی ہوئی سانولی رنگت جس کو سبزہ کہتے ہیں مگر مختلف رنگ کے دوپٹوں یا ساڑیوں کے ساتھ مختلف اثر پیدا ہوتا تھا۔ کسی رنگ کے ساتھ دمک اٹھتا تھا۔ کسی رنگ کے ساتھ ٹمٹماہٹ پیدا کرتا تھا۔ بعض اوقات جلد کی زردی میں سبزی ایسی جھلکتی تھی کہ دل چاہتا تھا دیکھا ہی کرے۔ شمع کی روشنی میں مدّی کی رنگت تو غضب ہی ڈھاتی تھی۔ کبھی آپ نے دوسرے درجہ کی مدقوق کو دیکھا ہے۔ اگر بیماری سے قطع نظر کیجیے تو رنگت کی نزاکت ویسے ہی تھی۔ آنکھیں بڑی نہ تھیں، مگر جب نگاہ نیچے سے اوپر کرتی تھی تو واہ واہ۔ معلوم ہوتا تھا مندر کا دروازہ کھل گیا دیبی جی کے درشن ہوگئے، مسکراہٹ میں نہ شوخی نہ شرارت، نہ بنوٹ کی شرم نہ لبھاوٹ کی کوشش، لکڑی لوہے کے قلم کو کیسے موقلم کردوں کہ آپ کے سامنے وہ مسکراہٹ آجائے۔

بس یہ سمجھ لیجیے کہ خدا نے جیسی مسکراہٹ اس کے لیے تجویز کی تھی وہی تھی۔ مدّی اس میں اپنی طرف سے کوئی اضافہ نہیں کرتی تھی اس کے کسی انداز میں بنوٹ نہ تھی۔ ہاتھ پاؤں، قد، چہرے کے اعضا سب چھوٹے چھوٹے مگر واہ رے تناسب، آواز، ہنسی، چال ڈھال ہر چیز ویسی ہی۔ میں مدّی سے بہت بے تکلف تھا، مگر عشاق میں کبھی نہیں تھا اور جہاں تک میں جانتا ہوں کوئی اور بھی نہیں سنا گیا۔ ایسی خوبصورت عورت بلا مرد کی حفاظت کے زندگی بسر کرے اور عشاق نہ ہوں۔ بڑے تعجب کی بات

ہے مگر واقعہ ہے۔ ایک روز میں نے کہا مدّی اگر ہم جادوگر ہوتے تو جادو کے زور سے تم کو تتلی بنا کر ایک چھوٹی سی ڈبیا میں بند کرکے اپنی پاکٹ میں رکھ لیتے۔ اس فن شریف سے واقف کار حضرات جانتے ہیں کہ جو حربہ میں نے استعمال کیا تھا وہ کم خالی جانے والا تھا مگر اس نے بھی جواب میں وہی بے تکلف مسکراہٹ کی ڈھال جو تلوار کا منھ موڑ دے۔

اس سادگی پہ کون نہ مر جائے اے خدا
لڑتے ہیں اور ہاتھ میں تلوار بھی نہیں

اکثر خیال گزرتا ہے کہ یہ استغنا تحصیلدار مرحوم کی سفید داڑھی کے سائے میں پرورش پانے کا اثر ہے مگر پھر عقل کہتی تھی کہ جوش حیات نے نہ معلوم کتنی سفید داڑھیوں میں پھونکا ڈالا ہے، وہ سفید داڑھی قبر میں بھی پہنچ گئی اس کا اثر کہاں سے آیا۔ بہرحال قصہ سنتے جائیے اور رفتہ رفتہ رائے قائم کرتے جائیے۔ مدّی کے ہر انداز میں نسوانیت کوٹ کوٹ کر بھری تھی، ایک بات البتہ تھی جو گو عورتوں میں بھی ہوتی ہے مگر ہم ایسے بورژوا لوگ اس کو مرد ہی سے منسوب کرتے ہیں۔ یعنی اپنے ہم طبقہ عورتوں میں اور اسی طبقہ کے مردوں میں مدّی حکومت خوب کرلیتی تھیں۔ ہر شخص عورت ہو کہ مرد ان کا تابع فرمان رہتا تھا اور ان کے اشارے پر چلنے کو تیار رہتا تھا۔ اب شروع سے قصہ سنیے۔ تحصیلدار صاحب کا نام کیا کیجیے گا جان کر۔ مرحوم بڑے اچھے آدمی تھے۔ مگر بے عیب ذات خدا کی، کچھ خاص خاص کمزوریاں کہی جاتی تھیں۔ پرانی وضع کے لوگ تھے، بڑی شان کی تحصیلداری کی، لاکھوں کمائے اور ہزاروں اڑائے، مگر اولاد نہ ہونے کی وجہ سے ان کی زندگی کچھ بے مرکز کی سی ہوگئی تھی۔ بی بی بہت دن ہوئے مرچکی تھیں کوئی قریب کا عزیز بھی نہ تھا۔ صرف ایک نوکر تھا وہی سیاہ سپید کا مالک تھا۔ تنخواہ اسی کے ہاتھ آتی تھی اور جب پنشن ہوئی تو پنشن کا بھی وہی حق دار ٹھہرا۔ میاں کے کپڑے اور کھانا بھی میاں حسن علی پسند کرتے تھے۔ حسن علی کسی کام کو بازار گئے دو تھان رادھانگری ڈوریئے لیے چلے آتے ہیں۔ میاں کے کرتے بنیں گے، مگر میاں کو صرف اس وقت خبر ہوئی جب درزی قطع کرنے لگا۔

ارے میاں حسن علی یہ ڈوریا کیسا لائے ہو۔

حسن علی: آپ کے کرتوں کے لیے، ڈوریا وضع دار ہے سلنے پر اور کھلے گا۔

کھلے گا تو مگر کرتے تو میرے پاس تھے۔ ابھی اس دن شربتی لے آئے۔ آج ڈوریا لیے چلے آتے ہیں، آخر پوچھ تو لیا ہوتا۔

پوچھ کے کیا کرتا، آپ یہی تو کہتے کہ رہنے دو۔ گھر میں ایک چیز ہوگئی برسات کا زمانہ ہے، دھوبی دیر میں آیا کرے گا۔ دو جوڑے فاضل اچھے ہوتے ہیں۔

خیر بھئی۔

تحصیلدار کھانے پر بیٹھے ہیں، میاں حسن علی آج کل بازار میں مچھلی نہیں آتی؟

آتی تو ہے مگر گرمیوں کی وجہ سے میں نے نہیں منگوائی۔ اس فصل میں مچھلی نقصان کرتی ہے۔ صبح کو مرغ پک جائے گا۔ تحصیلدار صاحب پر حسن علی کی شخصیت کچھ ایسی غالب آئی تھی کہ جو بات وہ پسند کرتے تھے، تحصیلدار صاحب سمجھتے تھے کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے۔ اسی وجہ سے غیر ذمہ دار لوگ دونوں کا ذکر کر کے مسکراتے تھے اور آپس میں آنکھیں مارتے تھے۔ میاں حسن علی کا استرے سے صفاچٹ چہرہ اور تحصیلدار صاحب کی جھبوا داڑھی پر چہ میگوئیاں ہوتی تھیں۔ داڑھی مونچھوں کا صفایا صرف انگریزی داں حضرات کا حق ہے۔ اگر حسن علی ایسے اپنی چال چھوڑ کر ہنس کی چال چلیں گے تو اللہ ہی نے کہا ہے لوگ کوئی نہ کوئی فی نکالیں گے۔

بہرحال اصلیت کی خبر خدا کو ہے۔ ہم تو جو کچھ دیکھتے تھے وہ یہ تھا کہ تحصلیدار کا ہمدرد دنیا جہان میں حسن علی کے علاوہ کوئی نہ تھا۔ حسن علی کو بھی اس سے اچھا آقا اگر چراغ لے کر ڈھونڈتے تو نہ ملتا۔

اللہ میاں نے دو جنسیں بنائی تھیں عورت اور مرد۔ یورپ کے ڈاکٹروں نے تحقیقات کر کے ایک اور جنس ایجاد کی ہے جو اپنی ہی جنس کی طرف راغب ہو اس جنس میں عورتیں بھی شامل ہیں اور مرد بھی اب نہ معلوم تحصیلدار اور حسن علی اسُ تیسری جنس میں سے تھے یا ویسے ہی تھے جیسے ہم آپ یا بعد کو کچھ ادل بدل ہوئی اس کو نہ ہم

جانتے ہیں نہ جاننے کی کوشش کرتے ہیں، وہ جانیں اور ان کا کام۔ ظاہر بظاہر ان دونوں کے افعال سے دوسروں کی سماجی زندگی میں کوئی فرق نہیں پڑتا تھا اس لیے ہم کو کھوج کی ضرورت بھی نہیں معلوم ہوتی۔ تحصیلدار صاحب بھاری بھرکم آدمی تھے اولاد نہ ہونے کا دکھڑا کیا روتے مگر اولاد کی تمنا اس بات سے ظاہر ہوتی تھی کہ جب کھانا کھاتے تو حسن علی کی لڑکی احمدی کو بلوا بھیجتے تھے کہ دسترخوان پر بیٹھ جائے۔ اسی وجہ سے کھانا تنہائی میں کھانے لگے تھے۔ نوکر کی لڑکی کو دسترخوان پر کھلاتے کچھ اچھا نہیں لگتا تھا۔ اس کے علاوہ اگر سب کے سامنے کھلاتے تو صاحب اولاد نہ ہونے کا رنج اور بچوں کی تمنا لوگوں پر کھل جاتی۔ بی احمدی خانم عرف مدّی بیگم کا سن چار برس کا رہا ہوگا۔ دسترخوان پر شوربہ گرانا، لقمہ ڈبونے میں دال کا پورا پیالہ گھنگول دینا بچوں کا شیوہ ہے اور نفیس مزاج لوگ اسی وجہ سے بچوں کو الگ کھلاتے ہیں گو کہتے ہیں کہ جوانوں والا کھانا بچوں کو نقصان کرتا ہے مگر تحصیلدار صاحب کو اس میں لطف آتا تھا۔ ادھر دسترخوان پر بیٹھے ادھر بی مدّی کی طلب ہوئی۔ رفتہ رفتہ مدّی خود وقت پہچان گئیں۔ تھوڑے دنوں میں مدّی تحصیلدار صاحب ہی کے یہاں رہنے لگیں۔ یا تو گھر میں ایک طرف یہ ایک طرف چھوٹا بھیا اور بیچ میں حسن علی کی بی بی تھیں۔ یا ان کی پلنگڑی الگ بنی۔ صاف چادر لگائی گئی، چھوٹے تکیے بنوائے گئے۔ تحصیلدار صاحب کے پاس ان کی بھی پلنگڑی بچھنے لگی۔ جوتی پہنے رہنے کی تقید ہوئی کہ بچھونا میلا نہ ہو، لڑکی تھی، پیدائشی سلیقہ مند، ایک بار سے دوسری بار بتانے کی ضرورت نہیں ہوتی تھی۔ پانچ ہی چھ برس کے سن میں ایسا سلیقہ آگیا کہ آدھی بی بی معلوم ہوتی تھی۔ تحصیلدار صاحب کے پان خود بناتی تھی دس گیارہ برس کے سن میں جنس تلوانا، کھانا پکوانا، سب کچھ مدی کے ہاتھ ہوگیا تھا۔ دن جاتے کچھ دیر نہیں لگتی۔ چودھویں برس بی مدّی کا شباب دمک اٹھا، دیکھنے والوں کا دل چاہتا کہ دیکھا ہی کریں۔ مدّی بھی جب بال بنانے کھڑی ہوتی تھیں تو آئینے کے ساتھ خود بھی متحیر رہ جاتی تھیں۔ اب ماں کو شادی کی فکر ہوئی۔ تحصیلدار صاحب سے کہا گیا۔ انھوں نے کہا کیا جلدی ہے ہوجائے گی مگر لڑکی حسن علی کے بھتیجے کو بچپن ہی سے مانگی تھی۔ ادھر سے بھی اصرار ہوا کہ جوان لڑکی کا امیروں کے گھر میں

رہنا اچھا نہیں لیجیے صاحب شادی ہوگئی۔ تحصیلدار صاحب نے خود تو اپنے گھر سے شادی نہیں کی مگر جہیز وغیرہ خوب سا دیا۔ چوتھی چالے کے بعد پھر وہی تحصیلدار صاحب کے یہاں رہنا سہنا۔ مدّی کے دولھا بھی تحصیلدار ہی صاحب کے یہاں آتے تھے۔ مدّی سسرال کم جاتی تھیں، گئیں بھی تو کھڑی سواری، بہت رہیں تو ایک رات نہیں تو اسی دن واپس آگئیں۔ سسرال والے جاہل، شوہر بھی الف کے نام لٹھا نہیں جانتے، گو مدّی بھی بغدادی قاعدہ اورعم کے سیپارے کے آگے نہیں پڑھی تھیں۔ مگر پھر بھی پڑھے لکھے کی پالی ہوئی تھیں۔ عمر بھر امیری کارخانہ دیکھا تھا۔ مدّی کا دل سسرال میں کم لگتا تھا۔ کم سنی میں بیاہ کا تجربہ کچھ اچنبھے میں ڈالے تھا۔ شادی کے بعد اگر عورت پر کنوارپنے کی آب نہیں رہ جاتی تو سہاگ کی رونق چہرہ چمکا دیتی ہے۔ مگر احمدی کے چہرے پر نہ اسی بات کا پتہ چلتا تھا نہ اسی کا۔ میاں بی بی کے برتاؤ کا حال دو چار دن میں کیا کھلتا، مگر کسی خاص خوشی یا اطمینان کا انداز اس میں بھی نہیں دکھائی دیتا تھا، کچھ ہی دنوں میں یہ بھی نہ رہ گیا اور کھلم کھلا ناخوشی کے آثار ظاہر ہونے لگے۔ شوہر صاحب بھی کچھ دبے دبے سے تھے۔ تحصیلدار صاحب کے یہاں وہ بھی اپنی شوہریت کا برتر درجہ برت نہیں سکتے تھے لیکن خود اپنی ہیچ میرزئی اور بی بی کی بلندی ان کی نظر میں کھٹکتی تھی۔ ضرورتیں مجبور کرتی تھیں۔ نئی نئی بی بی کچھ روپیہ پیسہ بھی ہاتھ آجاتا تھا اس لیے چپ تھے۔ ایک دن ایسا اتفاق ہوا کہ مدّی جو سو کر اٹھیں تو ایک چھڑا غائب، بستر پر ادھر ادھر دیکھا، دلائی جھاڑی، پائینتی جھک کے دیکھا، مگر پتہ نہ چلا۔ گھر میں ادھر ادھر تلاش کیا مگر کہیں نہ ملا، نہ معلوم کیا سمجھ کر چپ ہوگئی۔ دوپہر کے قریب ماں سے ذکر کیا، ماں نے شور مچا دیا۔ تحصیلدار صاحب تک خبر ہوئی انھوں نے سنتے ہی کہہ دیا کہ یہ حرکت سوا مدّی کے دولھا کے اور کسی کی نہیں ہوسکتی۔ یہ بھی کہا کہ اس کے جوا کھیلنے کی خبر بھی مجھ تک پہنچ چکی ہے۔ لیجیے صاحب شوہر روٹھ گئے۔ دو چار دن کے بعد رخصتی کا اصرار ہوا۔ مگر چھڑے والی بات کی آڑ پکڑ کر مدّی کے ماں باپ نے انکار کردیا۔ ایک روز مدّی کے شوہر نے حسن علی کے گھر آکر بہت سخت سست سنایا اور غصہ میں یہ بھی کہا کہ حرام زادی کو جھونٹے پکڑ کر گھسیٹتا نہ لے جاؤں تب ہی کہنا۔ اس وقت

تک مدّی نے کسی کی جنبہ داری نہیں کی تھی، لیکن اب وہ بھی فرنٹ ہوگئی اور ایسی فرنٹ ہوئی کہ مرتے دم تک پھر منہ نہ دیکھا۔ حسن علی نے بھی خیال کیا داماد ممکن ہے کچھ شہدہ پن ہی کر بیٹھے۔ اس لیے مدّی کا پورے طور سے تحصیلدار ہی صاحب کے یہاں رہنا اچھا ہے۔ شوہر صاحب ہمیشہ کے لیے معطل کردیے گئے۔

جب سے مدّی کی شادی ہوگئی تھی تحصیلدار صاحب کچھ چپ سے رہتے تھے۔ اس واقعہ کے بعد وہ بھی بحال ہوگئے۔ مدّی کے شوہر نے اپنی سفاہت سے یہ بھی کہا کہ تحصیلدار صاحب نے اس سے آشنائی کر رکھی ہے مگر اس کو کون باور کرتا۔ حسن علی والی بات پر تو لوگ ہنسی مذاق بھی کرتے تھے مگر اس بات کو کسی نے جھوٹوں بھی یقین نہ کیا۔ البتہ تحصیلدار صاحب تجربہ کار آدمی تھے۔ انھوں نے موت زندگی کا خیال کرکے مدّی کے لیے علیحدہ گھر اور کچھ بودگی کا انتظام کرنا شروع کیا۔ اس واقعہ کے دوسرے ہی سال کے اندر تحصیلدار صاحب کا انتقال ہوگیا۔ تحصیلدار صاحب مرحوم کے یا تو کوئی نہیں تھا یا یکبارگی نہ معلوم کتنے وارث پیدا ہوگئے اور آپس میں مقدمہ بازی شروع ہوگئی۔ بی مدّی نے بھاری پتھر چوم کے چھوڑا۔[1] اٹھ کر اپنے گھر چلی آئیں، تخت، چارپائیوں، الماریوں پر نہ ان کا حق تھا نہ انھوں نے دعویٰ کیا۔ نقدی جو کچھ تحصیلدار صاحب ان کو دے گئے ہوں گے وہ کون لے سکتا تھا، ہاتھ ناک گلے میں جو کچھ تھا وہ ان کا تھا ہی۔ مدّی نے حسن علی کی صلاح سے یہ طریق اختیار کیا کہ اپنے طبقے سے اونچی ہوکر رہنا پسند نہ کیا بلکہ جس حیثیت کے لوگ ان کے ماں باپ تھے اسی برادری میں رہیں۔ البتہ روپیہ پیسہ اور سلیقہ ہونے کی وجہ سے اپنے طبقے میں یوں رہیں جیسے مالی کی ڈالی میں سب پھولوں میں گلاب کا پھول ہوتا ہے۔

تحصیلدار صاحب کے انتقال کے سال ہی بھر بعد طاعون بڑے زوروں کا پڑا اس میں میاں حسن علی اور ان کی بی بی بھی چل بسیں اب صرف بی مدّی اور ان کا چھوٹا بھائی رہ گئے۔

اس وقت تک مدّی نے دنیا میں جو کچھ اچھا برا کیا ہوگا اس کی ذمہ داری صرف

1۔ کسی کام کو مشکل سمجھ کر چھوڑ دینا۔

ان کے اوپر نہ تھی کیونکہ ہر معاملہ میں تحصیلدار مرحوم اور اس سے کم درجہ تک ان کے باپ کی رائے شامل رہتی تھی۔ اس کے بعد جو کچھ پیش آیا وہ البتہ ان کے دل و دماغ کا نتیجہ تھا۔ مدّی کا برتاؤ ہر شخص سے عمدہ تھا۔ کوئی شاکی نہ تھا، بلکہ اڑوس پڑوس کی عورتیں ہر وقت ان کے گھر میں موجود رہتی تھیں۔ ان سے بھی جو ہوسکتا تھا آنے جانے والیوں کے ساتھ سلوک کرتی تھیں گھر میں کپڑا سینے کی مشین تھی۔ دن بھر لوگوں کے کپڑے مفت سیا کرتی تھیں کسی کو اگر روپیہ دو روپیہ کی ضرورت ہوئی تو وہ بھی قرض کے نام سے دے دیے۔ جس کسی کا کہیں ٹھکانا نہ لگے وہ بی مدّی کے یہاں چلا آئے۔ روٹی اپنی پکائے دال بی مدّی کی ہانڈی سے لے لے، پان پتا بھی بی مدّی کے پاندان سے کھائے۔ اسی زمانے میں ایک عورت نہ معلوم کہاں کی باہر سے آئی۔ اس کو بھی بی مدّی نے رکھ لیا۔ عورت سلیقہ مند تھی، اپنا بار بھی ان پر نہیں ڈالتی تھی۔ بلکہ پیسہ دو پیسہ کا سلوک خود ہی کردیتی تھی۔ کچھ انگوٹھیاں اور کچھ کیلیں، لیس، صابون وغیرہ بیچتی تھی۔ صبح ہوئی اور برقع اوڑھ کر نکل گئیں۔ دوپہر کو آئیں، کھانا کھایا، آرام کیا، اس کے بعد پھر نکل گئیں۔ شام کو لوٹیں، یہ مسماۃ آئی تھیں تو یہ کہہ کر دوچار دن میں سودا کرکے دوسری جگہ چلی جائیں گی، مگر مدّی سے کچھ ایسی پرگت ملی کہ گھر کی طرح رہنے لگیں۔ محبت یگانگی کی وہ پینگیں بڑھیں کہ سگی بہنیں مات تھیں، صورت شکل کی تو معمولی تھی مگر قدکشیدہ تھا، جب برقعہ اوڑھ کر راستہ چلتی تھی تو معلوم ہوتا تھا کہ مرد بھیس بدلے ہوئے چلا آتا ہے۔ چال ڈھال قد کے علاوہ بھی کچھ اور باتیں مردوں کی ایسی تھیں۔ مثلاً ہاتھ پاؤں کے دیکھتے سینہ کم تھا، کمر، کولے، پاؤں کی چوڑی چوڑی ایڑیاں بھی عورتوں کی ایسی گول نہ تھیں۔ تھوڑے سے ہی دنوں میں یہ ہوگیا کہ دن کو تو ویسا ہی مجمع رہتا تھا، مگر رات کو دوسری عورتیں گھر میں کم رہنے لگیں۔ جب منہ نہیں پایا تو پرائے گھر میں کیسے ٹھہرتیں۔ پہلے تو عورتوں میں سرگوشیاں ہوئیں پھر محلے میں ہر شخص اسی کا ذکر کرنے لگا۔ مگر مدّی اور اس عورت نے بجائے تردید کرنے کے ایک آزادانہ بے پروائی کا انداز اختیار کرلیا۔ اس عورت نے کہا ہم لوگ کسی کی بہو بیٹی ہیں یا پھر سے نکاح کرنا ہے جو ہر شخص کے آگے قسمیں کھاتے قرآن اٹھاتے پھریں۔ دنیا اپنی

راہ ہم اپنی راہ۔ مدّی نے کہا اگر ہمارے کوئی والی وارث ہوتا تو کسی کی مجال پڑی تھی کہ ایسی بات کہتا۔ زمانہ گزرتا گیا اور لوگوں کا شک یقین سے بدلتا گیا۔ قاعدہ ہے کہ پنچ برادری سے اگر دب جاؤ تو وہ اور دباتے ہیں اگر مقابلے پر تیار ہوجاؤ تو لوگ اپنی نیکی کی وجہ سے اکثر معاف بھی کردیتے ہیں۔ یہی حال ان دونوں کا ہوا کہ نہ کسی نے پھر پوچھ گچھ کی نہ انھوں نے انکار کی زحمت اٹھائی۔

لکھنے والے کو اغلام مساحقے کے ذکر میں کوئی مزا نہیں آتا مگر اسی کے ساتھ ان چیزوں کا ذکر کرنے سے ڈرتا بھی نہیں۔ اگر یہ چیزیں دنیا میں ہوتی ہیں تو چپ رہنے سے ان میں اصلاح نہ ہوگی، نہ یہ طے ہوسکے گا کہ کہاں تک یہ چیزیں فطری ہیں اور کہاں تک اسباب زمانہ سے پیش آتی ہیں۔ کسی جولاہے کے پاؤں میں تیر لگا تھا، خون بہتا جاتا تھا مگر دعائیں مانگ رہا تھا کہ اللہ کرے جھوٹ ہو۔

ہمارے قصّے کے لوگ بدقسمتی سے ہیولاک ایلس اور فرائڈ نہیں پڑھے ہیں، اس وجہ سے مجبوراً ہم کو ان مسائل پر بحث کرنی پڑی۔

ڈاکٹروں کا خیال ہے کہ ہر عورت میں کچھ جزو مرد کا ہوتا ہے اور ہر مرد میں کچھ جزو عورت کا جو جزو غالب ہوتا ہے اسی طرح کے خیالات اور افعال ہوتے ہیں۔ مردانہ قسم کی عورتیں اور زنانہ قسم کے مرد ہر جگہ دکھائی دیتے ہیں ممکن ہے بعض ان میں ایسے ہوں جن کو فطرتاً اپنی ہی جنس سے تعلقات اچھے معلوم ہوتے ہوں مگر اس میں بھی کوئی کلام نہیں کہ اسباب زمانہ سے لوگ بھی اس راہ لگ جاتے ہیں۔ بجائے اصلاح کی کوشش کے ہر معاملہ میں یہی رائے قائم کرنا کہ یہ قدرتی تقاضے سے ہے اور اس لیے اصلاح کی ضرورت نہیں، ہمارے سمجھ میں نہیں آتا۔ البتہ ایسے فعل کی جس میں سماج کا کوئی نقصان نہ ہوتا ہو قانونی سزا ہونی چاہیے یا نہیں، یہ دوسرا مسئلہ ہے۔

اچھا اب قصہ سنیے مدّی اور اس عورت سے دو سال دوستی رہی۔ اس کے بعد لڑائی ہوگئی، کس بات پر بگاڑ ہوگیا یہ کسی کو معلوم نہیں۔ وہ عورت جس راہ آئی تھی اسی راہ چلی گئی۔ بی مدّی اجڑی پجڑی رنڈاپا کھینے لگیں۔ جوئندہ پایندہ تھوڑے دنوں کے بعد ایک اور ہم جنس مل گئیں، اس کے بعد اور بھی ملاکیں مگر ۔

نہ بیوفائی کا ڈر تھا نہ غم جدائی کا
مزہ میں کیا کہوں آغاز آشنائی کا

وہ پہلی سی بات پھر نہ نصیب ہوئی۔ اب روپیہ پیسہ بھی کم رہ گیا تھا۔ اس لیے آمدنی بڑھانے کی بھی فکر دامن گیر ہوئی۔ بی مدّی نے تحصیلدار کے اعزا کے آگے ہاتھ بڑھایا نہ پھر سے شادی کی ہوس کی بلکہ خود کام کرنے پر تیار ہوگئیں۔ پراٹھے کباب بنانا شروع کیے جاڑوں کی فصل میں انڈے اور گاجر کا حلوہ بنانے لگیں، کچھ عورتوں کی ضرورت کا بساط خانہ بھی منگوالیا۔ چکن کروشیا کا بھی ڈھچر ڈالا، بیچنے والوں کی کمی نہ تھی۔ اردگرد کی لڑکیاں اور عورتیں سودا بیچ لاتی تھیں اور حق المحنت سے زیادہ حصہ پاتی تھیں۔ بی مدّی کو سوداگری کا سب سے بڑا گر نہیں یاد تھا۔ یعنی جو آدمی بہت سے کام ساتھ ہی کرتا ہے وہ کوئی کام نہیں کرسکتا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ خرچ آمدنی سے زیادہ ہی رہا۔ یہاں تک کہ مکان بھی گروی رکھنا پڑا۔

روپیہ جانے کے بعد توقیر میں بھی فرق آجاتا ہے، مگر اس کی شائستگی اور رکھ رکھاؤ ایسا تھا کہ پھر بھی لوگوں کی نظر میں ہلکی نہ ہوئی۔ کپڑے اب بھی سلیقے کے پہنتی تھی، گاڑھا پردہ کبھی نہیں تھا۔ آج بھی سڑک پر ماری ماری نہیں پھرتی تھی۔ تنخواہ والے نوکر کبھی نہیں تھے۔ آج بھی کام کاج کر دینے والے آسانی سے مل جاتے تھے، مگر اقبال مندی میں گھن بہت دنوں سے لگ چکا تھا۔ اس لیے چہرے کی آب رخصت ہوچکی تھی۔ زمانہ بدل جانے سے مزاج میں بھی فرق آگیا تھا۔ ایک دن ان کے گھر عورتیں جمع تھیں، کسی نے کہا بن مرد کی عورت کس گنتی شمار میں ہے۔ بی مدّی بول اٹھیں، سچ کہتی ہو بہن، ایسی بات ان کے منہ سے کبھی نہیں سنی گئی تھی۔ سن کر بعض نے دوسروں کو اشارہ کیا۔ بعض نے اتفاق کیا، دو ایک ایسی بھی تھیں جو مدّی کا منہ تعجب سے دیکھنے لگیں یہ وہ تھیں جنھوں نے مدّی کے منہ سے مرد کا نام بلاناک بھوں چڑھائے عمر میں نہیں سنا تھا۔

زمانہ گزرتا گیا مگر بی مدّی کے دن نہ پھرنا تھے نہ پھرے۔ کچھ دنوں کے بعد ایک شاہ صاحب آئے۔ بہت مرجع خلائق تھے۔ عقیدت مندوں کا ہجوم ہر وقت لگا رہتا

تھا۔ بی مدّی بھی دو تین بار پراٹھے کباب کی نذر نیاز پیش کر چکی تھیں، اتنے میں خبر اڑی کہ شاہ صاحب حج کو جائیں گے۔ ہمیشہ مرغ پلاؤ توکل پر کھایا کیے۔ اب حج بھی توکل پر کریں گے جس دن شاہ صاحب چلے لوگوں نے دیکھا، مدّی بھی دامن سے لگی چلی جا رہی ہیں اور لوگوں سے کہا سنا معاف کرا رہی ہیں جو کچھ بچی کھچی پونجی تھی وہ بیچ کر نقد کر لیا۔ باقی کے لیے شاہ صاحب کی ذات اور توکل کا توشہ کافی ٹھہرا۔ حج سے واپسی پر وطن نہیں آئیں۔ بلکہ شاہ صاحب ہی کے قدموں سے لگی رہیں۔ شاہ صاحب اپنے وقت کے بلعم باعور[1] تھے۔جی چاہے انگلی پر ڈال دیجیے۔ چاہے چادر کی طرح کاندھے پر لٹکا لیجیے۔ مدّی میں جوانی کی کنی گلنے میں اب بھی دیر تھی۔ مگر شاہ صاحب کو دیکھ کر خواب میں بھی آشنائی کا خیال نہیں ہوتا تھا لیکن اگر غور کیجیے تو پیر بھی ایک طرح کا شوہر ہی ہوتا ہے، جس پر مرید اسی طرح تکیہ کرتا ہے جیسے عورت مرد پر۔

○

اپنی گم شدہ تحریروں کا ذکر کرتے ہوئے چودھری صاحب نے اپنے ایک خط میں لکھا ہے۔

''.......... اگر وہاں یہ چیزیں مل جائیں تو اردو کی تاریخ تو کیا اس سے یہ ضرور پتہ چلے گا کہ انگریزی سے کس کس وقت اردو نے کیا کیا لیا۔ آسکر وائلڈ کا مقدمہ فند موت، پیراڈاکس برنارڈ شا کا عزت الکمال ہے۔ اس کے علاوہ ایک کاپی شملہ میں کھو گئی۔ شاید کسی وقت پانی مردے کو اچھال دے تو دو چار افسانے مل جائیں گے، مگر اب ان کا ذکر فضول ہے...... ....''

(ڈاکٹر نورالحسن کے نام خط)

1۔ بلعم باعور لقب ایک عالم بنی اسرائیل کا جس کا نام بلعم تھا اور اس کے باپ کا نام باعور

گھر کی صحبتیں اور کلب

تحصیلدار صاحب بڑے یار باش آدمی تھے۔ ایک قسم کے لوگ ہوتے ہیں جن کو صحبت کا لتیا کہتے ہیں تحصیلدار صاحب ہمارے اسی افتاد طبع کے تھے۔ ان سے اکیلے نہیں بیٹھا جاتا تھا۔ صبح و شام چائے کا دور چلا کرتا تھا، پان حقہ سگریٹ کا کبھی توڑا نہیں ہوتا تھا۔

ہر کجا چشمہ بود شیریں
مردم و مرغ و مور گرد آیند

اول تو عہدے دار اور دوسرے یہ خاطر مدارات احباب یونہی جمع رہتے تھے اور اگر اتفاق سے کوئی نہ پہنچا تو اردلی فوراً موجود رہتا تھا۔ ہمارے قصبہ میں آدمی ہی گے تھے مگر جو تھے ان کے جمع ہونے کی جگہ تحصیلدار صاحب ہی کا گھر تھا۔ ان کا مکان گویا ایک کلب تھا۔ اور یہ کوئی تعجب کی بات نہیں تھی۔ جب تحصیل بھر کے سربرآوردہ لوگ اس خاطر سے ٹھہرائے جائیں گے اور ان کی آرام کا خیال رکھا جائے گا تو کون ایسا ہوگا کہ دوسری بار آنے میں کچھ سوغات نہ لائے گا مختلف قسم کے حلوہ جات، پھل پکوان پٹے پڑے رہتے تھے۔ تحصیل کوردہ تحصیلوں میں تھی مگر تحصیلدار صاحب کے گھر میں سیکڑوں قسم کی چیزیں ہر وقت مہیا رہتی تھیں۔ انھیں باتوں پر نظر کرکے اکثر کہا کرتے تھے کہ میری تعیناتی جس تحصیل میں ہوئی میں نے اسی طرح کا پرائیوٹ کلب ہر جگہ رکھا۔ کلب کے معاملے میں ان کی رائے بہت مضبوط تھی۔ وہ کہا کرتے تھے کہ ہندستانیوں کے لیے کلب قائم کرنا خلاف مصلحت ہے۔ اول تو کلب میں ضابطہ اس قدر ٹھسا ہوا ہے کہ بے تکلفی کا لطف نہیں رہتا، دوسرے کلب میں جوئے کی عادت پڑتی ہے وہ پیسے ہی دو پیسے کا جوا سہی مگر ہے تو جوا۔ اس کے علاوہ کلب میں مختلف مذاق کے لوگ جمع ہوتے ہیں جن سے سوا رسمی باتوں کے دل کھول کر باتیں نہیں

ہوسکتیں۔ پھر اس کے علاوہ خرچ بڑھ جاتا ہے۔ کہا کرتے تھے کہ مثال لے لیجیے۔ یہ غریب خانہ ہے، آپ لوگ نوازش کرتے ہیں چلے آتے ہیں۔ اول تو جن صاحبوں کو یہ صحبت پسند نہ ہوگی وہ آئیں گے ہی کیوں۔ اور جو صاحب آتے ہیں وہ بالکل اپنا گھر سمجھتے ہیں۔ خیال کیجیے آپ تشریف لائے، آپ نے انگرکھا کھونٹی پر ٹانگ دیا اور کوچ پر بہ آرام تمام بیٹھ گئے میں بھی حاضر ہوں، خالی کرتہ پائجامہ پہنے، ننگے سر، پاؤں میں سلیپر پہنے بیٹھا ہوں بھلا یہ آرام کہیں کلب میں ممکن ہے اور دیکھیے فرض کیجیے اس وقت ہماری اور آپ کی رائے ہوئی کہ گانا سنا جائے، اپنے گھر میں بیٹھے ہیں نہ کسی سے پوچھنا نہ گچھنا، قوال آگئے، یا کوئی گویا بلا لیا گیا نہیں تو کوئی زنانہ طائفہ بلا لیا گیا۔ آٹھ دس احباب اکٹھا ہیں، بھلا یہ باتیں کلب میں کہاں ممکن ہیں۔

تحصیلدار صاحب کو جب دیکھیے دوست احباب کی خاطر مدارات میں مصروف، اکثر خیال گزرتا تھا کہ کام کس وقت کرتے ہوں گے مگر باوجود اس انہاک کے منصبی کارگزاری میں بھی مشہور تھے۔ حاکم ضلع کی نظر تمام تحصیلداروں میں انھیں کے اوپر پڑتی تھی، اول تو الفر بہ خواہ مخواہ مرد آدمی دوسرے تحصیل کے زمینداران رؤسا مہاجنوں سے نہ صرف حاکم و محکوم کے تعلقات بلکہ دوستانہ اس وجہ سے اگر کوئی کام پڑا تو ہر شخص تحصیلدار صاحب کا ہاتھ بٹانے کو تیار، سیلاب آئے، سوکھا پڑے، ٹڈی دل کی مصیبت پھٹے، وبا پھیلے، جہاں دوسرے مہینوں کاغذی گھوڑا دوڑائیں وہاں یہ دوانچھروں میں کام نکال لیں اور جب ضلع کی رپورٹ لکھی جائے تو تمام تحصیلداروں میں ان کا نام سرنامے پر ہو۔ چندہ جمع کرانے کا گُر ایسا معلوم تھا کہ ان کی تحصیل ضلع میں ہمیشہ نمبر اول رہتی تھی۔ تحصیل تو تحصیل ضلع کے کاموں میں بھی کلکٹر صاحب ہمیشہ انھیں کو اسپیشل ڈیوٹی کے لیے تجویز کرتے تھے۔ سالانہ دربار یا نمائش کا انتظام انھیں کے سپرد تھا۔ اس وجہ سے اس چھوٹے سے قصبے اور چھوٹی سی تحصیل میں ان کی تعیناتی کچھ بے جوڑ سی معلوم ہوتی تھی۔ مگر اسی کے ساتھ یہ بھی خیال ہوتا تھا کہ اگر یہ ڈپٹی کلکٹر ہوگئے تو تحصیلداری کا ایک بہترین نمونہ غائب ہوجائے گا۔ میرا خیال ہے کہ ڈپٹی کلکٹری تو ہر شخص کرسکتا ہے مگر تحصیلدار شاعر کی طرح پیدا ہوتا ہے۔ علاوہ قانونی ضابطہ سے واقف

کاری کے، تحصیلدار میں ایک عاملانہ کارروائی کا مادہ ہوتا ہے جو ہزاروں میں صرف چند تحصیلداروں کو ممتاز کر دیتا ہے۔ ہمارے تحصیلدار اسی کینڈے کے آدمی واقع ہوئے تھے۔ دو مرتبہ ڈپٹی کلکٹری میں نامزد ہو چکے تھے۔ مگر سفارش اٹھوانا کیسا، انھوں نے کبھی پرواہ بھی نہ کی۔ اصل بات یہ تھی کہ یہ بھی ہمیشہ تحصیل کو انگوٹھی اور اپنے کو نگینہ سمجھا کیے۔

اگر غور کیجیے تو ایک پہلو سے یہ بیجا بھی نہیں تھا۔ اول تو تحصیلدار تحصیل کا بادشاہ ہوتا ہے۔ دوئم یہ کہ بہت سے پرانے ڈپٹی کلکٹروں میں ان کو کون پوچھتا۔ تحصیل میں بس یہی یہ تھے۔ تیسرے ان کا انداز ایسا تھا کہ ان کی ضرورتیں جیسی تحصیل میں پوری ہو سکتی تھیں، ضلع میں ناممکن تھیں۔ مقدمات معاملات میں رشوت کی شکایت تو کبھی سنی نہیں گئی، لیکن یہ ہر شخص دیکھتا تھا کہ کہیں سے جلانے کی لکڑی چلی آ رہی ہے، کہیں سے شیشم کے تختے چلے آ رہے ہیں، بڑھئی لگے ہیں، ہر قسم کا فرنیچر تیار ہو رہا ہے۔ کوچ کرسی، میز کلکتہ بمبئی کے ایسے تو بنتے نہیں تھے لیکن اپنے مذاق کے موافق ہر چیز تیار ہو جاتی تھی۔ کچھ تن و توش بڑھ جانے کی وجہ سے کچھ اس وجہ سے کہ تحصیل میں سڑکیں کافی تھیں تحصیلدار صاحب نے ایک دن تانگہ خریدنے کا ارادہ ظاہر کیا۔ ایک زمیندار صاحب مہمان تھے، انھوں نے مشورہ دیا کہ یہیں بنوالیا جائے۔ عمدہ شیشم کی لکڑی اور ایک ہوشیار بڑھئی، انھوں نے بھیج دیا۔ لوہا ایک پرانے تانگہ کا جو تحصیل میں نیلام کو بہت دنوں سے پڑا تھا کام آ گیا۔ کپڑا لکھنؤ سے لالہ چھنا مل لے آئے۔ تانگہ تیار ہو گیا۔ ساز شیخ جیون بخش سوداگر نے بھیج دیا، یہ اسی تحصیل کے رہنے والے تھے، گو آڑھت کا کام باہر کرتے تھے۔ ملاقات کے وقت تحصیلدار صاحب نے بہت اصرار کیا کہ قیمت لو مگر وہ دام کیا لیتے۔ اول تو تحصیلدار صاحب سے آمدورفت، بے تکلفی کے مراسم تھے دوسرے ساز بنانے کی فیکٹری ان کے داماد کی تھی جو کانپور کے بڑے کارخانہ داروں میں سے تھے، گھر کی بات تھی، لاگت ہی لاگت پڑی ہوگی۔

دنیا میں کون ایسا ہے کہ جس کو سب اچھا ہی کہنے والے ہوں۔ تحصیلدار صاحب کو بھی برا کہنے والوں کی کمی نہ تھی۔ حالانکہ کوئی خاص برائی نہیں بیان کی جاتی تھی۔ پھر بھی یہ دیکھا گیا تھا کہ باوجود اس خاطر و مدارات اور ملنساری کے لوگ کچھ مطمئن نہیں

ہوتے تھے اور ہر شخص کچھ اس طرح محسوس کرتا تھا کہ جیسے کوئی اپنی تھاہ سے باہر چلا جائے۔ ایک بات بڑی غنیمت تھی وہ یہ کہ تحصیلدار صاحب کو باتیں کرنے کا اتنا شوق تھا کہ دوسروں کو موقع کم ملتا تھا۔ جس زمانہ کا یہ تذکرہ ہے اس وقت میری تعلیم کا آخری سال تھا۔ جب میں چھٹیوں میں گھر آتا تھا تب ہی تحصیلدار صاحب سے ملاقات ہوتی تھی۔

میرے بڑے بھائی صاحب بہت ہوشیار، ذی فہم زمیندار تھے جن کی کامیابی کا راز میرے خیال میں صرف یہی تھا کہ وہ فضول گوئی سے دور رہتے تھے اور بے سوچے سمجھے منھ سے بات نہ نکالتے تھے۔ کہنے لگے چلو تم کو تحصیلدار صاحب سے ملا لائیں۔ خوب آدمی ہیں مگر یار باش ہیں، آشنا پرست نہیں، ان سے ملنے میں ہاتھ پاؤں بچائے نہ رہے تو زک اٹھا جانے کا اندیشہ ہے۔ میری سمجھ میں اچھی طرح نہ آیا کہ بھائی صاحب کا اس کہنے سے کیا مطلب تھا لیکن چونکہ مجھ کو وطن میں رہنا نہیں تھا، نہ گھر کے کاروبار سے واسطہ تھا، اس لیے زیادہ چھان بین کرنے کی ضرورت نہ سمجھی اور بات یونہی رہ گئی۔ تحصیلدار صاحب نے ہم لوگوں کو ہاتھوں ہاتھ لیا۔ بھائی صاحب کی خوش انتظامی اور سلامت روی کی تعریف کرتے رہے اس کے بعد میری طرف مخاطب ہوئے۔ دیر تک میری تعلیمی ترقی میں دلچسپی لیتے رہے اور یہ معلوم کرکے بہت خوش ہوئے کہ میں تھوڑے دنوں میں وکالت کا آخری امتحان دوں گا۔ اس پیشے کی عمدگی پر خیالات ظاہر کرتے رہے۔ اتنے میں مقامی تھانے کے سب انسپکٹر آتے دکھائی دیے۔

تحصیلدار: اخاہ داروغہ جی تسلیم۔ آج تو دو تین دن کے بعد ملاقات ہوئی۔ بھئی کیا تفتیش کی ہے، وہی 379 والا مقدمہ، اتنی بڑی چوری اور اس خوبصورتی سے مال برآمد کیا ہے کہ سبحان اللہ۔ میں نے تو کلکٹر صاحب سے بھی اس کا ذکر کردیا۔ دوپہر کی گاڑی سے واپس آیا ہوں۔ میں نے کہا کہ اگر آپ انچارج نہ ہوتے تو ایسی چوری کا برآمد ہونا کوئی سہل بات نہ تھی۔

جی ہاں آپ کے اقبال سے کامیابی خلاف امید ہوئی۔ ملزم نے اقبال جرم بھی کیا اور مال بھی برآمد ہوا۔ اب یہ مقدمہ سیشن تک نہیں ہل سکتا۔ بقیہ مال کے بھی برآمد

ہونے کی امید ہوگئی ہے۔

ضرور ہوگا اور برآمد کیونکر نہ ہوگا آپ کی طرح جانفشانی سے کوئی کام بھی تو نہ کرے گا۔ آپ خیال تو کیجیے نہ دن کو دن جانا نہ رات کو رات۔ میں تو کپتان صاحب سے ضرور کہوں گا کہ ایسے لائق کارگزار افسر کا نام اگر انسپکٹری کے لیے نہ گیا تو پولیس والوں کی ہمتیں ٹوٹ جائیں گی۔ پھر کوئی افسر دوئیم ہو کہ انچارج اس جانفشانی سے کام کس امید پر کرے گا۔

ابھی یہ سلسلہ جاری تھا کہ سب رجسٹرار صاحب دکھائی دیے۔

تسلیم عرض کرتا ہوں، سب رجسٹرار صاحب کہیے معائنہ ختم ہوگیا۔ انسپکٹر جنرل صاحب تو خود آپ کی تعریفیں فرماتے تھے مجھ کو بھی موقعہ مل گیا۔ میں نے کہہ دیا کہ سب رجسٹرار تو بہت دیکھے لیکن اس لیاقت سے کام کرنے والا نظر سے نہیں گزرا۔ میں نے کہا تحصیل کے سامنے ہی تو دفتر ہے روز کا کام روز ختم کرنے کے لیے سب رجسٹرار صاحب اکثر چراغ جلے تک کام کیا کرتے ہیں اور آپ نے طریقہ وہ رکھا ہے کہ اہل کار اور اہل معاملہ سب آپ سے خوش رہتے ہیں اور کمال تو یہ ہے کہ ستانیدن کا مصدر تو کبھی گردانا ہی نہیں۔

سب رجسٹرار: آپ کی عنایت ہے امید تو ہے کہ معائنہ اچھا ہی لکھیں گے، ظاہراً تو خوش گئے۔

تحصیلدار: اجی معائنہ کیسے نہ اچھا لکھیں گے، وہ تو خود فرماتے تھے پھر مجھ کو بھی اچھی طرح موقع مل گیا اور ایمان کی بات ہے کہ آپ کا ایسا اپنے فرائض منصبی کو سمجھنے والا دوسرا افسر ہے بھی تو نہیں۔

سب رجسٹرار: اجی تحصیلدار صاحب ان باتوں کو کون دیکھتا ہے، بس یہی کہیے کہ آبرو سے کٹ جائے یہی کافی ہے۔

اتنے میں چپراسی نے کہا کہ فلاں تعلقدار صاحب کے مختار آئے ہیں۔

تحصیلدار: اجی بلاؤ صاحب بلاؤ، کہیے مختار صاحب راجہ صاحب اچھے تو ہیں۔

کہیے آپ کے ایک سو دس والے مقدمہ میں کیا ہورہا ہے۔ بھئی یہ تو غضب ہے، اندھیر ہے، اب اگر مختار صاحب آپ کی ریاست کے ملازمان پر بھی ایک سو دس چلے گا تو کس کی آبرو بچے گی۔ داروغہ صاحب فلاں تھانے میں آپ نے سنا کیا آفت مچی ہوئی ہے۔ نہ معلوم کتنے چالان ایک سو دس کے ہوئے ہیں۔ بھلا یہ کیسے کامیاب ہوسکتے ہیں، ارے توبہ کیجیے، سوا اس کے کہ تھانہ دار صاحب منہ کی کھائیں اور کچھ نہیں۔ (مختار صاحب سے مخاطب ہوکر) یہ دیکھیے ایک تھانے کے مہتمم ہیں علاقے بھر میں سینک کھڑی ہوئی ہے اور پھر نہ کہیں ایک سودس نہ ایک سو سات۔ ایک آپ کے تھانہ دار ہیں، خیال کرتے کہ بیں کام پولیس کے آپ سے بھی ان کے رہتے ہیں۔ اگر یہی حرکتیں ہیں تو ان کی سب انسپکٹری آپ کے تھانے میں کامیاب ہوچکی۔ آپ راجہ صاحب سے میری طرف سے کہیے گا کہ کم سے کم سوگواہ صفائی کے دیں، ذرا سب انسپکٹر صاحب کو بھی چالان کرنے کا مزہ مل جائے۔

کچھ رسمی باتیں کرنے کے بعد مختار صاحب رخصت ہوئے، ان کا منہ پھیرنا تھا کہ تحصیلدار صاحب نے فرمانا شروع کیا۔

داروغہ جی جانتے ہیں نہ آپ، یہ فلاں ریاست کے مختار ہیں نہ ایسے رئیس دیکھے نہ ایسے مختار۔ ہر شخص اس میں کا نمبری ہے نمبری۔ میں تو کہتا ہوں جب تک یہ سب کے سب دن کرائے کے گھر نہ پہنچ جائیں گے اس تھانے میں امن ہونا ناممکن ہے۔ چوری کا مال ان کے ذریعہ سے بکے، عورتیں ان کے آدمی بھگائیں، خود رئیس صاحب ہر بدمعاش، جرائم پیشہ کا ساتھ دینے کو تیار، میری تو تحصیل ہی میں ہیں میں تو خوب جانتا ہوں۔ وہاں تو غدر ہے غدر یہ تھوڑی معلوم ہوتا ہے کہ انگریزی حکومت ہے۔ مگر اس ایک سو دس سے سب کے حواس گم ہیں خدا کرے سب کے سب سزایاب ہوجائیں نہیں تو اس تحصیل کی گندگی دور نہ ہوگی۔

کچھ وقفے کے بعد رجسٹرار صاحب اٹھے "جائیے گا اب، رجسٹرار صاحب معائنہ کی کتاب واپس آجائے تو دکھایئے گا ضرور۔"

رجسٹرار صاحب کے رخصت ہونے کے بعد۔

تحصیلدار صاحب: داروغہ جی بھئی جانتے ہو نا، یہ ایک ہی ذات شریف ہیں۔ جب سے یہ شخص اس دفتر میں آیا ہے عجب بے ایمانیوں کا دفتر کھل گیا ہے۔ علاوہ مقررہ حق حقوق کے ہر دستاویز میں ان کا کمیشن الگ کٹتا ہے، حلقہ بھر میں کوئی دستاویز ایسی نہ ہوگی جس کو آپ نے طے نہ کیا ہو، کوئی بیع کا معاملہ ہو رہن کا معاملہ ہو، بغیر ان کے سدھر نہیں سکتا۔ ارے صاحب یہ سرکاری دفتر تو نام کو ہے اصل معاملات تو مکان پر طے ہوتے ہیں، وہ رقمیں کٹتی ہیں کہ آدمی سن کر اچنبھے میں ہوجائے، ہزاروں کے وارے نیارے ہوتے ہیں اور پھر مُردے کی رجسٹری یہ کریں فاطرالعقل کی رجسٹری یہ کریں میں تو کہتا ہوں جس دن دھرے گئے سات برس سے کم کو نہ جائیں گے۔

اس کے بعد تھانیدار صاحب رخصت ہوئے۔ ہم لوگ منتظر تھے کہ اب تھانیدار صاحب کی باری آئی۔ مگر تحصیلدار صاحب کچھ چپ رہے۔ اس کے بعد فرمانے لگے کہ یہ شخص ہمارا دوست ہے۔ پہلے بھی ساتھ رہ چکا ہے مگر بھئی خدا پولیس والوں سے بچائے رکھے۔ یہ لوگ کسی کے دوست نہیں۔ میں تو کہوں گا ٹھگ چور کا اعتبار کرے مگر پولیس والوں کا اعتبار نہ کرے۔ ان لوگوں کا کام ہی ایسا ہے۔ اب اسی مقدمے میں جس کا ذکر ہے بھائی صاحب نے ہزاروں کا مال مارا ہے۔

ایک ملزم کے یہاں کچھ چیزیں برآمد کیں، اس کو ایسی پٹی پڑھائی کہ اس نے مجسٹریٹ کے سامنے اقبال جرم کرلیا۔ باقی مال جو ہاتھ آیا، وہ یاروں کا۔ لیجیے صاحب مقدمہ بھی کامیاب ہوگیا اور نام بھی ہوگیا اور مال الگ کٹ گیا۔ خیر ہوگا، جو جیسا کرے گا ویسا پاوے گا۔ اگر یہ میرا پرانا ملاقاتی نہ ہوتا تو میں اس کی وہ وہ باتیں سناتا کہ آپ دنگ رہ جاتے۔

اس کے بعد تحصیلدار صاحب معذرت کرکے چند منٹ کے لیے کسی ضرورت سے اندر گئے۔ میں نے موقع غنیمت جان کے بھائی صاحب سے کہا بھیا ایسے میں نکل چلیے موقع اچھا ہے نہیں تو اگر کوئی اور آ گیا تو ہماری اور آپ کی بھی یہی درگت دھری ہے۔

○

اِمامَن مہری کے فلسفیانہ خیالات

(۱)

''ایمان داری بہترین دوراندیشی ہے''

رہیں جھونپڑے میں خواب دیکھیں محلوں کا۔ بھیک مانگنے چلے اور مشعلچی ساتھ، نکلیں کوڑی پھیرا[1] کرنے اور ساتھ لیں صندوق پٹارے۔ چوری نہ لگتی ہو تو لگ جائے۔ کریں گی ٹکے کی مہری گیری اور دکھائیں گی ٹھاٹھ۔ پھر تو اللہ ہی نے کہا ہے ہر سٹے نگا جھوری (تلاشی) دینی پڑے گی۔ روز صندوق پٹارے اُٹھنے پٹھنے جائیں گے۔ وہ کون ایسی چھوٹی بڑی سرکار ہے جہاں پوت کے چھلّے سے لے کر جواہرات تک اِدھر اُدھر پھکے نہیں پھرتے ہوں۔ اے ہاں پھر جو کوئی چیز بست[2] ادھر سے ادھر ہوگئی اور توبہ کر کے کہتی ہوں دشمن مدعی دھرے گئے تو کہیے کیسی بنی۔ بندہ بشر ہے گری پڑی چیز کون نہیں اٹھاتا، کوئی مہری آئے تو سامنے چھتیا چھتی (سیتاستی) بن کے جس نے کچھ اٹھایا نہ ہو پھر جو صندوق پٹارے کا ٹبر بھی ساتھ ہوگا تو اسی میں آدمی رکھے گا۔ بس یہی ٹبر آدمی کو دَھروا دے گا۔

اے ہے جب مجھ بندی پر پہلے پہل وَخت پڑا اور میں نوکری کو نکلی۔ اے چھوکری تو تھی ہی کوئی سمجھانے والا عقل سکھلانے والا بھی نہ تھا جو کہتا بی ہوش میں آؤ۔ تم نوکری کو جاتی ہو یا رہنے سہنے۔ صندوق پٹارا لیا ساتھ بیگم صاحب کے یہاں چلی گئی۔ ان کے یہاں آئیں ان کی خالہ جان مہمان طریق۔ ان کے ساتھ ان کی صاحبزادی بھی آئیں، اللہ رکھے انگنے برس میں تھیں کیسی خوبصورت گلگوتھنا سی کہ میں کیا

---

1 بھیک مانگنا

2 سامان، اثاثہ

کہوں۔ اے کھیلتے کھیلتے صاحبزادی نے اپنی امی جان سے کہا، امی جان ہماری انتی کھو گئی پہلے ڈھونڈیا مچی، سارا گھر تلپٹ، وہ مہنامتھ کہ توبہ بی بی امیر کا بچہ کون کہے کہ تو نیا طوفان جوڑتا ہے۔ دوسرے مہمان یہ بڑی ناموسی کی بات ہے گھر والے کے لیے کہ اس کے مہمان کا نقصان ہو۔ محل بھر اُلچ ڈالا گیا، نہ معلوم انتی کدھر الوپ ہوگئی، آخر باہر سرکار تک خبر پہنچی۔ لے میری بی بی اب کیا تھا سب تھرا اٹھے حکم ہوگیا کہ سب کے صندوق پٹارے گٹھری مٹھری دیکھی جائے۔ اے ہے میں تو سَن سے ہوگئی۔ صندوق پٹارا میرے ہی پاس تھا اور کوئی ماماجن ایسی مورکھ نہ تھی، جی نے کہا لو بی امامن جو کسی نے عداوت سے انتی ڈال دی ہوگی تو جھونٹے مونڈے جائیں گے آج اللہ آبرو رکھے مگر جو چور ہوئے وہ ڈرے۔ سرکار نے اپنے سامنے میرا صندوق کھلوایا۔ ایک لہنگا دو شلو کے ایک دوپٹا، ایک مومی موتی کی لڑی، تین آویزے، نانی اماں کی پن کٹی، ایک ایک چیز میں نے کھول کے رکھ دی۔ تپا تو چڑھا ہی ہوا تھا بولی دیکھیے حضور یہ شلو کے آپ کے ہیں؟ یہ لہنگا آپ کا ہے؟ یہ دوپٹا مجھے سرکار نے دیا تھا، یہ جھوٹے آویزے آپ کے ہیں؟ اور یہ پَن کٹی حضور کی ہے؟

اتنا میرا کہنا تھا کہ نواب صاحب لال بھبوکا ہوگئے۔ بڑی گستاخ بدتمیز ہے۔ بوا مجھ پر بھی جن چڑھا ہوا تھا بول اٹھی۔ حضور غریب آدمی کی آبرو ہی کیا۔ مُدا[1] آبرو ہوتی ہے موتی کی آب ایک دفعہ اتر کے پھر چڑھ نہیں سکتی۔ حضور کے یہاں نوکری کرے تو ناک چوٹی کٹوائے۔[2] بدتمیز کے سر پر وہی جو کہتے ہیں کہ سینگ نہیں ہوتے جو بدتمزی کرے وہی بدتمیز۔

میرے کڑوے بول سن کے سارا محل سن ہوگیا۔ بیوی، بَندی اپنا بوریا سمیٹ سماٹ یہ چل وہ چل پیچھے پھر کے بھی نہ دیکھا۔ جب پہلی تاریخ آئی حساب کتاب کا وقت آیا تو گئی۔ تو بات کیا ہے مجھ کو چار باتیں کہہ لو مُلر مُلر دیکھوں گی جواب نہ دوں گی۔ حد یہ کہ مار لو کوسنے دے لو، سب سہہ لوں گی مگر جھوٹ تہمت سے تن بدن میں

---

1 مگر، لیکن

2 بے آبرو ہو

آگ لگ جاتی ہے پھر بندی ایسے ٹھکانے کھڑے پانی نہیں پیتی۔ پھٹ پڑے وہ سونا جس سے ٹوٹیں کان، میں کہتی ہوں اوہ جی رکھ پت رکھاپت، ہاتھ بیچا ہے، کوئی ذات تو بیچی نہیں، اللہ رزاق ہے، جس کی ڈہری میں بدا ہے، اسی کی ڈہری میں کھائیں گے تو بوا جس کی عقل ماری جائے وہ صندوق پٹارا لے کے نوکری پر جائے بس چھڑے چھٹانک رہنا اچھا۔ اس دن سے آج کی گھڑی میں قسم لے کے سرکاروں میں نہیں جاتی۔ میں کہتی ہوں شلوکے کی گوٹ اور نیفہ کیا کم ہے جو یہ کھڑاگ کوئی دُم میں باندھے۔ اے ہاں کوئی اونٹ چرانے سے رہا۔ یہی انگل دو انگل کی چیز۔ پھر اس کے لیے صندوق پٹارے کی کیا درکار ہے، میں کہتی ہوں اگر عورت دوہرے پنڈے کی بھاری بھرکم ہو تو شلوکے میں اللہ جھوٹ نہ بلوائے، گز دو گز کپڑا رکھ لے کیا مجال کوئی چرچ[1] تو جائے مگر اس کے لیے سلیقہ چاہیے۔ اس طرح رکھے کہ دکھائی نہ دے یا تو بغل کی طرف رکھے نہیں تو بٹن کھول کے کپڑا سینے پر لپیٹ کے اوپر سے شلوکا پہن لے۔ لے جس وقت نواب صاحب نے مجھ پر شک کیا اور میں نے نوکری جوتی کی نوک پر ماردی اس وقت ایک پوری کلی گرنٹ کی میرے شلوکے میں تھی اور نیفے میں کوئی نہ ہوں گی نہ ہوں گی تو چھٹانک بھرا لاچیاں گھُرسی ہوئی تھیں۔ پھر کسی ایسے تیسے نے پکڑ نہ لیا اور جو بٹوے میں تھیں اس کا حساب نہیں۔ بغیر اِلاچی کے پان میرے حلق سے اترتا ہی نہیں، میں کیا کروں پھر اتنی اوقات نہیں کہ امیروں کی طرح روپے بندھوں کی الاچیاں خریدوں۔ آخر نوکری جو انسان کرتا ہے تو کاہے کے لیے، نگوڑا پان تمباخو[2] کی لت پڑ گئی ہے۔ ہاں گرنٹ ورنٹ کی طرف میں نگاہ اٹھاکے بھی نہیں دیکھتی۔ یہ بی بہن جان نے رٹ لگا دی تھی کہ اللہ باجی دو چار بٹوؤں کا کپڑا اپنی بے ام صاحب[3] کیاں سے لادو۔ لڑکی روز جان کھایا کرتی تھی آخر کیا کرتی تم جانو موئی مٹی کی نشانی ہے، امّاں نو مہینے کی جان چھوڑ گئی تھیں میں نے بالشتوں پالا وہ تو بیٹی کی جگھاں (جگہ) ہے۔ بس یہ بات تھی نہیں تو میں اپنی حیثیت سے بڑھ کے بات کبھی نہیں

---

1. سمجھ جائے، جان جائے
2. تمباکو
3. بیگم

کرتی۔ ہاں از غیبی مل جائے تو انکار بھی نہیں۔ لے میں تم سے کہتی ہوں جو اگر مجھ کو جڑاؤ جھالے کی ایک فرد پاخانے میں پڑی مل جائے تو میں کیا کروں جو آگم(1) اندیشہ دیکھنا ہو اور چھپائے نہ چھپے تو آدمی کو جھٹ سے ایماندار بن جانا چاہیے، بس مال اٹھایا مٹھی میں دبایا آنچل کے نیچے ہاتھ کیا اور بے ام صاحب کے پاس رکھ دیا۔ حضور اچھی تنوں (طرح) دیکھ لیجیے۔ یہ چوکی کے نیچو (نیچے) پڑا تھا، بھلے کو میری نگاہ پڑ گئی، جو کوئی انجبی (اجنبی) دیکھ پاتا تو کورے استرے چند یا منڈتی مہری بندی کی اور مزے کرتے لینے والے۔ لے ابھی خیر صلا ہے دیکھ لیجیے کوئی موتی ووتی کمتی (کم) تو نہیں ہے؟ اے ہاں جو پیچھو کو (بعد کو) میں چور بنوں مُخت مُخت (مفت مفت)، بی بی جو ایسی نیت نہ رکھتی تو نہ مالم کتان (کتنی) دفعہ یہ بوڑھا چونڈا منڈ چکا ہوتا۔ بی وی ایسا مال لینے سے کیا فائدہ جو ہضم نہ ہوسکے۔ پیٹ میں پچنے والی چیز ہی کیوں نہ لے ایسی بھاری قیمتی چیز کیا کرے لے کے۔ بنیے مہاجن کے ہُواں (کے یہاں) لے جاؤ تو بھی پکڑے دھکڑے جانے کا اندیشہ ہے۔ اڑوسی پڑوسی کے ہاتھ بیچو تو اول تو اَونے پَونے بکے گا اور عمر بھر کی دھونس مفت خدا سہنی پڑے گی اور گھر میں رکھو تو آخر کس مرض کی دوا ہے جو اپنے آڑے وَخت پر کام نہ آیا تو کیا مال ہے۔ نابابا، میں درگذری ایسے مال سے، اللہ بری گھڑی سے بچائے، نہ آج تک ایسا کرم کیا ہے نہ اللہ نے چاہا تو کروں گی۔ نوکری چھوڑنے کے بعد بڈّی ہزار نوکریاں آئیں مُل (مگر) میرا جی نہ چاہا گھر میں بیٹھے بیٹھے البت (البتہ) جی گھبراتا تھا، تم ہی کہو جو آدمی آدمیوں کے جھرمٹ میں سداں (سدا) رہتا ہو اس کا جی اکیلے نہ گھبرائے گا؟ نواب صاحب کے یہاں اللہ رکھے مغلانیاں، پیش خدمتیں، لنائیں، نوکر خدمت گار، مصاحب، سپاہی، دربان روتا آتو(2) استانی سب ہی تھے، دل بہلا رہتا تھا گھر میں کون تھا، نُڑوں ٹُوں میں یا چھوٹی بہن یا بھیا۔ وہ (میاں) تو پہلے ہی مر گئے، ہے ہے جو وہ نہ مرتے تو باہر پاؤں کیوں نکالتی۔ آخر لوگوں کے کہنے سننے سے دوسرا نکاح کیا۔ پھونکا پڑے اس

---

1 آگے، آئندہ

2 وہ ملازم جو عورتوں کا کام کاج کرنے کے لیے دروازے پر رہتا ہے۔

نکاح میں نگوڑا خصم دل کا زخم، ہر سٹے بدگمانی، آشنائی تو ناک پر رکھی رہتی، کسی سے ہنسو نہیں بولو نہیں، لے میں کوئی پردے کی بُوبُو تو ہوں نہیں، باہر نکلنے والی پچاس دوست دس ملاقاتی، سارا زمانہ تو امامن مہری کو جانتا ہے کس سے کس سے رُکھائی (بے رخی) کروں، پھر جب انسان ملتا جلتا ہے تو ہنستا بولتا بھی ہے۔ دل لگی مزاخ (مذاق) سب ہی کچھ ہوتا ہے۔ وہاں لم[1] لگائی گئی۔ نوج ایسا نٹ کھٹ مردوا کوئی ہو، میں نے بھی کہا لے موئے جب نہیں تو اب سہی۔ جا تیری یہ راہ تو میری یہ راہ۔ بڑی مشکلوں سے پیچھا چھوٹا پھر میں نے نوکری کرلی، مل (مگر) یہ ٹھکانا اور ہی تنوں (طرح) کا تھا۔ ایک ڈپٹی صاحب کہیں باہر کے تھے۔ ڈیوڑھی پر ایک خدمت گار، اندر میں اور ایک بڑی بی جو ڈپٹی صاحب کے دیس کی تھیں۔ جیسی سرکار ویسا ہی کارخانہ ویسی ہی اوپر کی آمدنی مگر میں نے کہا لاؤ جب تک یہی سہی اے ہاں وہی مثل ہے بیٹھے سے بیگار بھلی، ڈپٹی صاحب نئی نئی دلہن بیاہ کے لائے تھے۔ بی ام بھی کچھ گڈمانی (گڈ مارننگ) گِٹ پِٹ گِٹ پِٹ کرلیتی تھیں۔ تم جانو نئے آدمی کا اعتبار تو ہوتے ہوتے ہوتا ہے۔ جو بڑی بی ڈپٹی کے ساتھ آئی تھیں ان کا بڑا لُہاؤ تھا۔ مجھے دونوں بھانپتے رہتے تھے۔ میں نے بھی دل میں کہا ہوگا جی۔ تمھیں اپنے کام سے کام ہے تم کیوں برا مانو۔ میں ناموتبری (نامعتبری) کے ٹھکانے گھڑی بھر نہ ٹِکتی مُل گھر بھر میں بس ایک خدمت گار کا دم تھا۔ نگوڑا جوان جہاں سانولا سلونا، ہنس مکھ، ملنسار، لڑائی بھڑائی کے پاس پھٹکتا نہ تھا۔ جو بات کہی۔ کہا اچھا یہی سہی میں نے کہا پان کھایا کرو نگوڑا چوتڑ سا منھ اچھا نہیں لگتا۔ اے لو اس نے پان کھانا شروع کردیا۔ میں نے بھی اس کی خانطر (خاطر) سے پٹاری سجی تو کاہے سے کہ میرے ہی کہنے سے تو اس نے یہ لت جان کو لگائی تھی۔ دوسرے بھئی میں جھوٹ نہ بولوں گی پٹاری کا سارا خرچہ اسی کے برتے پر چلتا تھا۔ نہیں تو میری تنخواہ میں ایسا کہاں کا گولر کا پھول پڑا تھا جو گلوریوں پر گلوریاں کھاتی اور کھلاتی، ایک دن کا ذکرا (ذکر) سنو میں گئی کمرہ صاف کرنے کیا دیکھتی ہوں کہ میز پر طشتری میں چار پانچ ڈلیاں برفی کی رکھی ہیں اور اسی ٹھکانے ایک روپیہ رکھا ہے۔ ہاں میں سمجھ گئی

---

1. لم لگانا، الزام لگانا۔

کہ اس میں کوئی نہ کوئی بی ہے۔ خوب کھلکھلا کے ہنسی، ڈپٹی صاحب مجھے جھکائیاں دیتے ہیں۔ بھلا رکھا ہوا روپیہ اور بھولے چوکے گرا پڑا روپیہ یکسوں (یکساں) ہوتا ہے۔ لے بھلا میں ایسی کچی گولیاں کھیلنے والی تھی۔ ترترکاری، مٹھائی پھل میں میرا حصہ شکور (خدمت گار) پہلے ہی سے رکھ چھوڑتا تھا، بھلا مٹھائی پر میں کیا نگاہ ڈالتی۔ ایمان ہے تو جہان ہے، نیت بد کرتے تو میرے دشمن۔ بندی نے جھٹ روپیہ اٹھاکے بیچ میز پر رکھ دیا، اس پر سے سیسے کی دوات رکھ دی۔ اے ہاں بوا عجب تماشے کی دوات تھی، کدھرو (کسی طرف) قلم جانے کا رَستہ نہ تھا۔ خیر میں ستھرائی[1] دے کے باورچی خانے میں جا بیٹھی، اتنے میں پکار ہوئی۔ بی مہری، بی مہری، میں بولی حاضر سرکار۔ ڈپٹی صاحب بولے کری[2] میں ستھرائی تم نے دی تھی۔ میں نے کہا جی ہاں۔ بولے ہیاں (یہاں) ایک روپیہ ہم چھوڑ گئے تھے۔ میں نے کہا سرکار میں نے بیچ میز پر دوات کے نیچے رکھ دیا ہے کہ کوئی اٹھا نہ لے تو دھری جاؤں میں۔ حضور ایمان میں کیڑے پڑتے کچھ دیر نہیں لگتی۔ بس اتنا میرا کہنا تھا کہ ڈپٹی صاحب بہت خوش ہوئے، کہنے لگے لو مہری یہ روپیہ تم ہی لے لو، ہم نے تمھیں انعام دیا۔ بی ام کہنے لگیں نا صاحب میری مہری چور چکار نہیں ہے بی ام صاحب نے ایک کرتا جاڑوں کا دیا کہ تم پہن ڈالو۔ میں نے جھک کے سلام کیا۔ دیکھا ایمانداری میں یہ مزے ہیں جو کہیں میں چوک جاؤں تو پھر اللہ جانے کیسی گت بنتی۔ اے ہاں وہی جو کہتے ہیں، عیب کرنے کو ہنر چاہیے، یہ نہیں کہ دیدے بند کیے اور کنویں میں پھاند پڑے۔ سرکاری عطر چُرا لیا بُو پھوٹی دھرے گئے، قوام کا تمباخو (تمباکو) اڑا لیا۔ منھ سے خوشبو آئی چوری کھل گئی، آدمی موقع مناسب دیکھ کے بات کرے۔

○

---

1 جھاڑو۔ صفائی کر کے

2 کمرے

(۲)

رکھ رکھاؤ

چولھے میں جائے رکھ رکھاؤ، بھاڑ میں جائے رکھ رکھاؤ، جان ہے تو جہان ہے۔ آدمی اپنا وَخت دیکھے کہ رکھ رکھاؤ کے پیچھے دِوانا (دیوانہ) بنے۔ بندی کہیں کی امراؤ جادی (امیرزادی) نہیں جو رکھ رکھاؤ دیکھا کرے۔ یہ سب امیروں کا چوچلا ہے۔ غریب غربا جو اس پھیر میں پڑیں تو نکّو ہوں۔

پڑوس میں ایک بی مگلانی (مغلانی) رہتی تھیں۔ جوانی میں ہوئیں رانڈ، اندھے کی لاٹھی ایک ہی لڑکا تھا۔ اسی پہ ساری جوانی مٹائی۔ بی ام صاحب کی سرکار میں بی مگلانی کا طوطی بولتا تھا۔ سارا دھرنا سیتنا، رکھنا، اٹھانا، انھیں کے سپرود (سپرد) تھا۔ اسی سرکار سے ہزاروں کمائے، مُل (مگر) لڑکا نکما نکل گیا۔ جوانی پر آتے ہی ساری دولت اڑا دی۔ سرکار پہلے ہی بگڑ چکی تھی۔ کچھ دنوں پیچھو (دنوں کے بعد) لڑکا نگوڑا جوان پچہتا کڑیل بی مگلانی کو داغ دے گیا۔ کمائی یوں غارت ہوئی کوکھ یوں اجڑی، بچی کھچی کھرچن نگوڑے جھوٹے رکھ رکھاؤ نے تہس نہس کی۔ کہو بڑی بی تم کوئی جوان جہان تو ہو نہیں جو تمھارا ڈیل ڈول تمھاری چال ڈھال تمھارے شہد بھرے رسیلے دیدے دیکھ کے راہ چلتو گبرو ریجھیں گے اور آبروں میں بٹا لگے گا۔ پھر اکیلی ہوکر کوئی بیٹی بیاہنے کو نہیں جو باہر نکلتے دیکھ کے دیا تھوکے گی کہ بی مگلانی صاحب گلیوں کی خاک چھانتی پھرتی ہیں، لے بھلا یہ بھی کوئی بات ہے کہ دو پیسے کے پان منگانا ہیں تو بیچاری آس لگائے کنواڑا تاک رہی ہیں۔ کوئی آئے تو منگائیں کوئی آگیا تو اس کے ہاتھ میں دو پیسے پکڑا دیے۔ اور لگیں گھگیانے بیوی تم جیتی رہو سُموں (صبح) سے بنا پان کے بیٹھی ہوں، منھ صابن ہوگیا۔ ڈلی تمباکو پھانکتے پھانکتے کلّے مچھل گئے۔ پان لا دو۔ اللہ کرے

تمھارے بچے جئیں، جس کسی سے کہا اس نے اول تو ناک بھوں چڑھائی نکتورے جتائے اور خدا کو مان کے پان لایا بھی تو دمڑی اپنے ڈب میں رکھی پھر سودا بھی اس قابل نہیں دو پان پھلوا تو دو کیکر دو مندراجی (مدراسی) چار بنگلے، رگ موٹی، رنگ کاہی، مزا ہرا ہندا کڑوا۔ ایک آدھی دِساوری بھی نکل آیا۔ آخر بچاری اسی رکھ رکھاؤ کے کارن کھُکھ ہوگئیں، دانت پر چھیلن نہ رہی تو برقع اوڑھ کے نکلنے لگیں مل جوان بہو کو کلیجے سے لگائے رکھا اس کا مان گون[1] کرتی رہیں۔ نگوڑی جوانی رنڈاپے میں گزر گئی۔ بڑی بی جو آج کو اس کا دوسرا نکاح کردیتیں اے ایسی بھوُلی بھوُلی قبول صورت تھی کہ اونچی جگہوں میں کھپ جاتی۔ تو ایک تو اس کے آنسو پنچھتے دوسرے ان کا بھی کوئی ہریا گھر یا ہوتا، مل نہیں وہ تو رکھ رکھاؤ میں فرق آتا تھا۔ قربان کرے ایسے رکھ رکھاؤ کو۔ بیسیوں دفعہ پڑوسی کرایہ داروں سے جھگڑا ہوا۔ کہیں مہترانی دہترانی کے منہ سے بہو کی صورت کی تعریف سن لی ہوگی انھیں نے دیوال (دیوار) میں چھید کیا اور لگے اسی چھید سے ڈورے ڈالنے وہ تو کہیے بہو ایسی نیک کوکھ کی تھی الٰہی کرے اس کی آبرو رہے جو اس نے ایک دن ساس کو دکھا دیا اور موکھے میں چھوپا لگا دیا۔ جو دوسری ہوتی تو رکھ رکھاؤ کے چلتوں منہ میں کالک لگا کے نکل جاتی۔ بس رہ جاتا سارا رکھ رکھاؤ۔ اے ہاں کیوں بیری گھر میں بوئے جو دن رات ڈھیلے آئیں۔ اور گیگلی[2] بھی بی مگلانی ایسی تھیں کہ بچاری منہ سے دور ہونٹ کھولنا نہیں جانتی تھیں۔ سودے والے سے سودا لیا اس نے ڈنڈی ماری اور چپکی کھڑی دیکھ رہی ہیں گویا للّو (زبان) کو کوا لے گیا، یہ نہیں کہتیں کہ ایسے کے تیسے تونے یہ کونسی تول تولی ہے کہنے کو اتنی بڑی سرکار میں رہیں مُل عقل نہ آئی۔ بھاڑ میں جائے ایسا رکھ رکھاؤ۔ پھر وجاداری (وضع داری) یہ کہ بی ام صاحب کے نندوئی نے کئی مراتبے (مرتبہ) بلایا، بی مگلانی تم ہمارے ہیاں چلی آؤ۔ جیسے بھابھی صاحب کا گھر ویسے میرا گھر وہ اللہ کی بندی جم کا دیا ہوگئی، ایک نہیں ہزار نہیں نہ جانا تھا نہ گئیں۔ کہو کیا دے دیا رکھ رکھاؤ نے۔ بوڑھاپا ایڑیاں رگڑتے رگڑتے کٹا۔ اے ایک بی مگلانی! خیر وہ تو عورت مانے تھیں، یہ مرثیہ خواں صاحب ہی کو دیکھ لو بڑے بڑے نواب جادے سجادے (شہزادے) انھیں آنکھوں پر بٹھاتے تھے۔ سرو قد

1　قدر و منزلت، ناز برداری

2　سادہ لوح، بھولی

تعظیم کرتے تھے۔ ان کی وجداری (وضع داری) کو دیکھو اللہ کے بندے نے پینس پر جو بیٹھنا شروع کیا تو تابہ مرتے دم تک کبھی بنا پینس کے راستہ نہیں چلے۔ سودے سلف کو بھی نکلے تو چار کے کاندھے پر بزار میں ٹھُم ٹھُم پینس چلی جاتی ہے۔ بھیا مہرا زری رک جاؤ، اے میاں بکریدی تین پاؤ سیم کے بیج، آدھی کا ہرا دھنیا، آدھی کا پودینہ، آدھی کی ادرک، پیسے کے پیاز دے دو۔ میاں بکریدی نے ایک ایک چیز پینس میں اٹھا کے رکھ دی تو دجاں (وجہ) کیا۔ وہ تو اپنا فائدہ دیکھتا ہے نا ایک کے دو اسے تو کرنا ہیں۔ آخر میاں جو پینس پر چڑھ کے کنڈے[1] بِیننے[2] آئے ہیں تو کوئی ایسے ویسے تو ہوں گے نہیں بس ایک کی جگہ دو روپیہ ٹھگ لیے۔ ایک روپیہ ہوا سودے کا ایک ہوا میاں کے رکھ رکھاؤ کا۔ ''دکاندار کسی کے باپ کا کوڑیا غلام تو ہے نہیں ایسے بدّی ہزار گاہک آتے ہیں اور چلے جاتے ہیں۔ لے میں بڑا بول نہیں بولتی۔ خاک چاٹ کے کہتی ہوں کوئی ایسے کا تیسا مجھے ٹھگ لے نگوڑے کی چھاتی پر چڑھ کے اڑھائی چلّو لُہو پی لوں کیا ہنسی ٹھٹھا ہے۔ ہوں۔ بندی بھی اپنی نام کی امامن ہے — اجی اِدھر میں دکان پر پہونچی اور دُکندار کا دَم نِکل گیا۔ دُکندار کے لونڈے نے پکارا ''ابا بڑی بی آگئیں ان سے تم ہی سودا چکاؤ'' دکندار نے میرا نام سنا اور ہواں (وہاں) سے دوڑا ''کہو بوا امامن آج پیسے کے دھیلے بھناؤ گی۔'' میں نے جل کے جواب دیا کہ بھناؤں گی تیرا کلیجا۔ لو موئے کی شامتیں آئی ہیں، مجھ بڑھیا نانی سے بھی مزاخ (مذاق) کرتا ہے۔ وہ کہنے لگا یہ دیکھو ڈیڑھ سیر کی ران ہے۔ میں نے اچھی طرح دیکھ لیا کہ ریشہ تو موٹا اور بڑا نہیں ہے۔ بکرا بڈھا تو نہیں، بواہند (بکرے کی بو) تو نہیں آتی۔ بیمار تو نہیں ہے۔ گوشت اال اور نیلا تو نہیں، باسی ہے کہ تازہ، ڈیڑھ سیر کی ران ہے تو آدھ سیر حق نلی اور ہڈّی کا نکل گیا۔ بچا سیر بھر تو اس میں چھٹانک بھر جھلّیوں اور پٹھوں کا حق ہے، بچا چھٹانک کم سیر بھر بس چھ آنے پیسے حوالے کیے اور چل کھڑی ہوئی۔ اب وہ موا لاکھ لاکھ اپنا گلا پھاڑتا ہے، خدا کے لیے بوا زری ٹھہرو تو بات تو سنو، یہ تم نے کتنے دام دیے، میں اتنے کو نہیں بیچوں گا۔ بندی نے پیچھے پھر کے دیکھا بھی نہیں کون بکتا ہے، بکا کر، موئے جھک مارا کر اور اسی مردے پر راہ گیروں نے اوازے

1 اُپلے
2 چننے، جمع کرنے

توازے کسے۔ ''اے نانی سے چھچھوڑا عزیز کرتے تجھے شرم نہیں آتی۔ کیوں بیٹا نانی کو بھی بے ہڈی کا گوشت نہ دیا۔ جو میرے جی میں آئی تو میں نے بھی ایک ایک کی چار چار سنائیں۔ لگی چوکھی لڑنے۔ جی یوں سودا ہوتا ہے، زری بزار میں نکلنا دل لگی نہیں ہے۔ ایسا چوکھا سودا کرتی ہوں کہ دیکھنے والے منہ دیکھ کے رہ جاتے ہیں۔ لے ایمان لگتی کہو جو رکھ رکھاؤ رکھتی تو میں کہاں کی کارون (قارون) جادی تھی، کل ہی ٹاٹ الٹ جاتا، بھلا رکھ رکھاؤ اچھا کہ یہ۔

لوگ کہتے ہیں رکھ رکھاؤ اپنے ہاتھ ہے۔ ہاں ہے اپنے ہاتھ بھی ہے پرائے ہاتھ بھی۔ جیسے گھوڑے کی لات گھوڑا اکیلا لات اچھالے تو کیا مزا ہے مزا تو جب ہے کہ دوسرا گھوڑا جواب دینے والا بھی ہو۔ کیوں بی وی میں جھوٹ کہتی ہوں؟ ایک منشی جی مولوی گنج میں رہتے تھے، کہیں کچہری میں نوکر تھے، ہمارے ہی ادھر سے روز کچہری جاتے تھے۔ ادھر سڑک کے مہتر نے ان کی جھلکی دیکھی اور ہاتھ باندھ کے کھڑا ہوگیا ''کھدا سلامت رکھے، ہمارے ڈپٹی صاحب کو۔'' منشی جی اتنا کہنے پر پھول کے کپّا ہوجاتے تھے کچھ دنوں بعد منشی جی نے محلّہ چھوڑ دیا۔ دوسرے محلّہ میں اٹھ گئے۔ ایک دن اچانک ہماری طرف سے جاتے تھے۔ جیسے ہی موڑ سے گھومے ادھر سے آتا تھا مہتر بس لڑ ہی تو گئے۔ مزا سنو کہ مہتر لیے جاتا تھا اپنا کھانا، ٹکر جو لگی تو دال بہہ نکلی۔ چھوٹتے ہی کہنے لگا ''اجی اندھے ہوگئے ہو۔'' میں بولی ارے برجا یہ کیا ڈپٹی صاحب ہیں۔ کہنے لگا ایسے ڈپٹی بہت دیکھے ہیں۔ کوئی اب وہ یہاں تو رہتے نہیں جو میں دباؤ سہوں لے نحق ہنا حق کو جو میرا نصحان (نقصان) کردیا تو میں کس سے کہوں۔ کوئی ہم ان کے دَبیل ہیں۔ ہاں سرپھر (شریف) مَردے آدمی ہیں رکھ رکھاؤ سے رہتے تھے۔ ہم بھی جھک کے سلام کرلیتے تھے اور اب کیا ہے۔ دھونس کون سہے یہی تو میں کہتی ہوں اکیلا سو باؤلا اور دُکیلا سَو سنگ۔ اِکّے والوں کو دیکھو دور سے سواری آتے دیکھی اور جان کو آرہے۔ حضور ادھر آیئے سرکار، ادھر اجی اس کا جنور مریل ہے ادھر آیئے فَرَدٹ لے چلوں۔ جو حضور نے کہا بھئی چوک تک کا کیا لوگے تو سنائے دو آنے۔ انھوں نے چار پیسے کہے تو کہہ دیا، اس کے چنے مرمرے بھنا کے جیب میں بھرلو اور چباتے چلے جاؤ رستہ خوب کٹے گا۔ سارا رکھ رکھاؤ دھرا رہ گیا۔ جو زیادہ تڑا ہوا تو کہنے لگا کہ میاں ٹھیل پر بیٹھے ہوگے۔ شاید تمھارے باوا بھی کبھی اکّے پر چڑھے تھے؟ یہ ہے رکھ رکھاؤ۔

پہلے کہا ہجور سرکار اور انٹی پر نہ چڑھا تو صلواتیں سنا دیں ایک طرفا رکھ رکھاؤ ایسا بھی ہوتا ہے اور جو انٹی پر مارے رکھ رکھاؤ کے چڑھ گیا تو اس کا یہ حال ہوتا ہے کہ میاں کنگھی چوٹی، تیل پانی کپڑے لتے سے درست ہو کے نکلے۔ ''ارے بھئی کوئی گول دروازے چلتا ہے۔'' بس اکے والا بھانپ گیا کہ میاں ہیں رکھ رکھاؤ کے اس نے جھٹ لکلھے باندھنے کی ٹھہرائی۔ اے خداوند ادھر آیئے۔ ابھی چلتا ہوں چٹکی بجاتے پہنچ دوں گا۔ خدا سلامت رکھے ہم تو ایسی ہی سواری کی تلاش میں رہتے ہیں واللہ بیٹھیے جو طبیعت خوش نہ ہوجائے تو ڈبل نہ دیجیے گا۔ ایسے ہی حضوروں کے دیے پیٹ بھرتا ہے۔ کنگال چنڈال کیا کھا کے کسو کو کچھ دے گا۔ لیجیے صاحب حضور اینٹھ کے بیٹھ گئے اور اس نے گول دروازے پہنچتے ہی چار آنے رکھوا لیے۔ میاں بچارو رکھ رکھاؤ نہ کرتے تو کیا کرتے شخصیت میں بٹا لگتا تھا۔

بی بی اصل رکھ رکھاؤ وہ ہے جو اپنے بوتے برتے پر ہو۔ وہی جو مثال ہے ''بَل تو اپنا بَل پرایا بَل جائے جل'' ایک دن کی دل لگی سنو راجہ کی بزار (بازار) میں ایک موٹا مسنڈا آدمی اپنی آشنا کو ساتھ لیے جاتا تھا۔ دو آدمی رستے رستے چلے جاتے تھے۔ رنڈی کی بو جو پائی تو بھڑ کے چلے اور لگے آوازے توازے پھینکنے میاں رنڈی باز کو غصہ جو آیا تو ایک ڈنڈا ایک کے رسید کیا۔ وہ تو بھاگا، رہ گیا دوسرا وہ تھا زری تگڑا لپٹ ہی تو گیا۔ بس ہونے لگی کشتم کشتا، ٹھٹھ لگ گئے۔ دونوں کے کپڑوں کی دھجیاں اڑ گئیں۔ انگرکھے پرخچے پرخچے رنڈی باز کے ساتھ تھی رنڈی وہ دب جاتا تو رنڈی کی آنکھوں میں ذلیل ہوتا۔ بس وہ بپھر بپھر کے لڑنے لگا۔ آخر میاں راہ گیر چیں بول گئے۔ رنڈی باز نے جو ایک راپٹا کس کے میاں راہ گیر کے منھ پر رسید کیا تو تین تلوک سوجھنے لگے اور سر پر پاؤں رکھ کے بھاگے، لوگوں نے کہا وہ بھگایا ہے وہ جاتا ہے۔ اتنے میں پولیس آگئی اور راہ گیر بھی تھم گیا وہ تو کہو پولیس والا کوئی بھلے مانس تھا، اس نے بیچ بچاؤ کردیا کہ میاں شریف ہو کے راستے میں بگڑا کرتے ہو، خیر دونوں اپنی اپنی راہ چلے گئے۔ مُل رنڈی باز پنجوں کے بھل، مونچھوں پر تاؤ دیتا چل رہا تھا، سچ ہے اپنے بَل پر رکھ رکھاؤ یوں ہی ہوتا ہے۔

ر

(۳)

تیہا، طنطنہ، جوش، غُصّہ، جَذبہ

تیہا ہر سٹے کا برا ہوتا ہے مُل کسی کسی وخت بہت کام دیتا ہے۔ اے ہاں کام کا نہ ہوتا تو اللہ میاں پیدا ہی کیو ں کرتے۔ اللہ میاں کو نکمی چیز پیدا کرنے کی عادت نہیں۔ میں نے تو ایک دن مولوی صاحب کے منھ پر کہہ دیا تو بات کیا ہوئی میں لیے آتی تھی ترکاری اس میں سے بوندیں ٹپک کے مولوی صاحب کی پگڑی پر گریں جھلا کے کہنے لگے ''ہا کمبخت نجس کردیا'' مجھے جو تیہا آیا ٹوکری مولانا کے سر پر اوندھا دی، مولانا بتھے پر سے اکھڑ گئے، لگے نیلے پیلے دیدے نکالنے، میں سوچی کہ آج چپ رہی تو مولوی کا ہواؤ زیادہ بڑھ جائے گا۔ میں بھی آنکھیں غُریر کے کھڑی ہوگئی اور کہنا شروع کردیا ''اجی مولوی صاحب آپ ہی تو کہتے ہو غصہ حرام ہے اور آپ ہی یہ ججبہ (جذبہ) یہ جوشا (جوش) چڑھ آیا کہ گال بندر کے ہوگئے۔ ذری آئینہ لے کے دیکھو تو منھ لال بھبھوکا ہو رہا ہے جیسے کسی نے اینٹا (اینٹ) مارا۔ پانی ہی تو تھا کوئی مُوت تو تھا نہیں جو تمھاری..... آسمان کو چڑھ گئی۔'' بس میرا اتنا کہنا تھا کہ مولوی کا وضو ٹوٹ گیا لگے منّو بلائی بننے، بڑے آئے وہاں سے مولوی بن کے۔ دیکھا جو تیہا نہ دکھاتی تو ماری پڑتی، مُل تیہا تھبے کی تنو (طرح) کرے اے ہاں مثل مشہور ہے ''خانہ خانہ در و پردے پردے شرم'' جو کوئی امیر آدمی ہوا تو لوگوں کی نانی مرتی ہے، ڈرتے ہیں کہ بھئی کہیں حضور پر غصہ نہ چڑھ بیٹھے۔ پھر بھی میاں کاٹ دوڑے تو لوگ 'جل تو جلال تو آئی بلا کو ٹال تو'' پڑھ کے دم کرنے لگے اور اس پر بھی تیور بدلے کے بدلے ہی رہے بھوں کی کمان چڑھی کی چڑھی ہی رہی تو جس پر میاں کو تیہا آیا اسی پر

سارے مصاحبوں کا نزلہ بھی گرا۔ اب سارا گھر آنکھیں نکالنے کو مجود ہے، سچ کہا ہے نی بلے (کمزور) کی جوئیا (جورو) سب کی سلہج۔" غریب آدمی غصہ کی بات پر بھی غصہ کرے تو اس کا ساتھ دینے والا کوئی نہیں۔ فقیر کا غصہ فقیر کی جان پر اس بچارے کو تو یا اپنے ہاتھ پاؤں کی آس ہے یا اللہ میاں کی آس اور بھئی یہ تو میں نے ہمیشاں (ہمیشہ) دیکھا ہے چاہے غریب ہو، چاہے امیر غصے والے آدمی سے لوگ ڈرتے رہتے ہیں اور جو بچارا مومنا چومنا، گیگلا ہوا اس کو پیل مارتے ہیں۔ اللہ نہ کرے جو آدمی نموہا ہو بس اس کی تو محل خانے میں شامت ہی آجاتی ہے۔ آدمی کو دبڑو گھسڑو بن کے رہنا نہیں چاہیے نہیں تو کمزور مار کھانے کی نشانی۔ دیکھو نہ بچاری بکریوں کو سب چٹ کر جاتے ہیں اور شیروں کے منہ کوئی نہیں لگتا (قانون بقائے قوی) اور ہاں یہ بھی ٹھیک نہیں ہے کہ غصہ ناک ہی پر دھرا رہے کوئی بولا اور چکت دی کسی نے ہوں سے توں کی اور کاٹ کھایا۔ ایسا آدمی ٹیاں سا پٹ جاتا ہے۔ بھنجھی ہاتھ نہیں لگتی۔ نوج بی بی رکھ پت رکھاپت، مُل غصہ بھی بھانت بھانت کا ہوتا ہے اور جو آگم اندیشہ دیکھ کے طنطنہ دکھاتا ہے وہ اچھا رہتا ہے۔ ایسے بھی اللہ کے بندے ہیں جنھیں غصہ آیا تو چھر چھل پائی (چڑیل) ہوجاتے ہیں۔ بنا (بغیر) بکرا بھینٹ لیے اترنے کا نام نہیں لیتا اور بعضوں کا تیہا گنوار کے جھالے کی تنوں برسا اور نکل گیا ایک غصہ کی کہانی میں تمھیں سناؤں۔ نکل (نقل) نہیں اصل۔ محلے میں ایک پنڈت جی پڑھے لکھے دست و قلم، صورت بھگی بھگی، گورے چٹے خوبصورت آدمی کچہری میں باسٹری پر جایا کرتے تھے۔ ہزاروں کمائے لکھاں (لاکھوں) اڑائے۔ ایسا کچھ ہوا کہ سرکار نے ان سے کہا، اب تم گھر ہی پر مقدمے لڑایا کرو کچہری آنے کی ضرورت نہیں۔ خیر بھئی انھوں نے بھی کہا کہ چلو اب چین لکھتا ہے۔ میں ان کے ہیاں کبھی کبھار کھڑے تڑے چلی جاتی کیا کرتی جب دم اکتا جاتا تھا نگوڑا۔ آخر ہم بھی آدمی ہیں۔ بی ام صاحب سودے سلف کو بزار بھیجتیں اگر سودے کی تاک اسی وخت نہ ہوئی تو کھڑی ہو کے مقدمے کی سیر دیکھنے لگی۔ بھئی میں دل کی بات کہہ دوں مجھ کو ٹھیٹر (تھیٹر) بندر کا ناچ بھالو کا تماشا، نٹوں کی قلابازی، کٹ پتلی کا کھیل اتنا نہیں بھاتا جتنا مقدمے بازی میں جی لگتا ہے۔ پھر پنڈت جی جان پہچان کے تھے اور ہنس خلق ایسے کہ منہ سے پھول جھڑتے تھے۔ نہ ٹکٹ

کا جھگڑا بکھیڑا نہ تمبو قناتوں کا بکھیڑا، پھر قسم قسم کی باتیں گواہوں کی گھبراہٹ، منشیوں کے اینچ پیچ تِل پھوٹتے اپنے دوزخ بھرنے کی فِقر (فکر) وکیلوں کا چکیا گھمر گھمر کر کے اپنی کالی کالی پشوازوں (عباؤں) کا گھمانا جیسے شیرازی قبوتر (کبوتر) ڈربے میں گونجتا ہے۔ تکھار تکھار کے گواہوں سے پوچھنا، پنڈت جی بیچوں بیچ میں بیٹھے اونچی میز کرسی لگی ہے۔ چپراسی پکار رہے ہیں، منو مدعی بنام درگا کوئی حاجر ہے۔ سپاہی تلنگے سب ادب قاعدے سے ہاتھ باندھے کھڑے ہیں۔ روبکاری ہورہی ہے موکل اپنے اپنے وکیلوں کے ساتھ کھڑے ہیں۔ جیسے نائکا کے پیچھے نوچیاں کھڑی ہوتی ہیں۔ گِٹ پِٹ ہورہی ہے۔ دھڑادھڑ موٹی موٹی کتابیں کھل رہی ہیں۔ ایک آیا نگوڑے نے جوروا کی ناک کاٹ ڈالی ہے بی بی آنچل سے منھ چھپائے کھڑی ہیں۔ میاں کی ٹنڈیاں کسی ہوئی ہیں۔ ڈاکٹر آتا ہے گواہی دیتا ہے کہ حضور یہ عورت جھوٹی ہے دیکھیے اس کی ناک پر دانت کے نشان ہیں مُل ملُجم (ملزم) کے آگو کے دانت ہی نہیں ہیں۔ آخر ناک کاٹی تو کاہے سے عورت کا وکیل کہتا ہے حضور اس نے حوالات میں اپنے دانت اکھاڑ ڈالے۔ میرے پاس گواہی شاہدی مستعد ہے کہ ڈاکٹر صاحب ملے ہوئے ہیں۔ انھیں نے اگلے دانت اکھیڑ ڈالے کہ مُستکیسہ (مستغیثہ) نگوڑی ناک کٹوا کے نکوبنے اور یہ میاں مزے سے دندنائیں۔ پنڈت جی پوچھتے ہیں تم نے ناک کیوں کاٹی۔ وکیل کہتا ہے حضور میرا موکل اس سے نامکر (نامقر) ہے یہ سوال ہی نہیں ہونا چاہیے۔ دوسرا وکیل کہتا ہے کاٹی کیوں کر سے نہیں گواہوں کے سامنے موئے نے بھر منھ چکت دی بانسے سے نسولی تک صاف کردی۔ گواہوں نے کہا۔ حضور ہاں ہمارے سامنے کاٹی پھر اس مردار نے بُرا فعل کیوں کیا، آخر پنڈت جی نے چھ مہینے کو درگا کھیڑے (جیل خانہ کا پرانا لقب) بھیج دیا۔ بس رہ گئے میاں نہ کسی کی وکلیت (وکالت) چلی، نہ کچھ ہوا وہ جو بڑھ بڑھ کے زبنیا (زبان) چلا رہے تھے، منھ دیکھتے رہ گئے۔ اب دوسرے کی باری آئی میاں سینت سیت کے بھترا (شوہر) بن گئے، نہ روٹی نہ کپڑا، جورو موئی کی زندگی اکارت۔ اس نے بھی نالش ٹھونک دی، اب کیا چندرا چندرا کے کہتے ہیں۔ حضور میں تو مدت ہوئی اس کو چھوڑ چکا، یہ میکے سے راضی ہے، میرے ہیاں رہنا نہیں چاہتی، مولوی صاحب مجود ہیں، سال بھر ہونے کو آیا میں تو دو انگل کا پرزہ (طلاق نامہ) بھی لکھ چکا۔

عدالت سے ہوکم (حکم) مِلا مُلاؤ گواہوں کو۔ ایک مولانا آئے، بالکل بڑباگڑوں کی وزاں قطاں (وضع قطع) کالی عبا اوڑھے زرد پگڑی میں نگوڑے کلجھوپن منھ کی نکیامالم (معلوم) دیتا تھا کڑھی میں جلی ہوئی پھلکی تیر رہی ہے۔ آتے ہی خدا جانے کیا قالی اللہ قالے رسول کیا کہ پنڈت جی کو تیہا آگیا کہنے لگے بڑے بے ایمان ہو جی تم لمبی داڑھی چونری کی تنو لگے ہوئے ہو تمھیں شرم نہیں آتی۔ چلو نگوڑی کی عزت آبرو لے کے مردوا چھوڑے دیتا تھا ہوکم (حکم) مل گیا روٹی کپڑا نہ دوگے اور بری تنو (طرح) رکھوگے تو تم جانوگے نیک بخت پھر اسی کے سرمنڈھی گئی۔ پھر پکار ہوئی امکا ڈھمکا کوئی حاضر ہے۔

ایک تھی کبڑن ایک تھی کھٹکن دونوں میں ہوئی جھوٹم جھاٹا، مارکٹائی، دونوں آم بیچ رہیاں تھیں۔ اتنے میں ایک جنا گاہک آیا۔ یہ کہتی تھی میرے آم اچھے وہ کہتی تھی میرے آم اچھے لے بھئی یہ تو بزار ہے۔ سب چاہتے ہیں ہم گاہک توڑ لیں، اس میں لڑائی بھڑائی کاہے کی۔ مُل بات جب بڑھ جاتی ہے تو پھر ججبے (جذبہ) میں کچھ بجھائی نہیں دیتا۔ بس چلو مقدمہ کھڑا ہوگیا۔ دونوں کا منھ مالُم دیتا تھا بلیوں نے نوچا ہے سوج پھول کے توبڑا ہوگیا تھا۔ کسی کی کرتی نچ گئی تو کسو کے لہنگے میں لبیر (شگاف) اور دوپٹے تو دونوں مرداروں کے گلہری کا گوڈر ہوگئے تھے، موتی باندھنے کی جگھوں (جگہ) نہ تھی۔ مٹھی مٹھی بھر بال تلنگے نے پنڈت کی میز پر لاکے رکھ دیے۔ مجھے آگئی ہنسی کہو یہ بال رکھنا کیا ضرور تھا۔ کبڑن کے باجو (بازو) پر بڑا سا چِکتّا (نشان) بنا ہوا تھا۔ نگوڑی کنجڑن کنیا نے بھر زور چکت لگائی تھی۔ دونوں کے جُھنڈے (بال) ویران چوٹی چوہیا کی دم، لٹیں پھر پھر اڑتی ہوئی حق حیران اب گواہ بلائے گئے۔ ایک جنا آیا کہنے لگا ہجور ہم گھانس بیچ رہے تھے تو ہم نے دیکھا کبڑیئے کی مہریا (جورو) نے پہلے کھٹکن کا لہنگا پکڑکے جھراٹا مارا بیچ بجاری میں بچاری ننگی ہوگئی، کھٹکن بے کصور (بے قصور) ہے یہ تنکو نہیں بولی اور خدا جانے نگوڑا کیا اول فول بک گیا۔ جب جراں (جرح) کا وخت آیا تو پنڈت جی نے کبڑن سے کہا ”تم گواہ سے کچھ پوچھنا چاہتی ہو۔“

کبڑن بولی ”ہجور جرور کرکے پوچھوں گی یہ بھڑوا تو ہواں (وہاں) تھا ہی نہیں موا

جھوٹا ہے۔ پنڈت جی نے ٹوک دیا کہ تم اس سے پوچھو۔ وہ بولی اچھا ہجور آج تک سارا محلہ ٹولا مجھ کو جانتا ہے بڑے بڑے رہیسوں (رئیسوں) میں جاتی ہوں بھلا کوئی بتا تو دے کہ چودھری کی جورو نے کسی سے دنگا کیا ہو۔ لے یہی مردار کھڑی ہے کھا جائے اپنے پوت کھسم (خصم) کی کسم (قسم) حرامجادی کے دیدوں گھٹنوں کے آگو آئے گا، جو میرا صبر سمیٹتی ہے منہ میں کیڑے پڑیں گے۔ اے بی وی اب آؤ تو جاؤ کہاں آ گیا پنڈت جی کو تیہا۔ مُل ابھی تک وہ کچھ بولے نہیں۔ اتنے میں کھٹکن تنتک کے بول اٹھی ۔''مالجادی کی سامت آئی ہے میرے پوت کھسم کا نام لیتی ہے۔''

بس کبڑن کی زبان پھر کھلی۔ ''مالجدای تو اور تیری ہپّاد پست (ہفتاد پشت) لو اپنے یار کو گواہی دلوانے لائی ہے۔ اسی گھمنڈ پر اتراتی ہے۔'' ادھر تو یہ کنکالا چلانے لگی۔ ادھر پنڈت جی نے زور سے مکامیز پر مار۔ چپڑاسی کو ہوکم دیا نکالو اس چڑیل کو اور ایسی موٹی موٹی گالیاں دیں کہ میرے تو ہوش اڑ گئے۔ خدا بخشے تمھارے بہنوئی (شوہر امامن) کو وہ بھی تو یوں آپے سے باہر ہو جاتے تھے، گالیاں سن کے مجھے وہی یاد آ گئے۔ مُل ان کو یہ صورت کہاں نصیب تھی، جو اللہ نے پنڈت جی کو دی تھی بس ان کا لال انگارا منھ دیکھ کے میراجی چاہتا تھا بلائیں لے لوں۔ گالیاں بھی بھلی مالم دیتی تھیں۔ مگر کیا کرتی بھری کچہری تھی جو مجھ پر پلٹ پڑتے تو آبرو جاتی۔ خموش مَسٹ مارے کونے میں کھڑی رہی۔ ارے ہاں دوسرے کو جب تیہا ہو تو غم کھا کے چپ رہنا چہیے۔ دخل دینے سے بعضے آدمیوں کا جشا (جوش) اور بڑھ جاتا ہے اور تم جانو مجھ غریب کی اوقات ہی کیا، وہی ٹکے کی مہری۔ وہ امیر آدمی، پیار ہی پر بگڑ بیٹھتے تو جائے تعجب کی جگہ نہ تھی۔

ایک جگھوں میں نوکر ہوئی بی ام صاحب نئی سنیا کی تھیں مگر تھیں اوچھی پچھوری میں سچ کہوں مجھے ایسی طبیعت پھوٹے دیدوں نہیں بھاتی۔ پوچھو بی بیوں بیگموں کا یہ کام ہے کہ مسند تکیہ لگائے بیٹھی رہیں یا ماماؤں اصیلوں کا دُم چھالا بنی گھر میں گھوما کریں۔ ہر وخت رتی رتی چیز پر نگاہ رکھیں۔ نا صاحب جو یونہی ہر وخت مالک نوکر کے پیچھو پڑا رہے تو کاہے کو گزار ہو مُل یہ تو ہے چودہ صدی اس میں اور کیا ہوگا، بس

جس کام میں کسی نے ہاتھ لگایا بی ام صاحب فی نکالنے کو سر پر مہجود۔ وہی ہوا۔ ایک دن میں اغالدان (اگال دان) مانجھ رہی تھی کہنے لگیں اامن تم اغالدان کیونکر مانجھتی ہو۔ میں نے کہا حضور دیکھ لیجیے بولیں کہ مٹی سے نہ صاف کیا کرو قلعی اتر جائے گی کرارے (لکیریں) پڑ جائیں گے۔ اور میں مانجھ رہی تھی کولے کی راکھ سے بس سر سے لگی تو تلووں میں بجھی۔ اللہ جھوٹ نہ بلوائے تو لاکھ دو لاکھ اغالدان تو میں نے اپنی عمر میں مانجھ ڈالے ہوں گے۔ بی بی آئیں مجھے عقل بتانے۔ میں تڑ سے بول اٹھی حضور تو پھر بال صفا صابن ''حمام میں رکھا ہے کہیے تو وہی اٹھا لاؤں اسی سے مانجھوں سنتے ہی بی ام صاحب تھم ہوکے رہ گئیں۔ منھ سے بول نہ پھوٹا۔ اسی گھڑی میرا حساب کردیا تو میرا کیا بگڑا۔ ایک در بند ہزار در کھلے، جس نے پیدا کیا ہے وہی پیٹ بھرے گا۔ وہی ہوا کہ چھوٹتے ہی ساہ بالم (صاحب عالم) کی سرکار میں اسم ہوگیا۔ یہ دیکھو موقع موقع پر غصہ کرنے کی کرامات جو اس دن غصہ نہ آتا تو ساہ بالم کی سرکار میں کیونکر پہنچ ہوتی۔ تو میری جان غصہ کوئی اختیار کی بات نہیں نہ کہہ کے آتا ہے نہ اطلاں (اطلاع) دے کے جاتا ہے نہ پوچھتا ہے نہ گچھتا ہے۔ جب آتا ہے تو آپ ہی آپ چڑھ بیٹھتا ہے۔ نہیں آتا تو لاکھ بلاؤ نہ آئے گا۔ خدا بخشے تمھارے پہلے بہنوئی ایسے نٹ کھٹ تھے کہ زری زری سی بات پر سیکڑوں گالیاں دیتے تھے۔ ٹھوکر لگ گئی تو سودا ہوگیا۔ مٹھو نے آٹا کھلانے میں انگلی کاٹ لی تو نگوڑے کی ٹانگیں چیر ڈالیں، مُل جب ان پر چھت سے دَھنی گری، گھٹنے کی چپنی ٹوٹ گئی، اس دِنے زری سا غصہ نہ آیا۔ پھر تو ایسے ہوگئے تھے جیسے ہنستی کلی بکستا پھول لنگڑانے پر بھی برا نہ مانتے تھے۔

○

(۴)

کام کاج

نوج نکما آدمی بھی کوڑی کام کا نہیں۔ دنیا کی کہاوت ہے کہ ''آدمی پیارا نہیں کام پیارا ہوتا ہے'' جہاں جہاں میں نے کام کاج کیا ہے جس کا جی چاہے پوچھ لے کیا مجال جو کوئی نام رکھے بس یہی سنیے گا کہ واہ واہ امامن کا کیا کہنا کام کرنے میں بڑی دَھاوَت ہے۔ دھن کی چھاتی ہے، مُل ہاں میں اس کا داعیہ (دعویٰ) نہیں کرتی کہ اور اور باتیں کوئی نہ کہے گا۔ اے جے منھ وے باتیں، کوئی تو کہے گا کہ امامن کا ایسا تابعدار محنتی آدمی تقدیروں سے ملتا ہے۔ کوئی کہے گا جس گھر میں بی امامن کا قدم آیا وہاں سمجھو بھونچال آیا۔ آدمی نہیں دھرتی دھمک (توپ) ہے۔ کوئی کہے گا بھاگوان ہے کوئی بدنام کرے گا کہ بھُن پیری ہے۔ یہ اپنی اپنی سمجھ کا بجوگ[1] ہے۔ میں کوئی راون تو ہوں نہیں جس کے دس سر تھے۔ میں تو آدمی ہوں۔ اندرسبھا کے شیریں اشعار دیکھنے میں ایک ہی نپاَن[2] کے مالم (معلوم) ہوتے ہیں۔ مل مطلب کسی کا کچھ کسی کا کچھ یا گوروں کی فوج کہ ظاہر میں سب اکساں (یکساں) بروبر (برابر) مالم دیتے ہیں مُل ہیں، سب الگ۔ بس میں تو یہ کہتی ہوں کہ امامن بندی کے کام کاج کی تعریف میں ہر ایک کا منھ خشک ہوتا ہے۔ ابھی کل ٹلن نواب ہی آئے تھے۔ پھر کیا کہتے تھے یہی نہ؟ کہ زبنیا (زبان) پانچ ہاتھ کی نہ ہوتی تو امامن کا مِثل (مثل) دنیا کے پردے پر نہ ہوتا۔ اچھا پھر ہے تو ہوا کرے کام بھی تو پانچ آدمیوں کے برابر کرتی ہے۔ بھئی

1. بدنصیبی
2. ناپ، پیائش

میں بوڑھی ہونے کو آئی لیکن کام سے کبھی نہیں گھبرائی۔ انسان پیدا ہی کام کاج کے لیے ہوا ہے۔ یہ تو امیر امراء کے لیے ہے کہ مزے سے مسند پر بیٹھے حکومت کرتے ہیں بارہ بجے دن کو آرام کرکے اٹھے، پیچوان بھرا رکھا ہے۔ دو گھونٹ پیے پھر چوکی پر گئے قبضیت (قبض) کے مارے تین گھنٹے گانکھے ٹونکھے پھر دس گھڑے پانی سے آب دست لیا چوکی پر سے آئے تو گھنٹہ بھر منھ دھویا اے لو اتنے میں دسترخوان بچھ گیا۔ خاصہ نوش کیا، ہاتھ دھوئے، گلوری کھائی، چوسر بچھ گئی، مصاحب جمع ہوئے، شاموں شام تک پوبارہ اور تین کانے ہوتے رہے۔ اتنے میں سواری لگ گئی سوار ہو کے ہوا کھانے چلے گئے۔ گھومتے گھامتے آٹھ بجے رات کو آئے۔ شام کا دربار لگا۔ داستان قصے کہانیاں ہوئیں یا ناچ مجرا گانا بجانا ہوا کیا۔ بارہ بجے دسترخوان چنا گیا، خاصہ نوش کرکے آرام کیا۔ بھلا ہم غریبوں کو یہ دن کہاں نصیب۔ جو دو دن کام کاج نہ کریں تو دیوالا ہی نکل جائے۔ موئی پانچ چھ روپلی کی اوقات ہی کیا۔ سر آتے ہیں پاؤں جاتے ہیں۔ جو ذکری کی اُڑاباڑی ہوئی اور مہینا بھر گھر میں بیٹھنا پڑا تو فاقے ہونے لگے۔ سچ ہے اللہ میاں نے ہر آدمی کو ہر کام کے لیے پیدا کیا ہے۔ کوئی خذمت (خدمت) لینے کے لیے ہے کوئی ٹہل کرنے کے واسطے اور میں تو بیوی ایسی بات کی دھنی ہوں کہ کبھی مردوں سے بھی نہیں پچکی۔ عورت تو درکنار، گھر میں پاؤں توڑ کے بھی بیٹھی تو کسی ایسے تیسے کے ٹکڑے نہیں توڑے بھئی تم لوگ سب شاہد ہو کہ میں نے چھوٹے بڑے ملا کے کوئی چار نکاح کیے مگر مردوے کی کمیّا (کمائی کلمہ تحقیر) کی راہ نہیں دیکھی کہ آئیں تو پیٹ میں ٹکڑا پڑے نہیں تو فاقہ۔ جاموے تیری کمائی کا یہاں کون محتاج ہے۔ اس بڑھاپے میں بھی جس جوان جہاں عورت کا جی چاہے مقابیہ (مقابلہ) کرکے دیکھ لے جو بھئی ہرا نہ دوں تو ٹانگ کے رستے نکل جاؤں۔ کوئی دو مہینے ادھر کا ذکرا (ذکر) ہے کہ ایک بڑا سا اجگر صندوق[1] رکھا تھا۔ میں جھاڑو دے رہی تھی۔ صندق کے پینڈے کے نیچو (نیچے) کوڑے کا اٹم لگا ہوا تھا۔ ستھرائی[2] جانے کی گنجاش (گنجائش)

---

1 بہت وزنی

2 جھاڑو

نہ تھی۔ تو میں نے کہا لاؤ اسے ایک طرف اٹھا کے رکھ دوں اتنے میں آ گئی اناّ کی لڑکی نجبن۔ جوان بچھیا، بیاہی تیاہی۔ کہنے لگی اوئی بوا اماّمن بھلا یہ پہاڑ سا صندوق تم کیونکر اٹھاؤ گی کہیں زیرناف درد نہ اٹھ کھڑا ہو باہر سے کسی مردوئے کو بلالو، میں نے کہا چل چھوکری آئی ہے مجھ بڑھیا کو سبق دینے۔ آدمی میں اکیلی کیا کم ہوں جو کسی مرد کو بلاؤں۔ اَے میں تو تجھے بھی اس صندوق میں بند کر کے اٹھا سکتی ہوں۔ آزما دیکھ۔ وہ مارے ہنسی کے لوٹ گئی۔ بولی سچ مچ میں نے کہا سچ مچ نہیں تو کیا جھوٹ موٹ، جی چاہے شریط (شرط) بدلو۔ خیر بھئی اس نے کہا آؤ ہاتھ مارو، مُل میں جیتی تو دو آنے تم سے کھڑے کھڑے بھروا لوں گی پھر چے مانتی (کج بحثی) نہ کرنا کہ یوں نہیں دوں۔ میں بولی کہ تم بھی ناکر (نامقر) نہ ہونا۔ وہ جو تھی جھپ سے پڑا اٹھا غراپ دینی صندوق میں جا بیٹھی۔ جونہی میں کڑوں میں ہاتھ ڈال کے اٹھانے لگی۔ ووہیں بی ام صاحب آ گئیں، بس میں تو سہم گئی، جیوں تیوں صندوق تھوڑی دور پر کھسکا کے رکھ دیا۔ بی ام نے پوچھا۔ ابھی تو ہیاں نجبن کھڑی تھی یہ کہاں غائب ہوگئی۔ اب میں چپ کیا کہوں؟ جھوٹ بولتی ہوں تو روزہ کھنکھنا ہوتا ہے۔ سچ کہتی ہوں تو بی ام اپنے دل میں کیا کہیں گی کہ بوڑھی جورو سینگ توڑا کے بچھیڑوں میں داخل ہوگئی۔ پھر جی نے کہا اوہ بہت ہوگا نوکری سے چھڑا دیں گی۔ جھوٹ کیوں بولوں چلو بات ہنسی دل لگی میں ٹل گئی۔ مل نجبن اس دن سے لوہا مان گئی۔ جب مجھے دیکھتی ہے ہنستی ہے ''افوہ ری بوڑھیا تیری ہڈیاں لوہا لاٹ ہیں'' لوہا لاٹ نہ ہوتیں تو آج چلنے پھرنے دوڑنے دھوپنے میں جوانوں پر کیوں کرور رہتی۔ کام کاج نہ بیماری دکھی کو مانے نہ آندھی پانی کو دیکھے۔ وہ تو بے کیے ٹلتا نہیں۔ جو لوگ استخارے دیکھ دیکھ کے بات ٹالتے ہیں وہ سدا البچار (لاچار) رہتے ہیں۔ پڑوسی مولوی صاحب کو دیکھو، باہر سے کسی نے پکارا مولوی صاحب زری باہر تشریف لائیے۔ مولی صاحب نے اٹھائی تسبی (تسبیح) آنکھیں بند کیں استخارہ دیکھا دو دانے آئے۔ اب ایک ایک سے کہتے ہیں ''کہہ دو اس وقت نہیں ہیں'' جب اس نے کہا کہ اچھا کہہ دینا بندہ حسن آیا تھا نواب موسم علی خاں (محسن علی خاں) کے ہیاں سے عاقبتی جوڑا لایا تھا۔ اے جوڑے کا نام سنتے ہی مولوی نے جھٹ کنٹھا اٹھایا اور

دانے ادھر ادھر پھرا کے بول اٹھے، ٹھہرو بھئی میں آتا ہوں۔ اس وقت سونے لیٹا تھا لڑکے نے کہہ دیا گھر میں نہیں ہیں۔ لاحول و لاقوۃ یہ لونڈا کس قدر جھوٹ بولتا ہے۔ لے بھلا تم ہی دل میں انصاف کرو یہ بھی کوئی بات ہے۔ اللہ نے آدمی کی سی شکل آدمی کے سے ہاتھ پاؤں دیے ہیں، استخارہ بھی کھیل ہوگیا۔ کھانا کھائیں تو استخارہ، پانی پئیں تو استخارہ، نگوڑی جروا کے ساتھ سوئیں تو استخارہ۔ اسی سے فاقوں پر فاقے پڑتے ہوتے ہیں۔ جو کوئی ان کی تقدیروں سے مرگیا تو ان کے گھر عید ہوگئی۔ میں نے ایسے کاہل نکمے بہت سے دیکھے ہیں جن کے ہاتھ پاؤں تو دیدارو ہیں اچھے خاصے موٹے تازے مُل چرپائی (چارپائی) کے بان توڑنے کے سوا اور کوئی کام نہیں کرتے۔ درگور ایسے نکھٹو کس کام کے میں کہتی ہوں ان کی جروا اپنے دل میں کیا کہتی ہوگی۔ اے ہیاں تک تو دیکھا ہے کہ میاں ڈنٹر پیل جوان ہیں اور جورو دھان پان، مل جورو پانی کے گھڑے کولھے پر لاد لاد کے لاتی ہے اور یہ بیٹھے دیکھا کرتے ہیں پھر خالی نازک دھان پان ہی نہیں، نگوڑی آئے دن کی روکھیل (بیمار) روز دائی آتی ہے۔ پیٹ درست ہونے نہیں آتا۔ اے دور کیوں جاؤ، یہ نگوڑے ہٹے کٹے فقیر جو آج محنت مزدری (مزدوری) کریں تو حق حلال کی روٹی کھائیں مُل نہیں وہ تو چار کے دروڑے (دروازے) پر صدا لگائیں گے۔ اللہ بھلا کرے بھائیوں کی جوڑیاں برقرار رہیں۔ پھندنا سی دلہن کا گھر میں قدم آئے الٰہی میری سرکار دودھوں نہائیں پوتوں پھلیں۔ موتیوں دال دلنا نصیب ''کہو نگوڑے خدائی خورو (خوارو) تمھیں شرم نہیں آتی، کہیں گھرکیاں کھاتے ہو کہیں سے دتکارے (دھتکارے) جاتے ہو، اس پر بھی باز نہیں آتے۔ اپنے ہاتھ کے کام کاج کی کیا بات ہے میں تو کہتی ہوں امیر امراؤ کو زندگی کا خاک لُوطف (لطف) اٹھتا ہوگا۔ جو کوئی موزے پہناوے تو پہنیں، جو کوئی پانی پلاوے تو پئیں نہیں تو پیاسے بیٹھے رہیں، میں اس کی قائل نہیں ہوں، بعضی بعضی ماماؤں کو میں نے دیکھا کہ ایک ٹھکانے جم کے نہیں رہتیاں۔ آج اس گھر میں تو کل اس گھر میں یہ اُٹھاؤ چُولہا ماماَئیں بھی میری جانم میں نپ نہیں سکتیں۔ کہو بی دی یا کسو کا ہو رہے یا کسی کو کر رکھے جم کے رہنے میں سرکار ہوجاتی ہے پرانی حق حقوق کی راہ کھل جاتی ہے۔

آج میں نواب ٹلن کھیاں (کے یہاں) نہیں ہوں مُل بھیّا کی دودھ بڑھائی ہوئی تو میں نے بھی کہا لائیے میرا جوڑا آخر میں نے بھی تو دو برس آپ کا نیمک (نمک) کھایا ہے میرا حق بھی ہے کہ نہیں۔ اس پر بی ام صاحب کہنے لگیں کیوں حق نہیں تو گھبراتی کیوں ہے تیرا جوڑا سیا سلایا رکھا ہے، بلکن (بلکہ) بہوصاحب نے بھانجی ماری کہ اب انھیں جوڑا دیں یا جو آدمی رات دن خدمت کر رہے ہیں انھیں دیں۔ مُل بے ام صاحب نے ایک نہ سنی وہ یہی کہے گئیں کہ نا صاحب امامن ہمارے ہیاں کی پرانی مہری ہے نیا نو دن کا پرانا سو دن کا، اس کی بَربرّی کوئی نہیں کرسکتا۔

بھلا جلدی جلدی جگھوں بدلنے میں یہ بات کہاں نصیب۔ خیراتن کو تم نے بھی دیکھا ہوگا اے وہی جو بخشی کے تلاؤ (تالاب) کے پاس کسی گاؤں کی رہنے والی تھیں۔ دیکھو بھلا سا نام ہے پیٹ میں ہے منھ میں نہیں آتا۔ اے سبحان اللہ کیا کھانا پکاتی تھی کہ اچھے اچھے بورچی انگلیاں چاٹا کریں۔ اس نے بھی اللہ جھوٹ نہ بلائے تو کوئی پچاس نوکریاں تو کی ہوں گی۔ جُروا چھلاواتھی چھلاوا، ایک جگہ پاؤں نہیں ٹکتا تھا۔ آج ہیاں کل ہواں۔ ہاتھ میں ہنر تھا، نوکری ہاتھ باندھے کھڑی رہتی تھی۔ میں سچ کہوں بھئی میں کوئی ایسی ہنروندی (ہنرمند) نہیں ہوں۔ ایک نوکری چھوٹ گئی تو مہینوں گھر ہی بیٹھنا پڑا۔ مُل ہاں وہی جو کوئی جانتا ہے کہ امامن کام کاج میں نابر (کمزور) نہیں۔ وہ خوشامد کر کے پھر نوکر رکھ لیتا ہے۔ کاہے سے کہ آج کل آدمی جنوں کی تو اُڑا باڑی ہے۔ بَلکِن پڑھے لکھے آدمیوں کی کمتی (کمی) نہیں۔ خدمت گار کی جہاں دیکھو مانگ ہے، پڑھے لکھے آدمی مزدوری دھتوری نہیں کرتے، ٹکے ٹکے مارے مارے پھرتے ہیں، کوئی پوچھتا تلک نہیں۔ پنڈت جی کھیاں ایک منشی درکار تھا انھیں نے اشتہار جو دیا تو لے میری بیوی کوئی پانسو عرضیاں آئیں، ایک کہتا تھا ہمیں نوکر رکھ لو، دوسرا کہتا تھا ہمیں رکھ لو نتھنوں میں دم آگیا۔ بچارے پنڈت جی گھبرا گئے بڑے بڑے لوگوں نے سِہی کاری (سعی سفارش) کی۔ اب کس سے منھ موڑیں کس کی بات مانیں۔ دروزے پر عرضیوں کا جواب لینے کے لیے ٹھٹھ کے ٹھٹھ لگے رہتے تھے۔ وہی مثل ہے ایک انار سو بیمار۔ آخر انھیں نے ہر ایک سے کہہ دیا کہ ہمیں اب منشی کی ضرورت نہیں ہے۔ کچھ

دنوں ٹال مٹول کر کے ایک مرد آدمی کو نوکر رکھ لیا، تب پیچھا چھوٹا، ایسے پڑھے لکھوں سے تو ہم جاہل اچھے کہ قدر تو ہوتی ہے، بیسیوں جگھوں سے طلب ہوتی ہے۔ جب میں نے پنڈت جی کے یہاں نوکری کرلی، نوکری کیا میں تو ان کی صورت دیکھنے کے لیے سینت مینت (مفت میں۔ گنواری بولی) ٹہل خدمت کرنے کو مجود (موجود) تھی مُل وہ تھے رئیس آدمی بھلا ناک پر مکھی کا ہے کو بیٹھنے دیتے وہ تنخواہ طلب ہر مہینے دیتے تھے۔ تو اسی زمانے میں بیسیوں آدمیوں نے بھڑکایا۔ ارے ایک ہندو کھیاں پڑی ہو، وہ بھلا کیا دیں گے یہی دس روپلی وہ بھی خشک۔ پھر اوپر کی آمدنی نہیں۔ اس سے تو ہمارے ہیاں چلی آؤ ''ہم بارہ روپے دیں گے، مُل میں دل سے مجبور تھی، بی بی سکھ کے چنے اچھے دکھ کا پلاؤ نہیں اچھا۔ خیر جی ہوگا، میں سمجھتی تھی کہ پڑھنے لکھنے سے کوئی فائدہ ہوتا ہے مگر واہ۔

عجب تیری قدرت عجب تیرے کھیل
چھچھوندر لگائے چنبیلی کا تیل

میں نے اپنے بڑے لڑکے کو تھوڑے دنوں مولی صاحب کے پاس بٹھایا، نام دام لکھنے کا کام کاج کرنے میں وہ بھی ہیٹا نہیں۔ ماشے اللہ میں اپنی ایڑی دیکھ کے کہتی ہوں، ہاتھ پاؤں کا اچھا ہے، اپنے باپ سے ڈیل ڈول میں مٹھی بھر نکلتا ہوگا۔ دن رات کسی نہ کسی کام میں مگن رہتا ہے، مگر مِزاز (مزاج) وہی باپ کا سا ہے۔ الول جلول، ضد یہ ہے کہ جو کام بتاؤ وہ نہ کریں گے۔ کہو لکڑی چیرو تو گلی ڈنڈا کھیلنے لگیں گے۔ پانی بھرنے کی فرماش (فرمائش) کرو تو کنکوا اڑانے لگیں گے۔ پھر الول جلول مزاز والے کا تو یہی حال ہوگا، اس کی کمائی میں برکت کہاں۔ آج کل خیر سے گورکھپور کے ایک رئیس کھیاں نوکر ہے، ابھی ایک جنے سے حال مالم ہوا تھا کہ خدمت گاری میں تو ہشیار نہیں مُل تاڑ کے درخت پر خوب چڑھتا ہے۔ خیر جہاں رہے خوش رہے، میں چہتی (چاہتی) تھی کہ کمانے دھمانے لگتا تو دو بول (نکاح) پڑھوا کے ان کے فرض سے بھی اداں (ادا) ہوجاتی۔ تاڑ کے پیڑ پر چڑھنا بھی ہنر ہے ہنسی ٹھٹھا نہیں ہے۔ بڑے بڑے صاحب لوگ ولایت سے سرکش (سرکس) کا تماشا دکھانے آتے ہیں

اور ملک بھر کا روپیہ بٹور کے لے جاتے ہیں۔ جی یہ دل لگی بازی نہ ہو۔ آخر وہ بھی تو قلا کھیلتے ہیں اور قلابازی میں اتنی برکت اللہ دیتا ہے کہ گھوڑے گاڑی پر چڑھے چڑھے پھرتے ہیں۔ آدمی چھپئے کام کی کمتی نہیں۔ اب ایک نیا دھندا (پیشہ) نکلا ہے سنتی ہوں اس میں بھی بڑی آمدنی ہوتی ہے۔ اس نگوڑے دھندے کا نام بھی نرالا ہے۔ ''ہرتال'' مواگندانام ہے، ہماری جوانی میں جو کوئی عورت ہڑتال کا نام بھی لیتی تو چٹکیوں میں اڑائی جاتی۔ اے ہے شرم کی بات ہے، مُل آج کل تو بزار میں ہرتال ہرتال کی پکار ہوتی ہے اور کوئی نہیں جھینپتا، تو بات کیا ہے بری بات کا رواج ہوجاتا ہے تو وہ بھی اچھی ہوجاتی ہے۔ میری سمجھ میں تو یہ مڑک (تدبیر) نہیں آتی کہ نگوڑی ہرتال میں کس تنو کمائی ہوتی ہے۔ مگر ایک منشی جی نے سمجھا دیا کہ ہرتال کرنے والے تو گھاٹے میں رہتے ہیں، ایک دن بکری کا نصخان (نقصان) ہوتا ہے بزار بند ہوجاتی ہے۔ ہاں ہڑتال کروانے والے مزے میں رہتے ہیں۔ موٹروں پر چڑھے گھومتے ہیں۔ دھوم سے آوَ بھگت (استقبال) ہوتی ہے۔ کمیٹھیاں (کمیٹی) کرتے ہیں، چندہ تھیلتے ہیں، جہاں جاتے ہیں لوگ آنکھوں پر بٹھاتے ہیں دعوت کرتے ہیں، مان گون خاطر داری ہوتی ہے۔ لے پوچھو بھلا ہرتال ہیں کیا مزا ہے۔

ایک دن کا حال سنو میں جارہی تھی ''دیویں'' (دیوہ شریف) کے میلے، رستے میں ہزاروں آدمی ایک ٹھکانے جمع تھے مگر سب مزدورے دھتورے ریل گھر کے قلی ایک مردوا پگڑی باندھے چیخ رہا تھا۔'' بھائیو آٹا مہنگا ہے، مٹر کی دال موتیوں کے مول بکنے لگی، تم سب فاقوں مرتے ہو امیر لوگ مزے کرتے ہیں، ریل کی کمپنی تمھارے ہاتھ پیروں کے صدقے میں راج رجتی ہے۔ مگر مزدوری نہیں بڑھاتی۔ اب اس اندھیر کھاتے کا خاتمہ ہونا چاہیے تم سب کام کاج چھوڑ دو۔ بس یہ تگنی کا ناچ ناچنے لگیں گے، مانگے بھیک بھی نہ ملے کوئی کوڑی کے دو بیر بھی ان کے ہاتھ سے نہ کھائے۔ جو کارخانے والے ریل والے سری ٹیک (سر ٹیکتے) کرتے ہاتھ جوڑتے تمھارے آگو (آگے) نہ آئیں تو جب ہی کہنا بس ہلڑ ہوگیا،''لالہ مدھو کی جے'' خوب تالیاں پٹیں۔ خوب لُو لُو ہوئی مگر جتنی تالیاں بجتی تھیں یہ مردوا ایسا ڈھیٹ تھا کہ اور خوش ہورہا تھا شرم

نہیں آتی تھی۔ میں بھی اس زمانے میں نواب چھاجو صاحب کی نوکری چھوڑے بیٹھی تھی، میرا اندر والا (دل) بھی کہنے لگا کہ بی امامن مامائیں اصلیلیں بھی اسی تنو ہرتال کرتیں تو کیا اچھا ہوتا۔ اس وقت اللہ بخشے مجھے اپنے دوسرے میاں یاد آگئے جو وہ زندہ ہوتے تو بس ہرتال اوڑھتے ہرتال بچھاتے، خیر وہ نہیں تو ان کی نشانی میرا بڑا لڑکا مجود ہے، انشاء اللہ تالا (تعالیٰ) وہ ہرتال کرے گا۔ اے ہاں وہ بھی کام کاج سے گھبراتا ہے۔ بس اَین مَین (بعینہ) اپنا باپ ہے، ان میاں کی جان سے دور وہ میاں مرنے والے بھی یہی کرتے تھے سموں (صبح) ہوئی پھڑوا (پھاوڑا) اٹھایا گھر سے نکل گئے۔ شام کو آئے چار لکڑیاں ہاتھ میں ارے کیا کرتے رہے دن بھر، کچھ نہیں مزدوری لگی نہیں تو میں نے کہا لاؤ گیڑیاں کھیلو ایک وقت کا ایندھن ہی ہوجائے گا۔

ہاں سچ ہے آدمی کو چہیئے کام کاج کیے جائے بیٹھے نہیں۔ بیکار کام سے بھی کچھ نہ کچھ فائدہ ہوتا رہتا ہے۔

مدرسے میں ایک لڑکا کتاب پڑھ رہا تھا، اس میں لکھا تھا، جس نے ریل نکالی وہ کھانا پکا رہا تھا بھاپ کے زور سے ہنڈیا کی ڈھکنی جو اوچھلی تو اس کے دل نے کہا افوہ بھاپ میں اتنی طاقت ہے، اے لو بس اتنی سی بات پر اس نے ریل بنا ڈالی۔ یہ سب عقل کا کھیل ہے۔ عقلوند (عقلمند) کی دور بلا۔

پڑوس میں ایک کرایہ دار اٹھ کے آئے، وہ بھی بلا کے عقلوند تھے۔ ارے مٹی سے پیسہ پیدا کرتے تھے، پھر مزا یہ کہ گھر سے باہر قدم نہیں نکالتے تھے۔ دھونکنی، نال، کھالی، کھریا سے کچھ شوغل (شغل) کرتے تھے۔ نہ جانے کیا بجوگ پڑا جو پولس (پولیس) آئی اور بچارو (بیچارے) کو پکڑ لے گئی۔ جو پولس نہ پکڑتی تو وہ اللہ کا بندہ ضرور سونے کا چبوترہ گھر میں بنا لیتا۔

ہمارے میاں صاحب بھی ان کے ساتھ شوغل کرتے تھے وہ تو اللہ نے خیر کی، نہیں تو وہ بھی دھرے جاتے۔ ایسا کام کس کام کا جو بے کار بیٹھو تو ہاتھ پاؤں لوتھ ہوجاتے ہیں۔ جوانی میں کماؤ بڑھاپے میں کھاؤ، وَخت دیکھ کے بات کرو، بری صحبت میں نہ بیٹھو، وہی مثل ہے ''بیٹھ اچھی صحبت چبانا گر پان بیٹھ بری صحبت کٹا ناک اور کان۔''

ایک ہماری بھانجی صاحب ہیں نگوڑی سدا کی اپاہج خاوند سے کبھی نہ بنی، نوکری کی تلاش (تلاش) میں رہتی ہیں۔ نوکری نہیں جُوتی (میسر آتی) کہنے لگیں خالہ رُزگار (روزگار) سے لگا دو۔ میں بولی تم سے...... نوکری نہ ہوسکے گی ہاں ایک جگہ ہے کہو تو بتا دوں، پوچھنے لگی کہاں؟

میں نے جواب دیا "مرچ شہر (امریکہ) کی بھرتی ہورہی ہے وہیں چلی جاؤ" ہات ترے کی، تھی لونڈیا، چپ ہوگئی نہ آخر؟ ایسی اپاہجوں کا یہی علاج ہے۔

○

"........... علاقوں کے جانے کی 26/جنوری تاریخ مقرر ہے۔ عمر قمری حساب سے ستّر کے اوپر ہوچکی ہے۔ آئندہ کی امید موہوم، مستقبل بالکل اندھیرا ہے، مگر منصوبے برسوں آگے کے باندھے بیٹھے ہیں۔ حقہ ایسا پیتے ہیں کہ لچھے دار دھواں سلطان عالم مرحوم و مغفور کی یاد تازہ کراتا ہے۔ چائے پر مکھن، مربہ، بسکٹ ہیں، دسترخوان پر مزے کی چیزیں ہیں۔ کاہلی میں ایسے مگن ہیں کہ حقے کا گھنٹہ بھی دبانا ہو تو گھر میں "یہاں آؤ" کی فرعونی آواز گونج جاتی ہے مگر خود ہاتھ بڑھا کر گھنٹہ نہیں دبا دیتے۔ باوجود ان باتوں کے بے بسی، بے اختیاری برابر زور پکڑ رہی ہے مگر ہاتھ پاؤں نہیں ہلاتے۔ تمھارے گھر کے پاس منگل کی بازار میں ایک بہت بڑا املی کا درخت تھا، اس شان کا درخت ردولی میں دوسرا نہیں تھا۔ آندھی جو آئی تو ٹوٹ پڑا۔ دیکھا گیا تو شاندار تنا اندر سے بالکل کھوکھلا ہوگیا تھا۔ لکڑی نہ سوختنی نہ فروختنی..........."

(ہما بیگم کے نام خط مورخہ ۲۴/دسمبر ۱۹۵۰)

(۵)

خَیر خَیرات

اے جو کوئی صدقہ خیرات للہ فی اللہ کرتا ہے تو اپنے بھلے کے واسطے کرتا ہے کہو اس سے کیا مطلب کہ کون کیسا ہے کس کے کرتوت بھلے ہیں، کس کے بُرے ہیں۔ تم کو اس قضیاؤ سے کیا۔ اے ہاں چار پیسے اپنی آنقبت (عاقبت) سنوارنے کے لیے دیتے ہو تو دو۔ میرا صاحب یہ پوچھ گچھ کیسی، اچھایوں ہی سہی، تم نے دو پیسے دیے، اس نے پائے سیدھا چلا گیا، پکڑ پر ہواں (وہاں) داؤں پر لگا دیے تو پھر دینے والے کا کیا بگڑا، وہ جانے اور اس کا اللہ۔ تم کوئی کسی کے دل میں بیٹھے ہو؟ اس نے آپ اپنی گور انگاروں سے بھری۔ دوسرے اللہ میاں جواری کو بھی نوازتے ہیں ۔

اسے فضل کرتے نہیں لگتی بار

تمھیں کیا مالم (معلوم) کہ اللہ میاں اسے بخشیں گے یا کہیں گے چل موئے ہیاں سے (یہاں سے) دور دفان۔ جا جہندم (جہنم) میں کوئی کریل کریل کہتا ہے کوئی کریم کریم کہتا ہے اللہ میاں سنتے ہیں سب کی۔ امیر امراء کو دیکھو آپ جا کے ہوٹل میں تھوتھو نگوڑا ڈھیروں کالا پانی ڈھکوس جاتے ہیں، تو کچھ نہیں، موئے بدمہری (سور) کے مُتّبے ٹھونستے ہیں تو کچھ نہیں۔ ہزاروں روپیہ گھوڑ دوڑ میں، تاش میں ہارتے ہیں تو کچھ نہیں مُل ادھر کسی نے ہاتھ پھیلا کے کہا ''اللہ بھلا کرے'' بس لگے وکیل کی طرح جراں (جرح) کرنے اور سات پشتوں کا حال پوچھنے، تمھارے میاں کہاں ہیں یہ لڑکا کتنے دنوں کا ہے۔ تم کب رانڈ ہوئیں کام کاج کیوں نہیں کرتیں۔ نوکری کرو گی۔ یہ ناک میں کیل کیسی ہے۔ چھیل چھکلیاں [1] بنی پھرتی ہو۔ پھر بھیک کیوں مانگتی ہو، کسی بھلے

---

1. بانکی، ترچھی، سجیلی

مانس کا ہاتھ پکڑ کے بیٹھ کیوں نہیں جاتیں، ابھی تو اچھی طرح بڑھاپے کی دال نہیں گلی، جوانی کی کنی باقی ہے۔

لیجیے صاحب باتوں کا تانتا لگا، منہ میں بواسیر ہوگئی۔ بری بری آوازوں کا تار ہی نہیں ٹوٹتا— ہائے چودہ صدی، دینا دلانا کچھ نہیں۔ بڑی بڑائی ٹکا ہاتھ دھریں گے۔ مُل جھگڑے بکھیڑے اتنے۔ جو دیکھیے تو یہ تھوڑی کہے اللہ کے نام پر دے رہے ہیں یہی سمجھے کہ لڑکے لڑکی کی نسبت ٹھہرا رہے ہیں، اور بعض بعضے لوگ تو دینے کا نام گالی بھی نہیں دیتے، اس پر وہ قضیاؤ چھانٹتے ہیں کہ بھیجا تپکنے لگتا ہے اور اب تو زمانے کی سنیا ہی پلٹ گئی۔ نگوڑی خیر خیرات میں بھی قاعدہ قانون گھس گیا ہے۔ نہ اقین (یقین) ہوجاکے اتیم خانہ (یتیم خانہ) دیکھ آؤ۔ اللہ اللہ دفتر لگا ہے، میزیں بچھی ہیں، بہی کھاتے الٹے جارہے ہیں۔ اتیم خانہ کا ہے کو ساہ جی کی کوٹھی ہے۔ یہ لڑکا ہواں سے آیا ہے وہ ہیاں سے آیا ہے۔ اس کو یہ ملا اس کو وہ دیا گیا۔ بڑے بڑے اشتہاروں میں نام چھپتے ہیں۔ اکے نواب نے چالیس روپیہ بھیجے کہ اتیم بچے مقدمہ جیتنے کی دعا مانگیں۔ ڈھمکے راجہ نے سو روپیہ بھیجے ہیں کہ رانی کھیاں بچہ پیدا نہیں ہوتا۔ پیٹ نہیں رہتا، یہ بھی چودھویں صدی کا لیکھا ہے ہم تو اپنے زمانے میں دیکھتے تھے کہ خیر خیرات میں ایک ہاتھ سے دوسرے ہاتھ کو خبر نہیں ہوتی تھی۔ نواب ٹلن صاحب جب مرے ہیں تو بیس پچیس رانڈوں کی ڈولیاں ساتھ تھیں۔ ایک کہرام تھا کہ آج رانڈوں کا وارث چل بسا جیتے جی ماشور (مشہور) تھا کہ بڑے کنجوس ہیں۔ تو وہ کیا کوئی آج کل کے لوگوں کی تنو (طرح) دے کے ڈھنڈورا تھوڑی پیٹتے تھے، اے نوج وہی مثل ہے نکٹے کا کھائے اکٹے کا نہ کھائے۔[1] نگوڑا جو کوئی دکھیا غیرت دار ہو تو مارے شرم کے کٹ جائے۔ آنکھیں چار نہ کرسکے تو وجاں (وجہ) کیا کہ اپنے نام پر یہ لوگ دیتے ہیں کوئی خدا کی راہ کا سودا تھوڑی ہے۔ اسی سے تو برکت اڑ گئی لاکھوں دیتے ہیں، پھر بھی ثواب نہیں ہوتا۔ کسی کے دل سے دعا نہیں نکلتی۔ پرسوں کا ذکر ہے راجہ کنجوس نگر کی

---

1. کمینہ کا احسان مند نہ ہونا چاہیے۔

ڈیوڑھی پر کیا دیکھتی ہوں کہ آٹھ دس موٹریں کھڑی ہیں، اچھی اچھی پوشاکیں پہنے، رئیس لوگ آئے ہیں، میں نے پوچھا آج کیا ہے مہرا بولا کچھ نہیں یہ رئیس لوگ رانڈ خانے کے لیے بھیک مانگنے آئے ہیں۔ پوٹیشن آیا ہے۔ اوئی پوٹیشن کیا چیز ہے؟ اس نے کہا یہ میں نہیں جانتا۔ میں نے کہا دور بھی ہو نگوڑے تو مجھے کیا بتائے گا میں سمجھ گئی وہی کوئی پوٹا ٹرکرنے والی بات ہوگی۔ ہائے غضب، یہ ریاست دیکھو اور یہ بھیک مانگنا دیکھو۔ رئیسوں نے بھی غیرت بھون کھائی۔ وہی مثل ہے ''بھیک مانگنے چلے اور مشلچی ساتھ'' بھلا جو اس شان و شوکت سے امیر امراء بھیک مانگیں گے تو پھر غریبوں کو کون دے گا۔ کمبختی پور کے تالقدار (تعلقدار) ہوکے تیرے میرے آگے ہاتھ پھیلانے آئے ہیں اخ تھو۔ کیا باپ دادا کا نام روشن کیا ہے۔ واہ رانڈوں کی پرورش کرنی ہے تو ان کی تنخواہیں مقرر کردو بیچاریاں کونے میں بیٹھ کے رنڈاپے کے دن کاٹ دیں۔ ان کے لیے ڈربا بنانے کی ضرورت کیا ہے۔ آخر حسین آباد بھی تو ہے بیسیوں بیواؤں کی طلب مقرر ہے گھر بیٹھے پہنچ جاتی ہے ہاں یہ پوچھ لیتے ہیں کہ رانڈ بے وارثی غریب محتاج ہے یا نہیں۔ شریف منزل، رئیس منزل، سب رئیس مِل کے حسین آباد کو روپیہ دے دیں تو رانڈوں کی پرورش اچھی تنو ہوسکتی ہے۔ مُل اپنی ڈھائی اینٹ کی مہجد (مسجد) الگ نہ بنائیں تو اپنا نام کاہے کو ہو۔ میرے جی میں آئی کہ لاؤ دیکھوں تو رانڈ خانہ کیسا ہوتا ہے۔ قضاں اتفاق (قضا و اتفاق) میں ان ڈپٹی صاحب کے ہواں نوکر تھی ان کی بیگم گئیں بنارس اپنے میکے، وہ دیکھنے گئیں عورتوں کا اتیم خانہ، اوئی میری بیوی وہ وہ سُنڈیاں بھری تھیں، آتھلے پاتھلے نہ جانے کیا کیا نام تھے کہنے کو تو رانڈیں ہیں مُل ایسی آرام سے رہتی ہیں کہ بیوی اپنے دل کی بات کہہ دوں میرا تو جی چاہا کہ ناک کی کیل ہاتھوں کی چوڑیاں وہیں ٹھنڈی کردوں اے ہاں جو رانڈ ہونے میں یہ چین عیش ہے تو کانش (کاش) تیس برس ادھر رنڈیا ہوگئی ہوتی۔ نصیبوں کی خوبی رانڈ بھی ہوئے تو کب جب سَرسَن سفید ہوگیا۔ کہو اب جو ہم ان لوگوں سے کہیں کہ ہم بھی رانڈ بیوہ ہیں بوڑھاپا آگیا ہے دن ہاتھ پاؤں چلتے رہیں دے دن رزق پیٹ میں پڑے جاتا ہے

ہمیں بھرتی کرلو تو بھرتی کریں گے؟ بھلا ان جوانوں کے آگے ہمیں کون پوچھے گا کہیں گے، اے بی چلو ہوا کھاؤ، بھیک مانگو، مرنے جوگی بوڑھیوں کو کون سمیٹے۔

خیر بھئی بات میں بات نکلتی ہے۔ یہ ڈھنگ صدقہ خیرات دینے والوں نے سیکھے تو بھیک منگوں نے بھی نئی نئی چالیں سوچ لیں۔ پہلے یہ ہوتا تھا کہ محلے ٹولے میں کوئی مر گیا تو روتے منہ بسورتے کسی رئیس کے دروزّے (دروازے) چلے گئے۔ حضور اس شخص کے سالے کی ساس کی منہ بولی بیٹی کے پھوپھی زاد بھائی کے بہنوئی کی پڑوسن کے سمدھی کے نواس داماد کے خالہ زاد بھائی کی انا کے چچا کی بی بی رانڈ ہوگئی کفن نہیں ہے۔ چلیے دوچار روپیہ مل گئے۔ ایک آدھ روپیہ اپنے ڈب (جیب) میں رکھا باقی گورگڑھے میں صَرف کردیا۔ اب جو کوئی یوں آکے کہے تو چپڑاسی ساتھ ہوتا ہے۔ جاؤ دیکھو تو آدمی سچ بولتا ہے کہ جھوٹ کہتا ہے۔ تُو دوڑ میں دوڑ۔ اسی دوڑ دھوپ میں مُردے کی بائی کچائی نکل گئی سوکھ کے مرنڈا[1] ہوگیا تو کہیں گڑنے تو بچنے کی باری آئی۔ پھر بندہ بشر ہے اس نے دھیلا فریب کیا تو کیسی بنی۔ کٹی کہ رہی یہ نہیں خیال کرتے کہ اچھا بھئی مانا ہم نے وہ جھوٹ ہی سہی تو کوئی ایسی ہی تاک ہوگی جب تو اس نے جیتے جی اپنے رشتہ دار کو مار ڈالا۔ ننگا ہوگا، بھوکا ہوگا، اس کی مدد کرنی چاہیے۔ اُوں ہوں، وہ دل ہی نہیں مُل چال بازوں کے آگے امیر امراء کی چلاکی (چالاکی) نہیں چلتی۔ تم ڈال ڈال تو وہ پات پات۔[2] ایسے بنتے ہیں کہ جواب نہیں۔ زبان بگاڑ کے کہہ دیا۔ دلواؤ بھائی آغا بھوکا ہے کُھراسان (خراسان) کا رہنے والا ہے راہ میں لُت (لٹ) گیا۔ صورت دیکھو تو ویسی ہی پگڑی بندھی ہوئی، ویسے ہی جھبا (جبہ) پہنے ویسی ہی اُنیس تھان کی ازار (شلوار) ٹانگوں میں، ویسی ہی داڑھی، رہنے والے ہیں کوس بھر کے، ساری عمر کٹی نکھلو (لکھنؤ) میں اور بن بیٹھے آغا۔ اب کھراسان بھیجئے چپراسی کو تو جانیں۔ یا اچھی بھلی ٹانگ پر من بھر گودڑ لپیٹ لیا، بیساکھی پر بغل ٹکائی

---

1 چرمر

2 تم سے زیادہ چالاک

لنگڑی کھینچتے زمین پر اتو کرتے چلے۔ ''بابا ہم مندراجی آدمی ہیں، ہم پر وخت پڑا ہے ہم لڑائی بھڑائی نہیں جانتے، شریف مرد آدمی ہیں، ڈاکا پڑا گھر بار لٹا، ٹانگ ٹوٹی، الٹا جیل خانہ ہوگیا۔'' تو شرما شرمی کچھ دینا پڑا۔ بھلا مندراج جہاں سے ڈلیاں آتی ہیں، کون جائے۔ ابھی پرسوں ایک عجیب وضاں (وضع قطع) کا مردوا بھیک مانگ رہا تھا کہتا تھا کہ سرکار نے ہم پر ظلم جوتا ہمیں ویران کردیا، ہم پوپلے ہیں، دیکھتی ہوں تو پوری بتیسی منھ میں ہے۔ ہائیں تم پوپلے ہو؟ کہنے لگا پوپلا نہیں موپلا۔ نہ جانے موپلا کیا بلا ہے۔ اسی تنوَ (طرح) ہمارے میکے میں ایک بڑی بی رہتی تھیں کیسی چلاک کہ میں کیا کہوں نہ کام نہ کاج مزے سے گھر میں راج رجتی تھیں بُرخا (برقع) اوڑھا اور گنویں گاؤں نکل گئیں اور بَن بیٹھیں بُجن۔ سرے کی مُشنیں (مشک) زمزمیاں پنڈکھجوریں ساتھ لیتی گئیں اور منوں اناج، سوپ ترازو، ڈلیاں (ٹوکریاں) ڈوئیاں باندھ لائیں۔ دو چار مہینے بافراغت کٹ گئے۔ پھر دو چار عرضیاں لکھوائیں ڈولی پر چڑھ جا پہنچیں کسی امیر کے دروزّے، مُل ڈولی مردانے بیٹھکے میں رکوائی انھوں نے عرض پڑھی پانچ لڑکیاں بیاہنے کو بیٹھی ہیں اور آگے پیچھے کوئی نہیں (جھوٹ موٹ) رانڈ بیوہ ہوں (یہ سچ تھا) اجمیر شریف کی زیارت کرنے جارہی ہوں کربلا مُہلّے (کربلائے معلّیٰ) کی تیاری ہے، یہ ہے وہ ہے بیسویں فقرے۔ یونہیں سیکڑوں روپیہ مار لاتی تھیں۔ مُل تھیں بیچاری بڑی ہنس مکھ، مجھ سے کہنے لگیں، دیکھ موئی امامن یہ روپیہ ملے۔ اب کہاں جاؤں کہاں نہ جاؤں، میں ہنس پڑی۔ اے ہے رہے نام اللہ کا وہ بھی چل بسیں نہ اجمیر گئیں نہ کربلا گئیں۔ یہ باتیں اب کہاں، بڑی مہنگی میں جب لوگ بچے بھون بھون کر کھا گئے تھے۔ میری عرضی بھی سرکار میں گزری۔ عرضی کیا گزری تھی بیگم صاحب نے مجھے کسی کام کو بھیجا تھا۔ میں نے کہا لاؤ کھڑے کھڑے ادھر بھی ہو لوں۔ گھر میں جو جا کے دیکھتی ہوں تو نامالم (معلوم) کب سے باسی پڑا تھا۔ کوڑے کے انم لگے تھے جی میں آگئی کہ لاؤ زری ستھرائی دے ڈالوں۔ صبح کو تو کپڑے بدلے تھے۔ میں نے کہا گر: میں اَٹ جائیں گے، میلے کپڑے پہن کر جھاڑو دینے لگی، اتنے میں دروزّے پر دو تین آدمی

کھڑے ہوگئے، بھئی میں دل میں ڈری کہ اب ٹکس بندھا، جھاڑو ہاتھ میں لیے کواڑے پر آن کھڑی ہوئی دیکھتی کیا ہوں ایک انگریز گورا چٹا کھڑا ہوا ہے ساتھ میں دو چپڑاسی، اس نے پوچھا۔ دل تم کون ہو، میں نے کہا حضور کون آپ کی مہری ہوں، غریب آدمی ہوں، وہ بولا اچھا اس کا نام لکھو، میں نے ہاتھ جوڑے کہ حضور میری کوئی اوقات نہیں ٹکس وکس نہ باندھیے گا، وہ مسکرا کے چلا گیا۔ اے اس کے تیسرے دن ایک منشی آن مجھود (موجود) ہوا۔ اما من کون ہے۔ گواہی لی گئی کہ اما من کے کوئی نہیں، بھوکوں مرتی ہے، بڑی نیک ہے، چلو تین روپیہ مہینہ ملنے لگا۔ پانچ مہینے ملا۔ پھر ماتوف (موقوف) ہوگیا۔ تو میرے کہنے کا یہ مطلب ہے کہ آدمی چال چلن ٹھیک رکھے تو خیرات بھی ملتی ہے۔ مُل خیر خیرات میں پوچھ گچھ کیسی اور جو چال چلن ہی پوچھتے ہو تو جہاں برائی لکھتے ہو، ہواں بھلائی بھی لکھو۔ یہ کیا کہ یہ تو لکھ لوگے کہ فلانی عورت نے یہ کیا۔ ڈھمکی عورت نے یہ کیا۔ اب کی کسی مردوے کے چھل بتوں میں آگئی۔ دائی جنائی کے بوتے عیب چھپایا۔ پکڑی گئی جیل خانہ ہو۔ یہ کوئی نہیں لکھتا کہ فلانی عورت ایسی نیک پاک ہے یوں عزت آبرو لیے بیٹھی رہی، انھیں بس جیل خانہ یاد رہتا ہے۔ نیکیاں سب بھول جاتے ہیں۔ پھر اب تو جیل خانہ کی ہوا کھانا بھی برائی نہیں وہی جو کہتے ہیں بھلا سا نام ہے مہاتما گاندھی کی بدولت سیکڑوں اچھے اچھے بھلے آدمی جیل خانہ گئے۔ جیل خانہ سے نکلے تو اللہ دے بندہ لے جیسے نصیب کھل گئے۔ اللہ اکبر اللہ اکبر کہتے لوگ پیچھے ہوئے جلوس نکلا۔ کئی آدمی جن کو زمانے بھر میں کوئی پوچھتا نہ تھا، گھر بیٹھے روٹیوں سے لگ گئے۔ کنچن برسنے لگا، اتیم اسیر، بیوہ، رانڈیں سب لوگوں نے بھلا دیں۔ گہنا پاتا، انگوٹھی چھلا تلک ثواب سمجھ کے انھیں جیل خانے والوں کے حوالے کردیا۔ ایک وخت خود فاقہ کیا مگر دوسرے وخت کے کھانے کے دام کمیٹھی (کمیٹی) میں دے دیے۔ لو بی بی جیل خانے جانا بھی ثواب کا کام ہے ان کے چال چلن کا کسی نے کھوج نہیں لگایا۔ خیر خدا کے صدقے جائیں جس نے اب تک آبرو رکھی، کوئی یہ نہیں کہہ سکتا کہ اما من بندی نے ہمارے سامنے ہاتھ پھیلائے اور ہاتھ پھیلائے میری بلا مجھے تو دن

مانگے چیز لینے کے ڈھنگ آتے ہیں۔ یہ کرتہ جو تم دیکھتی ہو یہ کیونکر ملا۔ منشی جی نے دیا اے یہی جو چوراہے پر رہتے ہیں۔ بیچارے بڑے نیک آدمی ہیں۔ کمرہ ایسا سجا ہے جیسے دلہن کبھی آگ لینے کبھی ان کے باورچی سے باتیں کرنے چلی جاتی ہوں۔ باورچی بھی ابھی بچہ ہے مجھ کو اماں کہتا ہے، مجھ کو اس کی محبت ہوگئی ہے، میں بھی وَخت بے وَخت مسالہ پیس دیتی ہوں، برتن مانجھ دیتی ہوں، اے ہاں اس نگوڑے کا ہیاں نہ گھر نہ بار پردیسی ہے۔ بچا بچایا کھانا بھی میرے لیے رکھ چھوڑتا ہے۔ منشی جی کے کمرے میں مانگ دار پردے پڑے ہیں۔ ایک پردے میں تھا زری سا چھید۔ تھی تو زری سی پھونک آتے جاتے میر ہاتھ جو لگا تو بڑا سا بھسباقا ہوگیا۔ میں نے کہا منشی جی پردہ تو بالکل پرانا ہوگیا۔ کہنے لگے بوا امامن اس میں ٹانکے لگا دو، میں سوئی لے آئی، ایک آدھا ٹانکا دیا، منشی جی اپنے کام میں لگے تھے۔ میں نے کہا منشی جی یہ تو سوئی کے ساتھ ہی چلا آتا ہے سیوں کیا خاک، کپڑے میں جان ہی نہیں، کہنے لگے اونھ ہوگا تمھیں لے جاوَ۔ میں دعائیں دیتی چلی آئی۔ یہ دوسرا جاڑا ہے دھونس دھونس کے پہن رہی ہوں، ابھی اور چلے گا، مردوئے دینے دلانے میں بہت بھولے ہوتے ہیں۔ عورتیں زری اور مزاز (مزاج) کی ہوتی ہیں۔ جو منشی جی کی بی بی ہوتیں تو بھلا پردہ مجھے کیا ملتا وہ خود ہی جگو رکھتیں کہ زچہ خانہ میں کام آئے گا۔ بی جہاں تک بس چلے بھیک نہ مانگے، اور جو مانگے تو اس میں سے کچھ بچائے ضرور انسان کے ساتھ بیماری دکھی لگی ہوئی ہے، کون جانے کل کیا ہوگا، جہاں میں نے تیسرا نکاح کیا تھا اسی جگھوں ایک رنڈی رہتی تھی جوانی میں آگم اندیشہ نہ دیکھا بڑھاپا آیا تو لگیں پان بیچنے، شاموں شام تک پان بیچے، اندھیرا ہوا اور برقعہ اوڑھ کے نکل گئیں جو کچھ اللہ نے دیا لے آئیں۔ مُل کبھی ہاتھ نہیں پھیلایا۔ ایک ننھا سا کرتہ توئی لچکا ٹانک کے بنوا لیا تھا جو پان نہ بکے تو رومال میں کرتہ لپیٹ کے پرمُحلّے (پرائے محلے) چلی گئیں اور عورتوں کے آگے رکھ دیا کہ بی بی یہ کرتا بکاوَ ہے دو چار آنسو بھی ٹھنڈی سانس بھر کے ٹپکا دیے کہ ہائے پہننے والا تو قبر کی گود میں ہے، اس بندی کا نواسا تھا، دو دن کی بیماری میں چٹ

ہٹ ہوگیا، وخت پڑا ہے بیچے ڈالتی ہوں، رکھ کے کیا کرنا ہے، لوگوں کو ترس آجاتا تھا
رے ہوئے بچے کا کرتا بھلا کون لیتا، یہ بدشگونی تھی۔ ہاں...... دوچار آنے اسی بہانے
ل جاتے تھے۔ جب وہ مری تو لاش انجمن نے اٹھوائی۔ ل دو روپیہ تکیے میں رکھا تھا،
کسی غریب کے کام آگیا۔ اسی سے تو میں کہتی ہوں کہ انسان کو مرنے جینے کا خیال
رکھنا چاہیے۔

○